قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2016، قیمت -/15₹

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2016
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, July-2016, Vol.18, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

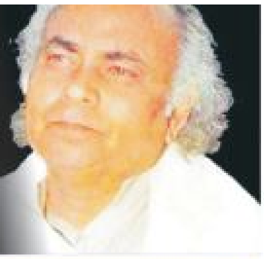

مشمولات

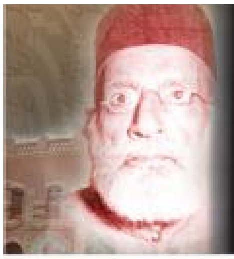

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:7، جولائی 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

وزیر اعظم ہند کی تقریر

من کی بات 5

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 9

انٹرویو

ادب اور ذاتی زندگی میں کھوٹوں کا قائل نہیں: نذیر فتح پوری معین الدین عثمانی 11

زبان و تعلیم

کیرلہ میں اردو نصاب کا خاکہ فیصل ماولڈتل 15

ادبی مباحث

غالب کے کلام میں حقوق انسانی کے واضح اشارات خواجہ عبدالمنتقم 18
اردو افسانہ روایت اور تجربے مظہر محمود 22
جدید نظم کا فکری پس منظر شاہ عالم 26
شیفتہ: سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال صابر علی سیوانی 31

شخصیات

حقی حزیں دہلوی مظفر حنفی 35
یکتائے زمانہ تھا وہ اور نام تھا سہگل کرشن بھاوک 38

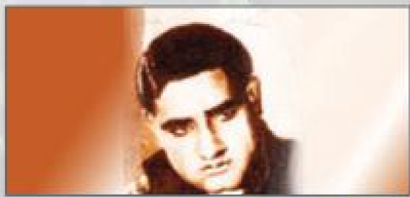

سلسلۂ صحافت

رسائل اور خواتین کی خدمات مہرین قادر حسین 41

خراجِ عقیدت

ہندوستانی جمالیات کا استعارہ شمس کمال انجم 44
کون ہے جس کو کہیں آپ کے جیسا منظور نجمے مصرا شوق 46

قندیلِ نظر

ابھنیو گیت غلام نبی خیال 48
دوار کا پرشاد افق سید یحییٰ نشیط 51
حسرت کی شاعری میں کرشن کا تصور ضیاء الرحمٰن صدیقی 55
اردو شاعری میں گوتم بدھ محمد یحییٰ جمیل 57
سنت نادیو یوسف صابر 59

ردِّعمل

قارئین ابن صفی اور نقلی ہیروں کا فریب ادریس شاہجہانپوری 61

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 63

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 75

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 79

ہماری بات

برقیاتی انقلاب نے جہاں بہت ساری سہولیات پیدا کی ہیں وہیں انسانی معاشرت اور ثقافت کے لیے بہت سارے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ ان مسائل پر غور کرنا آج کے دانشور طبقے کی سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم برقیاتی ٹیکنالوجی سے کتنا اور کس حد تک استفادہ کر رہے ہیں۔ زبانوں کی ترقی بھی اسی ٹیکنالوجی سے وابستہ ہوگئی ہے، اس لیے ٹیکنالوجی کی سطح پر ہمیں مستعد اور فعال ہونے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ذریعے ہم اپنی زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر سکتے ہیں۔ آج کے عہد میں ہمیں یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ ہمارے لیے کیا مفید ہے اور کیا مضر۔ ایک بار پھر مطالب مفیدہ کی طرف مراجعت لازمی ہوگئی ہے کہ ہم صرف غیر ضروری ادبی مباحث اور مسائل میں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ ایسا ادب تخلیق کریں جو معاشرت اور ثقافت کے لیے مفید ثابت ہو۔ ہمیں ادبی اقدار و نظریات پر بھی از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ادبی مباحث اور مسائل کے لیے بہت سے رسائل ہیں مگر ایسے رسالوں کی ضرورت زیادہ ہے جن میں ادب سے زیادہ زبان اور لسانیات پر زور ہو کیونکہ جب زبان ہی نہیں رہے گی تو ادب کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ زبان سے ہی ادب کی بقا اور ارتقا مشروط ہے۔ آج کے عہد میں زبان کی سطح پر اردو میں زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ قواعد، اصطلاحات اور علوم وفنون، محاورات اور کہاوتوں کی فرہنگیں، کثیر لسانی لغت اور قاموس مترادفات کی ضرورت بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ قومی اردو کونسل کا بنیادی ارتکاز فروغ زبان پر ہے۔ اس لیے کونسل اس سمت میں کچھ اہم اقدامات کر رہی ہے جس کا فائدہ پوری اردو دنیا کو پہنچے گا۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' نے زبان اور تعلیم کا کالم بھی اسی مقصد سے شروع کیا ہوا ہے تاکہ زبان کی سطح پر ہونے والی ترقیات اور تغیرات سے آگہی ہو سکے۔ اس کالم کو مزید وسعت دی جائے گی اور زبان شناسی کے تعلق سے مفید مضامین بھی شائع کیے جائیں گے۔ اس تعلق سے ماہرین لسانیات بھی کچھ تجاویز، مشورے اور مضامین ارسال کریں تو ہمیں بے حد مسرت ہوگی۔ ان کی رہنمائی میں ہمیں ماہنامہ اردو دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد بھی ملے گی۔

'اردو دنیا' میں جہاں ادبی مسائل و مباحث پر تحریریں شائع کی جاتی ہیں وہیں ایسے مضامین کی اشاعت ترجیحی طور پر کی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں۔ اردو طبقے کا المیہ یہ ہے کہ سرکار کے بہت سے ترقیاتی منصوبوں اور اسکیموں سے ناواقف ہے اس کی وجہ سے ان اسکیموں کے فائدوں سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اردو اخبارات بھی سرکار کے ایسے ترقیاتی منصوبوں سے قارئین کو واقف نہیں کرا پاتے۔ سرکار کے ایسے بہت سے منصوبے ہیں جو اقلیتوں کے لیے ہیں مگر اقلیتیں ناواقفیت کی وجہ سے اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ 'اردو دنیا' میں عزت مآب وزیر اعظم حکومت ہند جناب نریندر مودی کے 'من کی بات' کا سلسلہ اسی غرض سے شروع کیا جا رہا ہے تاکہ اردو داں طبقہ بھی ان کے ترقیاتی منصوبوں اور اسکیموں سے آگاہ ہو سکے۔ آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہونے والا وزیر اعظم ہند کا یہ پروگرام بہت ہی مقبول ہے۔ 3 اکتوبر 2014 سے اس سلسلے کا آغاز ہوا ہے تب سے 'من کی بات' میں عام لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے۔ وزیر اعظم نے اس پروگرام کے ذریعے ہندوستان کے ہر عام آدمی تک اپنی آواز اور اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ علاقے جہاں ٹیلی ویژن یا دیگر ترسیلی سہولیات نہیں ہیں وہاں کے لوگ بھی سرکاری منصوبوں اور اسکیموں سے واقف ہو سکیں۔ انھوں نے 'من کی بات' میں ہندوستان کے بہت سے اہم سماجی، سیاسی، اقتصادی اور عام آدمی سے جڑے ہوئے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو عام لوگوں کو بہت پسند آتی ہے۔ خاص طور پر سوچھ بھارت ابھیان، اسکل ڈیولپمنٹ، صحت اور تعلیم سے متعلق ان کے 'من کی بات' سے زیادہ تر لوگوں کو تحریک اور ترغیب بھی ملتی ہے۔

'اردو دنیا' میں 'من کی بات' شروع کرنے کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے وزیر اعظم محترم نریندر مودی ہندوستانی عوام کے لیے کیا سوچتے ہیں اور ایک مضبوط ملک کی تعمیر کے لیے ان کے ذہن میں کیا خاکے اور منصوبے ہیں اس سے لوگ واقف ہو سکیں اور ایک محبّ وطن شہری کی حیثیت سے ہم بھی ان کے مشن میں ان کا ساتھ دیں، کیونکہ جب ہمارا ملک مضبوط ہوگا تو ہم عدم تحفظ اور خوف کے حصار سے باہر نکلیں گے اور ملک ترقی کی راہ پر دوڑے گا تو ہندوستان کا ہر فرد اس ترقی سے فائدہ اٹھا پائے گا۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

وزیراعظم کی تقریر

وزیراعظم محترم نریندر مودی کا آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہونے والا مقبول پروگرام

'من کی بات'

عزت مآب وزیراعظم ہند

نئی دہلی: 22 مئی، میرے پیارے ہم وطنو، نمسکار۔ پھر ایک بار مجھے 'من کی بات' کرنے کا موقع ملا ہے۔ میرے لیے 'من کی بات' کرم کانڈ نہیں ہے۔ میں خود بھی آپ سے بات چیت کرنے کے لیے بہت ہی بے چین رہتا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کے ہر کونے میں من کی باتوں کے ذریعے ملک کے عام لوگوں سے میں جڑ پاتا ہوں۔ میں آکاشوانی کا اس لیے بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس 'من کی بات' کو شام کو 8.00 بجے علاقائی زبانوں میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ جو لوگ مجھے سنتے ہیں، وہ بعد میں خط کے ذریعے، ٹیلی فون کے ذریعے، MyGov ویب سائٹ کے ذریعے، نریندر مودی ایپ کے ذریعے اپنے جذبات کو مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ آپ کی بہت سی باتیں مجھے حکومت کے کام میں مدد کرتی ہیں۔ مفاد عامہ کی نظر سے حکومت کو کتنا فعال ہونا ضروری ہے، عوامی مفاد کے کام کتنے بنیادی ہونے چاہئیں، ان چیزوں کے لیے آپ کے ساتھ میری یہ بات چیت، یہ ناطہ بہت کام آتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ زیادہ فعال ہو کر لوگوں کی شراکت سے جمہوریت کس طرح چلے، اس پر ضرور زور دیں گے۔

گرمی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ امید کرتے تھے، کچھ کمی آئے گی، لیکن محسوس ہوا کہ گرمی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ درمیان میں یہ بھی خبر آ گئی کہ شاید مانسون ایک ہفتے تاخیر سے آئے گا، تو فکر اور بڑھ گئی۔ قریب قریب ملک کا زیادہ سے زیادہ حصہ گرمی کی شدید تپش کو محسوس کر رہا ہے۔ مرکری آسمان کو چھو رہی ہے۔ جانور ہوں، پرندے ہوں، انسان ہوں، ہر کوئی پریشان ہے۔ ماحول کی وجہ سے ہی تو یہ مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ جنگل کم ہوتے گئے، درخت کٹتے گئے اور ایک طرح سے بنی نوع انسان نے اسی نوعیت کی تباہی کر کے خود کی تباہی کی راہ ہموار کر لی۔ 5 جون عالمی ماحولیات کا دن ہے۔ پوری دنیا میں ماحول کے لیے بات چیت ہوتی ہے، فکر ہوتی ہے۔ اس بار اقوام متحدہ نے عالمی ماحولیات کے دن پر 'زیرو ٹولرینس فار ایلیگل وائلڈ ٹریڈ' کو موضوع بنایا ہے۔ اس کی تو بحث ہوگی ہی، لیکن ہمیں تو درخت اور پودوں کی بھی بحث کرنی ہے، پانی کی بھی بحث کرنی ہے، ہمارے جنگل کس طرح بڑھیں۔ کیونکہ آپ نے دیکھا ہوگا، گزشتہ دنوں اتراکھنڈ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر- ہمالیہ کی گود میں، جنگلوں میں جو آگ لگی: آگ کی اصل وجہ یہی تھی کہ خشک پتے اور کہیں تھوڑی سی بھی لاپرواہی برتی جائے، تو بہت بڑی آگ پھیل جاتی ہے اور اس وجہ سے جنگلوں کو بچانا، پانی کو محفوظ رکھنا- یہ ہم سب کا فرض بن جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں مجھے، جن ریاستوں میں زیادہ خشکی کی صورت حال ہے، اس طرح 11 ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کے ساتھ تفصیل سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اترپردیش، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، کرناٹک، آندھرا پردیش، تلنگانہ، اڈیشہ- ویسے تو حکومت کی جیسی روایت رہی ہے، میں خشک سالی سے متاثر تمام ریاستوں کی ایک میٹنگ کر سکتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے ہر ریاست کے ساتھ الگ الگ میٹنگیں کیں۔ ایک ایک ریاست کے ساتھ قریب قریب دو دو، ڈھائی ڈھائی گھنٹے گزارے۔ ریاستوں کا کیا کہنا ہے، ان کو توجہ سے سنا۔ عام طور پر حکومت میں مرکزی سرکار سے کتنے پیسے گئے اور کتنا خرچ ہوا- اس پر زیادہ باریکی سے بات نہیں ہوتی ہے۔ ہماری حکومت کے افسران کے لیے بھی حیرت کی بات یہ تھی کہ کئی ریاستوں نے بہت ہی شاندار کوشش کی ہے، پانی کے سلسلے میں، ماحولیات کے سلسلے میں، خشک سالی کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے، جانوروں کے لیے، متاثرہ افراد کے لیے اور ایک قسم سے پورے ملک کے ہر کونے میں، کسی بھی پارٹی کی حکومت کیوں نہ ہو، یہ تجربہ سامنے آیا کہ اس (سیکھنے کا تجربہ) مسئلہ کا، طویل مدتی حالات سے، نمٹنے کے لیے مستقل حل کیا ہو، دائمی علاج کیا ہو، اس پر بھی توجہ تھی۔ ایک طرح سے میرے لیے وہ لرننگ ایکسپیرینس بھی تھا اور میں نے تو اپنے 'نیتی آیوگ' کو کہا ہے کہ جو بہتر طریقے ہیں، ان کو تمام ریاستوں میں کس طرح لیا جائے، اس پر بھی کوئی کام ہونا چاہیے۔ کچھ ریاستوں نے، خاص کر کے آندھرا نے، گجرات نے ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آگے نیتی آیوگ کی طرف سے ریاستوں کی جو کامیاب کوششیں ہیں، اس کو ہم دیگر ریاستوں میں بھی پہنچائیں۔ ایسے مسائل کے حل میں عوام کی شرکت ایک بہت بڑی کامیابی کی بنیاد ہوتی ہے اور اس میں اگر کامل منصوبہ بندی ہو، مناسب ٹکنالوجی کا استعمال ہو اور متعینہ اور مقررہ انتظامات کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے تو بہترین نتائج مل سکتے ہیں، ایسا میرا یقین ہے۔ خشک سالی کے انتظامات کو لے کر، پانی کے تحفظ کو لے کر، بوند-بوند پانی کو بچانے کے لیے، کیونکہ میں ہمیشہ مانتا ہوں، پانی - قدرت کا تحفہ ہے۔ جیسے ہم مندر میں جاتے ہیں، کوئی پرساد دے اور تھوڑا سا بھی پرساد گر جاتا ہے تو دل میں دکھ ہوتا ہے۔ اس کو اٹھا لیتے ہیں اور پانچ بار پرماتما سے معافی مانگتے ہیں۔ یہ پانی بھی پرماتما کا پرساد ہے۔ ایک بوند بھی برباد

ہوتو ہمیں دکھ ہونا چاہیے اوراس وجہ سے ذخیرہ آب کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے، پانی کے تحفظ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے، آبپاشی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے اوراسی لیے تو فی بوند زیادہ فصل، مائکرو آبپاشی، کم سے کم پانی سے ہونے والی فصل۔ اب تو خوشی کی بات ہے کہ کئی ریاستوں میں ہمارے گنے کے کسان بھی مائکرو آبپاشی کا استعمال کررہے ہیں، کوئی ڈرپ آبپاشی کا استعمال کررہا ہے، کوئی چھڑکاؤ کا کر رہا ہے۔ میں ریاستوں کے ساتھ بیٹھا، تو کچھ ریاستوں نے دھان کے لیے بھی، چاول کی جو کھیتی کرتے ہیں، انھوں نے بھی کامیابی کے ساتھ ڈرپ آبپاشی کا استعمال کیا ہے اور اس وجہ سے ان کی پیداوار بھی زیادہ ہوئی، پانی بھی بچا اور خرچ بھی کم ہوا۔ ان ریاستوں سے میں نے جب سنا تو بہت سی ریاستیں ایسی ہیں جنھوں نے بہت بڑے بڑے ہدف حاصل کیے ہیں، خاص کر مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور گجرات۔ تین ریاستوں نے ڈرپ آبپاشی میں بہت بڑا کام کیا ہے اوران کی تو کوشش ہے کہ ہر سال دو دو، تین تین لاکھ ہیکٹر مائکرو آبپاشی سے جڑتے جائیں! یہ مہم اگر تمام ریاستوں میں چل پڑی تو کھیتی کو بھی بہت فائدہ ہوگا، پانی کو بھی جمع کریں گے۔ ہمارے تلنگانہ کے بھائیوں نے 'مشن بھاگیرتھی' کی طرح گوداوری اور کرشنا ندی کے پانی کا بہت ہی بہترین استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ آندھرا پردیش نے 'نیرو ترقی مشن' اس میں بھی ٹکنالوجی کا استعمال، زمینی پانی کو دوبارہ استعمال میں لانے کی کوشش کی ہے۔ مہاراشٹر نے جو عوامی تحریک شروع کی ہے، اس میں لوگ پسینہ بھی بہا رہے ہیں، پیسے بھی دے رہے ہیں۔ 'جل یکت سیور ابھیان' - صحیح معنی میں یہ تحریک مہاراشٹر کو مستقبل کے بحران سے بچانے کے لیے بہت کام آئے گا، ایسا میں محسوس کرتا ہوں۔ چھتیس گڑھ نے 'لوک سوراج - جل سوراج مہم' چلائی ہے۔ مدھیہ پردیش نے 'بلرام تالاب کی منصوبہ بندی' کی ہے۔ تقریباً 22 ہزار تالاب! یہ چھوٹے اعداد و شمار نہیں ہیں! اس پر کام چل رہا ہے۔ ان کا 'کپل دھارا کوپ منصوبہ بندی'۔ اتر پردیش سے 'وزیر اعلی پانی بچاؤ مہم'۔ کرناٹک میں 'کلیانی منصوبہ بندی' کے طور پر کنوؤں کو دوبارہ زندہ کرنے کی سمت میں کام شروع کیا ہے۔ راجستھان اور گجرات جہاں مزید پرانے زمانے کی باوڑاس ہیں، ان کو جل مندر کے طور پر بحال کرنے کی ایک بڑی مہم چلائی ہے۔ راجستھان نے 'وزیر اعلی پانی سوالمبن مہم' چلایا ہے۔ جھارکھنڈ ویسے تو جنگلی علاقہ ہے، لیکن کچھ علاقے ہیں، جہاں پانی کی دقت ہے۔ انھوں نے 'چیک ڈیم' کی بہت بڑی مہم چلائی ہے۔ انھوں نے پانی روکنے کی سمت میں کوشش کی ہے۔ کچھ ریاستوں نے دریاؤں میں ہی چھوٹے چھوٹے باندھ بنا کر دس دس، بیس بیس کلومیٹر پانی روکنے کی سمت میں مہم چلائی ہے۔ یہ بہت ہی خوشگوار تجربہ ہے۔ میں ملک کے باشندوں کو بھی کہتا ہوں کہ یہ جون، جولائی، اگست، ستمبر - ہم فیصلہ کریں، پانی کی ایک بوند بھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی سے انتظام کریں، پانی بچانے کی جگہ کیا ہوسکتی ہے، پانی روکنے کی جگہ کیا ہوسکتی ہے۔ ایشور تو ہماری ضرورت کے حساب سے پانی دیتا ہی ہے، فطرت ہماری ضرورت کی تکمیل کرتی ہی ہے، لیکن ہم اگر بہت پانی دیکھ کر بے پرواہ ہوجائیں اور جب پانی کا موسم ختم ہوجائے تو بغیر پانی پریشان رہیں، یہ کیسے چل سکتا ہے؟ اور یہ کوئی پانی، مطلب صرف کسانوں کا موضوع نہیں ہے جی! یہ گاؤں، غریب، مزدور، کسان، شہری، دیہی، امیر غریب - ہر کسی سے جڑا ہوا موضوع ہے اور اس وجہ سے بارش کا موسم آ رہا ہے، تو پانی ہماری ترجیح رہے اور اس بار جب ہم دیوالی منائیں تو اس بات کا لطف بھی لیں کہ ہم نے کتنا پانی بچالیا، کتنا پانی روکا۔ آپ دیکھیے، ہماری خوشی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ پانی میں وہ طاقت ہے، ہم کتنے ہی تھکے ہوئے ہوں، منہ پر تھوڑا سا بھی پانی چھڑکتے ہیں، تو کتنے تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ ہم کتنے ہی تھکے ہوئے ہوں، لیکن عظیم ندیاں دیکھیں یا سمندر کا پانی دیکھیں، تو کیسی عظمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ کیسا قیمتی خزانہ ہے پرماتما کا دیا ہوا! ذرا دل سے اس کے ساتھ جڑ جائیں، اس کا تحفظ، پانی کا اضافہ کریں، پانی جمع بھی کریں، آبپاشی کو بھی جدید بنائیں۔ اس بات کو میں آج بڑے زور سے کہہ رہا ہوں۔ یہ موسم جانے نہیں دینا ہے۔ آنے والے چار ماہ کو بوند-بوند پانی کے لیے 'پانی بچاؤ مہم' کے طور پر تبدیل کرنا ہے اور یہ صرف حکومتوں کا نہیں، سیاستدانوں کا نہیں، یہ عوام کا بھی کام ہے۔ میڈیا نے گزشتہ دنوں پانی کی کمی کا مسئلہ تفصیل سے بیان کیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میڈیا پانی بچانے کی سمت میں لوگوں کی رہنمائی کرے، مہم چلائے اور پانی کے بحران سے مستقل نجات کے لیے میڈیا بھی شریک بنے، میں ان کو بھی دعوت دیتا ہوں۔

میرے پیارے ہم وطنو! ہمیں جدید ہندوستان بنانا ہے، ہمیں شفاف ہندوستان بنانا ہے۔ ہمیں بہت سے انتظامات کو ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک یکساں طور پر پہنچانا ہے، تو ہمیں اپنی پرانی عادات کو بھی تھوڑا سا تبدیل کرنا پڑے گا۔ آج میں ایک ایسے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں، جس پر اگر آپ میری مدد کریں، تو ہم اس سمت میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہم سب کو معلوم ہے، ہمیں اسکول میں پڑھایا جاتا تھا کہ ایک زمانہ تھا، جب سکے بھی نہیں تھے، نوٹ بھی نہیں تھے، چیزوں کے تبادلے کا نظام ہوا کرتا تھا کہ آپ کو اگر سبزی چاہیے، تو بدلے میں اتنے گیہوں دے دو۔ آپ کو نمک چاہیے، تو بدلے میں اتنی سبزی دے دو۔ چیزوں کے تبادلے کے نظام ہی سے کاروبار چلتا تھا۔ آہستہ آہستہ کر کے کرنسی آنے لگی۔ کوائن آنے لگے، سکے آنے لگے، نوٹ آنے لگے۔ لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔ پوری دنیا کیش لیس سوسائٹی کی طرف آگے بڑھ رہی ہے۔ الیکٹرانک ٹکنالوجیکل نظام کے ذریعے ہم روپے پا بھی سکتے ہیں، روپے دے بھی سکتے ہیں۔ چیز خرید بھی سکتے ہیں، بل چکا بھی سکتے ہیں اور اس سے جیب میں سے کبھی بٹوے کی چوری ہونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھے گا۔ حساب رکھنے کی بھی فکر نہیں رہے گی، آٹومیٹک حساب رہے گا۔ آغاز تھوڑا مشکل لگے گا، لیکن ایک بار عادت لگے گی تو یہ نظام آسان ہو جائے گا اور یہ امکانات اس لیے ہیں کہ ہم نے ان دنوں جو 'پردھان منتری جن دھن یوجنا' کی مہم چلائی، ملک کے قریب قریب تمام خاندانوں کے بینک اکاؤنٹ کھل گئے۔ دوسری طرف آدھار نمبر بھی مل گیا اور موبائل تو قریب قریب ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔ تو 'جن دھن'، 'آدھار' اور 'موبائل' - '(جیم) جے۔ اے۔ ایم۔ اس کا تال میل کرتے ہوئے ہم اس کیش لیس سوسائٹی کی طرف آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن دھن اکاؤنٹ کے ساتھ روپے کارڈ بھی دیا گیا ہے۔ آنے والے دنوں میں یہ کارڈ کریڈٹ اور ڈبٹ - دونوں نقطہ نظر سے کام آنے والا ہے اور آج کل تو ایک بہت چھوٹا سا انسٹرومنٹ بھی آ گیا ہے، جس کو کہتے ہیں پوائنٹ آف سیل - پی۔ او۔ ایس۔ 'پوز'۔ اس کی مدد سے آپ اپنا آدھار نمبر ہو، روپے کارڈ ہو، آپ کو کسی کو بھی پیسوں کا بھگتان کرنا ہو، تو اس سے دے سکتے ہیں۔ جیب میں سے روپے نکالنے کی، گننے کی، ضرورت ہی نہیں ہے۔ ساتھ لے کر گھومنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ حکومت ہند نے جو کچھ اقدامات کیے ہیں، اس میں ایک 'پی او ایس' کے ذریعے ادائیگی کیسے ہو، پیسے کس طرح سے لیے جائیں۔ دوسرا کام ہم نے شروع کیا ہے 'بینک آن موبائل - یونیورسل پیمنٹ انٹرفیس بینکنگ ٹرانزیکشن' (UPI) - طریقے کو بدل کر رکھ دے گا۔ آپ کے موبائل فون کے ذریعے منی ٹرانزیکشن کرنا بہت ہی آسان ہو جائے گا اور خوشی کی بات ہے کہ این پی سی آئی اور بینک اس پلیٹ فارم کو موبائل ایپ کے ذریعے لانچ کرنے کے

لیے کام کر رہے ہیں اور اگر یہ ہوا تو شاید آپ کو روپے کارڈ کو ساتھ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ملک میں تقریباً سوالاکھ بینکنگ کے نمائندے کے طور پر نوجوانوں کو بھرتی کیا گیا ہے۔ ایک قسم سے بینک آپ کے دروازے پر- اس سمت میں کام کیا ہے۔ پوسٹ آفس کو بھی بینکنگ خدمات کے لیے چوکنا کر دیا گیا ہے۔ ان انتظامات کا اگر ہم استعمال کرنا سیکھ لیں گے اور عادت ڈالیں گے تو پھر ہمیں یہ کرنسی کی ضرورت نہیں پڑے گی، نوٹوں کی ضرورت نہیں پڑے گی، پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی، کاروبار اپنے آپ چلے گا اور اس وجہ سے ایک شفافیت آئے گی۔ دونمبری کاروبار بند ہو جائیں گے۔ کالے دھن کا تو اثر ہی کم ہوتا جائے گا، تو میں اہل وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم شروع تو کریں۔ دیکھیے، ایک بار شروع کریں گے، تو بہت آسانی سے ہم آگے بڑھیں گے۔ آج سے بیس سال پہلے کس نے سوچا تھا کہ اتنے سارے موبائل ہمارے ہر ہاتھ میں ہوں گے۔ آہستہ آہستہ عادت ہو گئی، اب تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہوسکتا ہے یہ کیش لیس سوسائٹی بھی ویسی ہی شکل اختیار کر لے، لیکن کم وقت میں ہوگا تو زیادہ اچھا ہوگا۔

میرے پیارے ہم وطنو! جب بھی اولمپک کے کھیل آتے ہیں اور جب کھیل شروع ہو جاتے ہیں، تو پھر ہم سر پٹک کے بیٹھتے ہیں، ہم گولڈ میڈل میں کتنے پیچھے رہ گئے، سلور ملا کہ نہیں ملا، برونز سے چلائے - نہ چلائے، یہ رہتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کھیل-کود میں ہمارے سامنے چیلینجز بہت ہیں، لیکن ملک میں ایک ایسا ماحول بننا چاہیے۔ ریو اولمپک کے لیے جانے والے ہمارے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا، ان کا حوصلہ بلند کرنے کا، ہر کسی نے اپنے اپنے طریقے سے۔ کوئی گیت لکھے، کوئی کارٹون بنائے، کوئی پیغام دے، کوئی کسی گیم کی حوصلہ افزائی کرے، لیکن پورے ملک کو ہمارے ان کھلاڑیوں کے مطابق ایک بڑا ہی مثبت ماحول بنانا چاہیے۔ نتائج جو آئیں گے وہ آئیں گے۔ کھیل، کھیل ہے، جیت بھی ہوتی ہے، ہار بھی ہوتی ہے، میڈل آتے بھی ہیں، نہیں بھی آتے ہیں، لیکن حوصلہ بلند ہونا چاہیے اور جب میں یہ بات کرتا ہوں، تب اپنے کھیل کے وزیر جناب سربانند سونووال کا بھی ایک واقعہ میرے من کو چھو گیا، تو میں آپ کو کہنا چاہتا ہوں۔ ہم سب لوگ گذشتہ ہفتے انتخابات کے نتائج کیا آئیں گے، آسام میں کیا نتائج آئیں گے، اسی میں لگے تھے اور جناب سربانند جی تو خود آسام کے انتخابات کی قیادت کر رہے تھے، وزیر اعلی کے امیدوار تھے، لیکن وہ حکومت ہند کے وزیر بھی تھے اور مجھے یہ جب اطلاعات ملیں، تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ آسام انتخابات کے نتائج کے پہلے کسی کو بتائے بغیر پٹیالہ پہنچ گئے۔ آپ سب کو معلوم ہوگا نیتاجی سبھاش نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسپورٹس (این آئی ایس)، جہاں پر اولمپک میں جانے والے ہمارے کھلاڑیوں کی ٹریننگ ہوتی ہے، وہ سب وہی ہیں۔ وہ اچانک وہاں پہنچ گئے، کھلاڑیوں کے لیے بھی حیران کن بات تھی اور کھیل کی دنیا کے لیے بھی حیران کن تھا کہ کوئی وزیر اس طرح سے اتنی فکر کرے۔ کھلاڑیوں کا کیا نظام ہے، کھانے کا انتظام کیا ہے، ضرورت کے مطابق تغذیہ بخش غذا مل رہی ہے کہ نہیں مل رہی ہے، ان کے جسم کے لیے جو ضروری ٹرینرز ہیں، وہ ٹرینرز ہیں کہ نہیں ہیں۔ ٹریننگ کی ساری مشینیں ٹھیک چل رہی ہیں کہ نہیں چل رہی ہیں۔ ساری باتیں انھوں نے قریب سے دیکھیں۔ ایک ایک کھلاڑی کے کمرے کو جا کر دیکھا۔ کھلاڑیوں سے تفصیل سے بات چیت کی، انتظامیہ سے بات کی، ٹرینرز سے بات کی، انھوں نے سب کھلاڑیوں کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ انتخابات کے نتائج آنے والے ہوں، وزیر اعلی کے ناطے نئی ذمے داری کا امکان ہو، لیکن پھر بھی اگر میرا ایک ساتھی وزیر کھیل کے طور پر اس کام کی اتنی فکر کرے، تو مجھے خوشی ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے، ہم سب اسی طرح سے کھیل کی اہمیت کو سمجھیں گے۔ کھیل کی دنیا کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں، ہمارے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ یہ اپنے آپ میں بہت بڑی طاقت بن جاتی ہے جی، جب کھلاڑی کو لگتا ہے کہ سوا سو کروڑ ملک کے عوام اس کے ساتھ کھڑے ہیں، تو اس کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے۔

پچھلی بار میں نے فیفا انڈر-17 ورلڈ کپ کے لیے باتیں کی تھیں اور مجھے جو تجاویز آئیں ملک بھر سے، اور ان دنوں میں نے دیکھا ہے کہ فٹبال کا ایک ماحول پورے ملک میں نظر آنے لگا ہے۔ بہت سے لوگ پہل کر کے اپنی اپنی ٹیمیں بنا رہے ہیں۔ نریندر مودی موبائل ایپ پر مجھے ہزاروں تجویزیں ملی ہیں۔ ہوسکتا ہے، بہت سے لوگ کھیلتے نہیں ہوں گے، لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کی اس کھیل میں اتنی دلچسپی ہے، یہ اپنے آپ میں میرے لیے خوشگوار تجربہ تھا۔ کرکٹ سے ہندوستان کا لگاؤ تو ہم جانتے ہیں، لیکن میں نے دیکھا فٹبال میں بھی اتنا لگاؤ۔ یہ اپنے آپ میں ایک بڑے ہی خوشگوار مستقبل کا اشارہ دیتا ہے۔ تو ریو اولمپک کے لیے پسندیدگی کے اہل ہمارے تمام کھلاڑیوں کے تئیں ہم لوگ ایک امنگ اور حوصلہ افزائی کا ماحول بنائیں آنے والے دنوں میں۔ ہر چیز کو فتح اور شکست کی کسوٹی پر نہ کسا جائے۔ اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ ہندوستان دنیا میں اپنی شناخت بنائے۔ میں ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ہمارے کھیل کی دنیا سے جڑے ساتھیوں کے تئیں جوش و جذبے اور امنگ کا ماحول بنانے میں ہم بھی کچھ کریں۔

گزشتہ آٹھ دس دن سے کہیں نہ کہیں سے نئے نئے نتائج آ رہے ہیں۔ میں انتخابات کے نتائج کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان طلبا کی بات کر رہا ہوں، جنھوں نے سال بھر محنت کی، امتحان دیے، دسویں کے، بارھویں کے، ایک کے بعد ایک نتائج آنا شروع ہوئے ہیں۔ یہ تو صاف ہو گیا ہے کہ ہماری بیٹیاں قابلیت دکھا رہی ہیں۔ خوشی کی بات ہے۔ ان نتائج میں جو کامیاب ہوئے ہیں، ان کو میرا سلام ہے، مبارکباد ہے۔ جو کامیاب نہیں ہو پائے ہیں، ان کو میں پھر سے ایک بار کہنا چاہوں گا کہ زندگی میں کرنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر ہماری خواہش کے مطابق نتائج نہیں آئے ہیں، تو کوئی زندگی اٹک نہیں جاتی ہے۔ اعتماد سے جینا چاہیے، اعتماد سے آگے بڑھنا چاہیے۔ لیکن ایک بڑے نئے قسم کا میرے سامنے سوال آیا ہے اور میں نے ویسے اس موضوع میں کبھی سوچا نہیں تھا۔ لیکن میرے MyGov پر ایک ای-میل آیا تو میرا دھیان گیا۔ مدھیہ پردیش کے کوئی جناب گورو ہیں، گورو پٹیل- انھوں نے ایک بڑی مشکل میرے سامنے پیش کی ہے۔ گورو پٹیل کہہ رہے ہیں کہ ایم۔ پی کے بورڈ کے امتحانات میں مجھے 89.33 فیصد ملے ہیں۔ تو یہ پڑھ کر مجھے تو لگا، واہ، کیا خوشی کی بات ہے، لیکن آگے وہ اپنے دکھ کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ گورو پٹیل کہہ رہے ہیں کہ صاحب، 89.33 فیصد مارکس لے کر جب میں گھر پہنچا تو میں سوچ رہا تھا کہ چاروں طرف سے مجھے مبارکبادیاں ملیں گی، استقبال کریں گے؛ لیکن میں حیران تھا، گھر میں ہر کسی نے مجھے یہی کہا، ارے یار، چار مارکس زیادہ آتے، تو تیرا 90 فیصد ہو جاتا۔ یعنی، میرے خاندان اور میرے دوست، میرے استاد - کوئی بھی میرے 89.33 فیصد مارکس سے خوش نہیں تھا۔ ہر کوئی مجھے کہہ رہا تھا، یار، چار مارکس کے لیے تمھارا 90 فیصد رہ گیا۔ اب میں اس بات کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ ایسی صورت حال کو کس طرح میں ہینڈل کروں۔ کیا زندگی میں یہی سب کچھ ہے کیا؟ کیا میں نے جو کیا، وہ اچھا نہیں تھا کیا؟ کیا میں بھی کچھ کم پڑ گیا کیا؟ پتہ نہیں، میرے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔

گورو، آپ کے خط کو میں نے بہت احتیاط سے پڑھا ہے اور مجھے لگتا ہے، شاید یہ کرب آپ ہی کا نہیں، آپ کے جیسے لاکھوں- کروڑوں طلبا کا ہوگا، کیونکہ ایک ایسا ماحول بن گیا ہے کہ جو ہوا ہے، اس کے تئیں اطمینان

کے بجائے اس میں سے عدم اطمینان تلاش کرنا، یہ منفی رویے کی دوسری شکل ہے۔ ہر چیز میں سے عدم اطمینان کرنے سے معاشرے کو اطمینان کی سمت میں ہم کبھی نہیں لے جا سکتے ہیں۔ اچھا ہوتا، آپ کے اہل خانہ نے، آپ کے ساتھیوں نے، دوستوں نے آپ کے 89.33 فیصد کو سراہا ہوتا، تو آپ کو اپنے آپ ہی زیادہ کچھ کرنے کا من کر جاتا۔ میں والدین سے، آپ کے اردگرد کے لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ کے بچے جو رزلٹ لے کر آئے ہیں، اس کو قبول کیجیے، خوش آمدید کیجیے، اطمینان کا اظہار کیجیے اور اس کو آگے بڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی کیجیے، ورنہ ہو سکتا ہے، وہ دن بھی آئے گا کہ آپ کو 100 فیصد آنے کے بعد آپ کہیں کہ بھئی 100 آیا، لیکن پھر بھی آپ کو کچھ ایسا کرتے تو اچھا ہوتا تو ہر چیز کی کچھ تو عزت دینی ہی چاہیے۔

مجھے جودھپور سے سنتوش گری گوسوامی نے بھی لکھا ہے، قریب قریب اسی طرح سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے آس پاس کے لوگ ہمارے نتائج کو قبول ہی نہیں کر رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ کچھ اور اچھا کر لیتے، کچھ اور اچھا کر لیتے۔ مجھے شاعری پوری یاد نہیں ہے، لیکن بہت پہلے میں نے پڑھی تھی، کسی شاعر نے لکھی تھی کہ زندگی کے کینوس پر میں نے کرب کی تصویر بنائی اور جب اس کی نمائش کی تھی، لوگ آئے، ہر کسی نے کہا، ٹچ اپ کی ضرورت ہے، کوئی کہتا تھا کہ نیلے کی بجائے زرد ہوتا تو اچھا ہوتا؛ کوئی کہتا تھا، یہ لائن یہاں کے بجائے ادھر ہوتی تو اچھا ہوتا۔ کاش، میرے اس کرب کی تصویر پر کسی ایک آدھ ناظر نے بھی تو آنسو بہائے ہوتے۔ شاعری کے الفاظ یہی تھے، ایسا مجھے اب یاد نہیں رہا، لیکن بہت پہلے کی کویتا ہے، لیکن جذبہ تو یہی تھا۔ اس تصویر میں سے کوئی کرب نہیں سمجھ پایا، ہر کوئی ٹچ اپ کی بات کر رہا تھا۔ سنتوش گری جی، آپ کی فکر بھی ویسی ہے، جیسی گوروکی ہے اور آپ جیسے کروڑوں طلبا کی ہوگی۔ لاکھوں کی توقعات کو مکمل کرنے کے لیے آپ پر بوجھ بنتا ہے۔ میں تو آپ سے اتنا ہی کہوں گا کہ ایسی صورت حال میں آپ اپنا توازن نہ کھوئیں۔ ہر کوئی توقعات کا اظہار کرتا ہے سنتے رہیے، لیکن اپنی بات پر ڈٹے رہیے اور کچھ اچھا کرنے کی کوشش بھی کرتے رہیے۔ لیکن جو ملا ہے، اس پر اطمینان نہیں کرو گے تو پھر نئی عمارت کبھی نہیں بنا پاؤ گے کامیابی کی مضبوط نیو ہی بڑی کامیابی کی بنیاد بنتی ہے۔ کامیابی میں سے بھی پیدا ہوا عدم اطمینان کامیابی کی سیڑھی نہیں بنا پاتا، وہ ناکامی کی گارنٹی بن جاتا ہے اور اس وجہ سے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ جتنی کامیابی ملی ہے، اس کامیابی کو گن گناؤ، اسی میں سے نئی کامیابی کے امکانات پیدا ہوں گے۔ لیکن یہ بات میں اڑوس پڑوس اور ماں باپ اور ساتھیوں سے زیادہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کے ساتھ مہربانی کر کے اپنی توقعات ان پر مت تھوپیں اور دوستو! کیا کبھی کبھی زندگی میں ناکام ہوئے، تو کیا وہ زندگی ٹھہر جاتی ہے؟ جو کبھی امتحان میں اچھے مارکس نہیں لا سکتا، وہ اسپورٹس میں بہت آگے نکل جاتا ہے، موسیقی میں آگے نکل جاتا ہے، کلاکاری میں آگے نکل جاتا ہے، کاروبار میں آگے نکل جاتا ہے۔ ایشور نے ہر کسی کو کوئی نہ کوئی تو حیرت انگیز صلاحیت دی ہی ہوتی ہے۔ بس، آپ اپنے اندر کی طاقت کو پہچانیے، اس پر زور دیجیے، آپ آگے نکل جائیں گے۔ اور یہ زندگی میں ہر جگہ پر ہوتا ہے۔ آپ نے سنتور نام کے آلہ کو سنا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا، سنتور آلہ کشمیر کی وادی میں عوامی موسیقی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ لیکن ایک پنڈت شیو کمار تھے جنہوں نے اس کو ہاتھ لگایا اور آج دنیا کا ایک اہم آلہ بنا دیا۔ شہنائی - شہنائی ہماری موسیقی کے پورے علاقے میں محدود جگہ پر تھا۔ زیادہ تر راجہ-مہاراجاؤں کے جو دربار ہوا کرتے تھے، اس کے دروازے پر اس کا مقام رہتا تھا۔ لیکن جب استاد بسم اللہ خاں نے شہنائی کو ہاتھ لگایا، تو آج دنیا کا بہترین آلہ بن گیا، اس کی ایک شناخت بن گئی ہے اور اس وجہ سے آپ کے پاس کیا ہے، کیسا ہے، اس کی فکر چھوڑیے، اس پر آپ جٹ جائیے، جٹ جائیے۔ نتائج ملیں گے ہی۔

میرے پیارے ہم وطنو! کبھی کبھی میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے غریب خاندانوں کا بھی شفا کو لے کر کے جو خرچ ہوتا ہے، وہ زندگی کی پٹری کو غیر متوازن کر دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کہ بیمار نہ ہونے کا خرچ بہت کم ہوتا ہے، لیکن بیمار ہونے کے بعد صحت مند ہونے کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہم ایسی زندگی کیوں نہ جئیں، تا کہ بیماری آئے ہی نہیں، خاندان پر اقتصادی بوجھ ہو ہی نہیں۔ ایک تو حفظان صحت بیماری سے بچانے کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ غریب کی سب سے بڑی خدمت اگر کوئی کر سکتا ہے، تو حفظان صحت کر سکتا ہے اور دوسرا جس کے لیے میں مسلسل درخواست کرتا ہوں، وہ ہے یوگ۔ کچھ لوگ اس کو 'یوگا' بھی کہتے ہیں۔ 21 جون بین الاقوامی یوگا دن ہے۔ پوری دنیا میں یوگا کے تئیں ایک توجہ بھی ہے، احترام بھی ہے اور دنیا نے اس کو قبول کیا ہے۔ ہمارے اجداد کا دیا ہوا ایک انمول تحفہ ہے جو ہم نے دنیا کو دیا ہے۔ کشیدگی سے دوچار دنیا کو متوازن زندگی جینے کی طاقت یوگا دیتا ہے۔ ''احتیاط علاج سے بہتر ہے''۔ یوگا سے جڑے ہوئے شخص کی زندگی میں صحت مند رہنا، متوازن رہنا، مضبوط قوت ارادی کا حامل ہونا اعتماد سے بھرپور زندگی ہونا، ہر کام میں یکسوئی کا ہونا، یہ حصولیابیاں ہوتی ہیں۔ 21 جون - یوگا دن، یہ صرف ایک ایونٹ نہیں ہے، اس کی اہمیت بڑھے، ہر شخص کی زندگی میں اس کا مقام بنے، ہر شخص اپنے معمول میں 20 منٹ، 25 منٹ، 30 منٹ یوگا کے لیے صرف کرے اور اس کے لیے 21 جون یوگا دن ہمیں ترغیب دیتا ہے اور کبھی کبھی اجتماعی ماحول شخص کی زندگی میں تبدیلی لانے کا سبب بنتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں، 21 جون جہاں بھی آپ رہتے ہوں، آپ کی پہل کے لیے ابھی ایک مہینہ ہے۔ آپ حکومت ہند کی ویب سائٹ پر جاؤ گے تو یوگا کا جو اس بار کا سلیبس ہے، کون کون سے آسن کرنے ہیں، کس قسم سے کرنے ہیں، اس کا پورا بیان ہے اس میں؛ اس کو دیکھیے، آپ اپنے گاؤں میں کروائیے، آپ محلے میں کروائیے، اپنے شہر میں کروائیے، آپ اسکول میں، انسٹی ٹیوشن میں، یہاں تک کہ دفاتر میں بھی۔ ابھی سے ایک مہینہ شروع کر دیں، دیکھیے، آپ 21 جون کو شریک کار بن جائیں گے۔ میں نے کئی بار پڑھا ہے کہ بہت سے دفاتر میں باقاعدگی سے صبح ہوتے ہی یوگ اور پرانایم اجتماعی طور پر ہوتا ہے، تو پورے دفتر کی کارکردگی اتنی بڑھ جاتی ہے، پورے دفتر کا کلچر بدل جاتا ہے، ماحول بدل جاتا ہے۔ کیا 21 جون کا ہم استعمال اپنی زندگی میں یوگا لانے کے لیے کر سکتے ہیں، اپنے معاشرے کی زندگی میں یوگا لانے کے لیے کر سکتے ہیں، اپنے آس پاس کے احاطے میں یوگا لانے کے لیے کر سکتے ہیں؟ آپ بھی اس دن ضرور جڑیں، پوری دنیا یوگا کرنے والی ہے۔ آپ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں، یہ میں زور دے کر کہہ رہا ہوں۔ آپ کا صحت مند رہنا ہندوستان کو صحت مند بنانے کے لیے بہت ضروری ہے۔

میرے پیارے ہم وطنو! 'من کی بات' کے ذریعے آپ سے میں مسلسل جڑتا ہوں۔ میں نے بہت پہلے آپ کو ایک موبائل نمبر دیا تھا۔ اس پر مسڈ کال کر کے آپ 'من کی بات' سن سکتے تھے، لیکن اب اس کو بہت آسان کر دیا ہے۔ 'من کی بات' سننے کے لیے اب صرف 4 ہی پوائنٹس ہیں- اس کی طرف سے مسڈ کال کر کے 'من کی بات' سن سکتے ہیں۔ وہ چار اعداد و شمار کا نمبر ہے- انیس سو بائیس- 1922 اس نمبر پر مسڈ کال کرنے سے آپ جب چاہیں، جہاں چاہیں، جس زبان میں چاہیں، 'من کی بات' سن سکتے ہیں۔

پیارے ہم وطنو! آپ سب کو پھر سے نمسکار۔ میری پانی کی بات مت بھولنا۔ یاد رہے گی نہ؟ ٹھیک ہے۔ شکریہ۔ نمستے۔

■

آپ کی بات

'اردو دنیا' جون کے شمارے میں مناظر کا زلزلہ خیز مضمون اچھا لگا۔ مکتوبات نگاری پر نذیر فتح پوری کی تحریریں بہت وقیع ہیں مگر یہ موضوع تشنہ ہی نہیں بلکہ وسعت طلب بھی ہے۔ نذیر نے لکھا ہے کہ اردو ادب میں مکتوب نگاری کو بہ طور صنفِ ادب متعارف کرانے کی اولیت کا سہرا مرزا رجب علی بیگ سرور کے سر جاتا ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ خط منظوم تھا جو میر ابراہیم خان جیو کے نام مرزا رجب علی بیگ سرور نے لکھا تھا پھر اس خط کا منظوم جواب میر ابراہیم خان نے دیا تھا۔ یہ منظوم خطوط ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد کی ایک بیاض نمبر 1130 جلد پنجم میں صفحہ نمبر 289 میں موجود ہیں۔

نذیر کے مضمون کا اختتام سچائی پر مبنی ہے— نئی تہذیب نے پرانی تہذیب کو نگل لیا ہے—

محمد علی اثر نے اپنے مضمون 'حفیظ ہوشیار پوری شاعرِ شہرِ محبت' میں لکھا ہے کہ حفیظ کی غزلیں مختلف گلوکاروں کی آواز میں ساری دنیا میں گونجتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شاعری گلوکاروں کی کمائی کا ذریعہ بن جاتی ہے وہ شاعری ادبی دنیا سے الگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال شکیل بدایونی، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، شیون رضوی، راجہ مہدی علی خان اور عزیز قیسی جیسے بہترین شاعروں کی شاعری کا بھی رہا ہے۔

محمد علی اثر نے حفیظ کو 'شاعرِ شہرِ محبت' کہا ہے مگر وہ تو شاعرِ شہرِ عشق ہے۔ تخلیق غزل کا اہم محور ہی غمِ عشق اور غمِ ہجراں رہا ہے۔ ان دونوں صفات سے حفیظ کی غزلیں معمور تھیں۔ حفیظ کی غزلیں کلاسیکی قدروں کی پاسدار تھیں بقول اثر کہیں کہیں نت نئی قدروں کی بھی غماز ہیں— اثر نے حفیظ پر لکھتے لکھتے ن م راشد کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ن م راشد کی نظمیں پتہ نہیں کس دنیا والوں کے لیے لکھی گئی ہیں راشد کی اکثر نظمیں بعید از فہم ہیں۔ شارحینِ غالب تو پیدا ہو گئے ہیں لیکن 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کی نظموں کی تفہیم کے دریچے وا کرنے والے کا ہنوز انتظار ہے۔ راشد کی بعض نظموں کی الٹی بلندیوں تک ابوالکلام قاسمی نے رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً راشد کی ایک نظم 'اجنبی عورت' ابہام کے دائروں میں چکر لگاتی ہے۔ قاسمی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کی تفہیم پیش

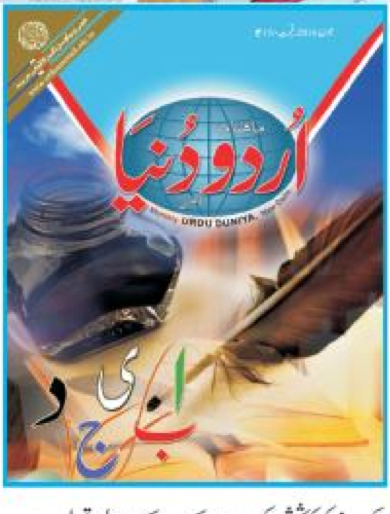

کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک حد تک قابلِ قبول ہے۔

حسین الحق نے اردو، عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور بنگالی ادب کے اشاعتی آفتاب کی نوری کرنوں سے ہماری ملاقات کرائی ہے یہ وہ آفتاب ہے جس سے ساری دنیا روشنی حاصل کرتی رہی ہے۔ آج بھی نول کشور کے چھاپہ خانے کی کتابیں تاریخ ادب اردو میں اپنی افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے روشن مقام رکھتی ہیں۔ حسین الحق صاحب نے اپنے مضمون میں ایک قدیم اخبار 'کوہِ نور' کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح کے اخبارات آج ناپید ہیں اس اخبار کے چند شمارے برسوں پہلے مدراس کے مشہور کتب خانے 'کتب خانۂ اہل اسلام' میں دیکھنے کو ملے تھے آج یہ شمارے بھی کتب خانے سے غائب ہیں۔

حسین الحق نے اپنے مضمون میں بعض باتیں بڑے پتے کی لکھی ہیں۔ وہ یہ کہ منشی نول کشور کے مطبع میں کام کرنے والوں کے لیے یہ ہدایت تھی کہ کوئی بھی بغیر وضو کے قرآن و حدیث کی کتابیں نہ چھوئے اور لیتھو طباعت کی مشین کو بھی نہ ہاتھ لگائے۔ جناب آج وہ دور کہاں رہا ہے— دہلی ہی کے مطبعوں کو لیجیے کیا اس قسم کی کوئی ہدایت کہیں لاگو ہے۔ کیا پھر اس دور میں کوئی منشی نول کشور پیدا ہو سکتا ہے؟ قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی شخصیت اور اس شخصیت کی علمی، ادبی اخلاقی اور نورانی صفات کا جائزہ لیتے ہوئے

اپنی بے پناہ محبتوں اور عقیدتوں کے لازوال نقوش اجاگر کیے ہیں۔ پورا مضمون سچائیوں کا آئینہ دار ہے۔ بشیر نے بھی جوگندر پال پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ پال سے موصوف نے اپنی ملاقاتوں کے روشن لمحات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اسلم جمشید پوری نے بھی جوگندر پال کی تخلیقی جہتوں کا بڑے اچھے انداز سے محاسبہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی اپنی شاعری سے بھی بہت زیادہ خوب صورت مولانا آزاد والے مضمون میں لگے۔ موصوف اگر اپنی نثری صلاحیتوں کی پوشیدہ دنیا کو منظرِ ادب پر لے آئیں تو واقعی شعری کائنات میں ایک زلزلہ آ جائے گا۔

علیم صبا نویدی: فلیٹ نمبر 16، راکس منڈی اسٹریٹ، چنئی

جون ماہ کا شمارہ حسبِ معمول مکمل آب و تاب اور جاذبِ نظر سرورق و معیاری مشمولات کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں ممتاز و شہرۂ آفاق شاعر جناب ن م راشد کی فکری و فنی جہات پر مبنی بلند پایہ مضمون تحقیق و تنقید کی ایک قابلِ تقلید مثال بھی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا مقالہ ایک نایاب موضوع و نقطۂ نظر 'زلزلے' پر مبنی تو ہے ہی، اس میں اختصار کے ساتھ چیدہ چیدہ اشعار کے بھی حوالے دیے گئے ہیں۔ صرف صفحہ 18 پر محولہ شعر میں لفظ 'سمت' کے بعد 'کے' کی بجائے 'گئے' لفظ درکار تھا۔ موصوف نے اپنے شعر کا حوالہ دینے کے باوصف کہیں بھی 'کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور' والی ایسی خود بینی یا خود پرستی کا شائبہ تک نہیں ہے، جو کہ 'خط' جیسے کمیاب مضمون پر مبنی اگلے ہی مقالے میں نذیر فتح پوری صاحب نے اپنے محولہ اشعار سے نادانستاً ثبوت دیا ہے۔ قارئین کے لیے 'خط' کی بابت ایک رباعی ہے: ''چاہے کوئی پیغام نہ لکھ، کوئی دعا سلام نہ لکھ/ خط تیرا اور میں نہ پہچانوں۔ خط کے نیچے بھلے تو نام نہ لکھ۔'' نایاب موضوع پر یہ مقالہ بھی نذیر صاحب کے دیگر مقالوں کی ہی مانند اردو شاعری میں ان کی گہری غواصی کا ہی مظہر ٹھہرتا ہے۔ یہ سنت کبیر کے دوہے کی اس سطر کی یاد دہانی کراتا ہے: ''جن کھوجا، تن پایا، گہرے پانی پیٹھ۔''

جناب احترام اسلام نے اپنے مضمون میں اگرچہ ہندی زبان میں مروجہ صنفِ غزل کے متعلق چند ضروری مدعوں کی خط کشی کی ہے، تاہم سنسکرت میں کلاسیکی ناقدوں نے 'وی انجنا' Vi Anjna نام کی شبد شکتی کو قائم کیا ہے، جس کے بموجب کاویہ (شاعری) میں اہم مدعے یا مضمون کو نہفتہ رکھنے سے اس کا کل اثر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ اردو زبان میں بھی اسی کے مترادف یا مماثلت رکھنے والے 'سہلِ ممتنع' نام کے شعری اسلوب کی ترکیب دی گئی ہے۔ مشہور ہندی کوی اور کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ('کارواں گزر گیا' گیت فیم) جناب گوپال داس نیرج نے کہا تھا کہ "غزل تو صرف غزل ہی ہوتی ہے، اس کے ساتھ 'ہندی' یا 'اردو' لفظ نہیں جوڑنا چاہیے۔ یہ قول یہ خاکسار برائے بحث ومباحثہ درج کر رہا ہے۔ اپنے شاہی شہر 'پٹیالہ میں اردو' میں عابد علی خاں صاحب نے اپنے مقالے میں اس کے مختصر ہونے کے باوصف معلومات کا خزینہ پیش کر دیا ہے۔

✧ **کرشن بھاوک**: A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ

'اردو دنیا' جون کا شمارہ موصول ہوا۔ ماشاء اللہ تمام مشمولات لائق تحسین ہیں۔ محترم علیم صبا نویدی کا عسکری صفدر کے مضمون 'خورشید احمد جامی جدید غزل گو' پر مراسلہ پڑھ کر حیرت ہوئی۔ خورشید احمد جامی میرا نہایت پسندیدہ شاعر تھا اور ہے۔ وہ مضمون اچھا خاصا تھا۔ موضوع جدید غزل گو کے لحاظ سے محترمہ نے اشعار کا مناسب انتخاب کیا تھا۔ علیم صبا نویدی کی آفاقیت سے کیا مراد ہے؟ اگر وہ میر، غالب، اقبال اور فیض کے کلام سے آفاقیت کا لطف اٹھاتے تو اچھا تھا۔ بیچارے خورشید احمد جامی کے کلام سے ہی کیوں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے لکھا 'جامی شخصیت اور فن' 1974 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ بیشک یہ نمبر شائع ہوا لیکن برسوں بعد محمود خاور نے 'خورشید احمد جامی شخص و شاعر' مرتب کیا جو کراچی سے شائع ہوا جس کا ذکر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اپنے کالم 'ادبی ڈائری' روزنامہ سیاست حیدرآباد مورخہ 24 مارچ 2012 میں صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ معروف ادیبوں کو چاہیے کہ نئے قلم کاروں کی ہمت افزائی کیا کریں نا کہ بیجا اعتراض۔ علیم صبا نویدی نے میراجی اور اختر الایمان کے بعد ندا فاضلی کو اردو نظم کا بڑا شاعر بتایا۔ جوش، فیض، اور مخدوم تو چیزے دیگراست۔ البتہ ساحر اور شہریار کدھر گئے۔ علاوہ ازیں رسالے کے سارے مضامین معیاری، دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

✧ **رشیدالدین**: ریسرچ اسکالر، 304 گلنار اپارٹمنٹ، حیدرآباد

'اردو دنیا' مئی کا شمارہ مطالعے میں ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ساتھ آصف جیلانی کی گفتگو دماغ کو برسوں پیچھے لے گئی۔ ہم جیسے عاشقان اردو قرۃ العین کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کا ناول 'آگ کا دریا' ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

✧ **محمد سالم باڑ پارا**: الاقرا، کوڈور، ملاپورم، کیرلہ

'اردو دنیا' ماہ مئی 2016 کا تازہ ترین شمارہ نظر نواز ہوا جس کو پڑھ کر فرحت وشادمانی محسوس ہوئی۔ میں اردو دنیا کا نیا قاری ہوں اور تقریباً ایک سال سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یوں تو رسالے کے سارے ہی مضامین ماشاءاللہ عمدہ و دیدہ زیب ہوتے ہیں لیکن اس شمارے میں جناب فیروز بخت احمد صاحب کا مضمون 'غالب کی حویلی کو زندہ یادگار بنانے کی داستانِ جدوجہد' نظر سے گزرا جس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ غالب کی حویلی کے لیے کتنی مشقت جھیلنی پڑ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شمارہ 'اردو دنیا' اردو سے محبت رکھنے والے ہر ایک قاری کے ہاتھوں میں ہو۔

✧ **محمد قاسم القاسمی**: جامعہ عربیہ انصار العلوم، کرتپور، بجنور

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ دیکھا، کافی پسند آیا۔ پسند آنے کی وجہ فکر انگیز مضامین اور آپ کا اداریہ 'ہماری بات' ہے، جس میں اردو سے متعلق چند اہم گفتگو کی گئی ہے۔ آپ نے جہاں اردو کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کی ہے وہیں تشویش بھی ظاہر کی ہے جو قطعی درست ہے۔

محترم! فکر و تحقیق، بچوں کی دنیا اور اردو دنیا تقریباً دو سال سے میرے مطالعے میں ہیں۔ یقین جانیے، ان دو برسوں میں میں نے جتنی معلومات حاصل کر لی ہے، پچھلے دس برسوں میں بھی اتنی معلومات نہیں حاصل کی۔ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ کئی اعتبار سے پچھلے شماروں سے منفرد ہے مثلاً بابا صاحب امبیڈکر سے متعلق خواجہ عبدالمنتقم، مظفر حسین سید اور آفتاب احمد آفاقی نے اپنے مضامین میں کافی معلومات مہیا کی ہے۔ سرحد پار کے حمایت علی شاعر سے متعلق نثار احمد صدیقی نے اپنے انٹرویو میں ان کے کئی گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ تعلیم اور مادری زبان میں شبانہ نذیر، زبان سے متعلق پر مغز باتیں کی ہیں۔ خورشید احمد جامی سے متعلق عسکری صفدر نے جدیدیت کے علمبرداروں میں انھیں شمار کیا ہے۔ معروف کالم وطنز نگار فکر تونسوی کے تعلق سے رفیق احمد نے فکر کی فکر پر گفتگو کی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی لوک کہانیوں کے بارے میں ایم اسلم صدیقی نے متعدد کتابوں کے حوالے سے لوک کہانیوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'غدر' سے متعلق جاوید دانش نے کافی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ زبیر رضوی مرحوم سے متعلق پریمی رومانی نے ان کے فن اور شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کی ہے۔ ندا فاضلی جیسے جدید شاعر پر غلام ابن سلطان، وقار صدیقی اور عارف حسین جونپوری کے مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ علاوہ ازیں آخری سواریاں، اردو صحافت، البرٹ آئنسٹائن، حیات اور کارنامے، قانونی نکات اور سنیما وار وروز زبان، پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہرحال اتنا اچھا تحقیقی اور معلوماتی رسالہ نکالنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔

✧ **رونق افروز**: بھیونڈی، مہاراشٹر

جناب من...! ایک طویل عرصے کے بعد اچانک اپنے ہم جماعت محمد سلمان کھوکھر کے دولت کدے پر جانے کا اتفاق ہوا جہاں ٹی وی ٹرالی پر دیدہ زیب رسالہ 'اردو دنیا' کے سرورق کو دیکھ کر بے ساختہ ہاتھ لپک گیا۔ سو صفحات پر مشتمل شمارے میں نہ تو ایک اشتہار نہ ہی فروعیت سے ہٹ کر کوئی بات نظر آئی۔ ہر ایک سطر علمی آگاہی سے لبریز ہے۔ شمارہ جنوری 2016 کے سرورق '18 واں قومی کتاب میلہ' اور اداریہ بعنوان 'ہماری بات' کے پیراگراف کی ابتدا میں آپ نے ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کو کوزے میں بند کرتے ہوئے رقم کیا کہ "انسان مثبت اور منفی قوتوں کی کشمکش کا شکار ہے" جبکہ اسی طرح تیسرے پیراگراف میں "اردو زبان نے بھی اپنے مثبت احساس کی وجہ سے ہی ارتقا کی اتنی لمبی مسافت طے کی ہے" کہ آج دنیا کی اہم ترین زبان میں سے ایک ایسی زبان ہے جس کے سینے میں مدون وافر علمی ذخائر موجود ہیں۔

✧ **جمیل رعنا اشرفی**: عروس البلاد، کراچی پاکستان

انٹرویو

ادب اور ذاتی زندگی میں مکھوٹوں کا قائل نہیں

معین الدین عثمانی

نذیر فتح پوری

اردو میں ادب عالیہ کو ہمیشه مقدم سمجھا گیا ھے مگر پاپولر ادب کی بھی اھمیت اپنی جگه مسلم ھے. ھر دو ادب کے قارئین اور ناقدین نے اِس روایت کو آگے بڑھایا ھے. نذیر فتح پوری کا تعلق پاپولر ادب سے زیادہ ھی رھا ھے مگر اِس کے باوجود بھی اُن کی نثری اور شعری کاوشوں نے ناقدینِ ادب کو اپنی طرف متوجه کیا ھے. انھوں نے اصنافِ ادب کی تقریباً سبھی اصناف پر طبع آزمائی فرمائی ھے. نثری روایات میں کرشن چندر کے امین تو شعریت میں جدیدیت کے دلدادہ نظر آتے ھیں. موصوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول نگاری سے کیا اور پھر افسانے، شاعری، تنقید، سفرنامے وغیرہ سے ادبی خزانے میں اضافه کیا. ساتھ ھی ایک عرصے سے آپ ایک عدد ادبی سه ماھی رساله اسباق کی ادارت کی ذمه داری بھی بخوبی نباہ رھے ھیں. اِن دنوں نذیر صاحب عمر کی اُس دھلیز پر ھیں جھاں پھنچ کر لوگ دنیا ومافیھا سے بے خبر ھوکر آرام کرنا پسند کرتے ھیں. مگر موصوف کی اردو زبان کے تئیں عقیدت و محبت دیکھ کر نئی نسل کے تازہ کار فنکاروں کو ایک روشنی ملتی ھے جس سے وہ اپنا آئندہ کا سفر طے کرسکتے ھیں.

مختلف اصنافِ ادب سے متعلق اُن کی اب تک ستر کتابیں شائع ھوچکی ھیں اور کتنے ھی مسودے اشاعت کے منتظر ھیں. ذیل میں ھم اُن سے گفتگو کے چند اقتباسات پیش کررھے ھیں:

معین الدین عثمانی: ہر فنکار کا اپنا ایک بنیادی وسیلۂ اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی فلک نما سوچ پر متعدد اصناف ادب کے تارے جھلملاتے نظر آتے ہیں، کوئی مدھم تو کوئی تیز، ایسے میں آپ اپنے آپ کو کس صنف سے جڑا ہوا محسوس کرتے ہیں؟

نذیر فتح پوری: کسی بھی فنکار کے لیے اس کی ہر تخلیقی شے ایک ایسا خزانہ ہے جسے وہ دل و جان سے پیار کرتا ہے اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ میں نے جس قدر اصناف سخن میں اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنے آپ کو ہر صنف سے یکساں طور پر جڑا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میں کسی تخلیق کو کم درجے کی نہیں سمجھتا۔ میری نظر میں ہر تخلیق قیمتی ہے، گراں قدر ہے، ہر تخلیق میں میرا لہو شامل ہے۔

م ع: کہا جاتا ہے کہ جو لوگ ایک وقت میں دو کشتیوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کے ڈوبنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے مگر آپ کا معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ آخر یہ سب آپ کس طرح کر لیتے ہیں۔ کیا آپ کے اندر کوئی ادبی جن ہے جو آپ سے یہ سب کروالیتا ہے؟

نذیر فتح پوری: آپ تو جانتے ہیں میں دو کشتیوں پر نہیں سو کشتیوں پر سوار ہوں اور چالیس سال سے سوار ہوں لیکن میں نے بہت کامیابی کے ساتھ دریا کا یہ سفر طے کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تحقیق، تنقید، تدوین، ترتیب، سفرنامے، ان ساری کشتیوں کے بادبان میرے اشارے کے مرہون منت ہیں۔ خدا مجھ پر مہربان ہے۔ اسی نے میرے بازوؤں کو وہ قوت عطا کی ہے کہ میں اپنے چپوؤں سے ہوا کا رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میرے قبضے میں جو ادبی جن ہے اس کا نام 'اعتماد' ہے اندر کی طاقت ہے جو مجھے ہوا کے دوش پر اڑائے پھرتی ہے اور میرے سارے کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔

م ع: مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کر کے آپ کسی ایک صنف کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتے تو پھر اتنے روگ پالنے کی ضرورت کیا ہے؟

نذیر فتح پوری: میں نے جس صنفِ ادب کی آبیاری کی ہے اس کا پھل مجھے ہر حال میں میسر آیا ہے، اس کا ثبوت وہ ہزاروں صفحات ہیں جو پوری اردو دنیا کے ناقدین اور مبصرین نے میرے فکر و فن پر لکھے ہیں۔ اردو رسائل کے وہ گوشے اور نمبر ہیں جنھوں نے اشاعتی طور پر مجھے اپنی کڑی محنت کی داد دی ہے اور میرے ادبی کام کی ستائش کرتے ہوئے مجھے داد و تحسین سے نوازا ہے اس میں بھرپور اعتراف کا جذبہ موجود ہے۔ ایک ایم۔ فل ہے دو دو پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں جو میرے فکر و فن پر قلم بند کر کے لوگوں نے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

م ع: بنیادی طور پر آپ نے اپنے آپ کو شاعر مانا ہے۔ مگر لگتا ہے ادب کے میلے میں آپ نے اس شاعر کا ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ آپ سے بچھڑ گیا ہے۔ یا روٹھ کر کہیں دور چلا گیا ہے آپ کو کیا لگتا ہے؟

نذیر فتح پوری: میں بنیادی طور پر نہ شاعر ہوں نہ ادیب، میں اپنے آپ کو تخلیقی فنکار تصور کرتا ہوں یہ سچ ہے کہ سب سے پہلے میں نے شاعری کے ذریعے ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن جہاں تک میری کتابوں کی اشاعت کا سوال ہے سب سے پہلے 1975 میں میرا ناول 'چٹانوں کے بیچ' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرا ناول 'زخم اور آہیں' 1977 میں شائع ہوا۔ میرا شعری مجموعہ تو سات سال بعد 1984 میں 'لمحوں کا سفر' کے نام سے شائع

ہوا۔ میں نے اپنے اندر کے شاعر کی انگلی ہی نہیں پکڑی بلکہ پوری شدت کے ساتھ اسے اپنے آپ کے وجود کا حصہ بنا رکھا ہے۔ اس کا ثبوت میرے وہ شعری مجموعے ہیں جو مختلف اصناف میں شائع ہو چکے ہیں جن کی تعداد بیس تک پہنچنے والی ہے اس بے قدری کے زمانے میں اردو کے ایک شاعر سے آپ اور کیا توقع رکھتے ہیں۔

م ع: میر و غالب سے لے کر موجودہ دور کے فاروقی اور نارنگ تک نے ادب کی مختلف اصناف میں کام کیا ہے اور کر رہے ہیں مگر انھیں دوامی ادبی زندگی ایک ہی صنف نے عطا کی ہے اس ضمن میں آپ کا قرعہ فال کہاں گرتا ہے؟

نذیر فتح پوری: میں اپنے قرعہ فال کو محفوظ رکھتا ہوں۔ میر و غالب تو موجود نہیں۔ سوال شمس الرحمٰن فاروقی اور محترم گوپی چند نارنگ کے ادبی معرکوں کا ہے تو یہاں میں لب کشائی کی جسارت نہیں رکھتا۔ یہ دونوں نام ادب کی تاریخ کے سرنامے ہیں۔ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ دونوں حضرات نے اردو ادب میں جو بھی کام کیا ہے وہ اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

م ع: مختلف اصناف ادب کے ساتھ زیادتی پر ہی آپ نے بس نہیں کیا بلکہ ایک عدد ادبی رسالے کی ادارت کی ذمے داری سنبھال کر اپنی ادبی حیثیت کو مجروح کیا ہے کیا اس سے آپ کے اندر کا تخلیق کار ناراض نہیں ہوا؟

نذیر فتح پوری: ادبی رسالے کی ادارت سے بھلا تخلیق کار کے ناراض ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اس سے تخلیق کار تو انتہائی خوش ہوا کہ رسالے کی وجہ سے اظہار کے نئے نئے راستے نکلنے لگے۔ ایک طرف اداریہ سپرد قلم کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف تو سیجی نظم لکھی جا رہی ہے، فنکاروں اور قلم کاروں کے فکر و فن پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے وجود میں آ رہے ہیں۔ سفر نامے لکھے جا رہے ہیں۔ بحث و تمحیص میں حصہ لیا جا رہا ہے۔ رسالہ مخالفین کی گردن پر تلوار کا کام کرتا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے ادب میں بہت سے معرکے محض اپنے رسالے نگار کی وجہ سے سر کیے۔ اور یہ جو آپ نے سوال کے پہلے حصے میں مختلف اصناف کے ساتھ زیادتی کی بات کی ہے یہ میرے ساتھ آپ کی زیادتی ہے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ ادب کی جن اصناف پر میں نے قلم اٹھایا ہے ان سب سے میری دوستی ہے۔ میں نے سب کو تخلیقی طور پر عزت بخشی ہے۔ سر پر بٹھایا ہے ان کا رتبہ بلند کیا ہے ان سے محبت کی ہے۔

م ع: اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نثر میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ پھر کیوں آپ نے شاعری کو مقدم جانا۔ اگر آپ مکمل فکشن لکھتے تو ممکن تھا موجودہ دور کے کرشن چندر کہلاتے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

نذیر فتح پوری: میں نے شاعری اور نثر میں کبھی کسی کا تتبع نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنی راہ بنانے کی اور آپ اپنی ہی ڈگر پر چلنے کی کوشش کی۔ شاعری اور نثر دونوں کو میں اپنے کندھوں پر سوار رکھتا ہوں۔ دونوں کے ساتھ میرا یکساں خلوص ہے۔ دونوں سے میں الگ الگ نوعیت کا کام لیتا ہوں۔ میں کسی کو مقدم اور موخر نہیں سمجھتا۔ میں اپنی شناخت صرف نذیر فتح پوری کے طور پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔ ادب میں بھی اور ذاتی زندگی میں بھی میں مکھوٹوں کا قائل نہیں۔ اپنا چہرہ اور اپنی شناخت مجھے عزیز ہے۔

م ع: آپ کے تعلق سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو بھی ادبی شہرت آپ کے حصے میں آئی ہے وہ محض آپ کے رسالے کے طفیل ہے۔ اس بات سے آپ کہاں تک اتفاق کریں گے۔

نذیر فتح پوری: ایسا کہنا بھی سراسر زیادتی ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس میں برائی کیا ہے۔ رسالہ بھی ایک طرح سے میری تخلیق ہی ہے۔ دنیا جانتی ہے۔ غزل کا مجموعہ شائع کرنا آسان ہے۔ رسالہ شائع کرنا لوہے کے چنے چبانے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ مشکل کام میں گذشتہ 35 سال سے انجام دے رہا ہوں اگر یہ کام آسان ہے تو اور بھی لوگ کر سکتے ہیں لیکن کہنا بہت آسان ہے۔ کرنا بہت مشکل۔ جگر کو خون کرنا پڑتا ہے صحت کو دیمک لگ جاتی ہے قطرہ قطرہ مرنا پڑتا ہے۔ تب ایک رسالے کو زندگی ملتی ہے۔

م ع: رسالہ اسباق کے گوشوں سے متعلق بھی یہ بات عام ہے کہ آپ نے غیر معیاری شخصیات کو بڑھاوا دیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔

نذیر فتح پوری: ابتدا میں ایک غیر معیاری قلم کار پر دو نمبر شائع کیے تھے۔ اس کے بعد جتنے قلمکاروں پر گوشے شائع کیے ہیں ان کے معیار پر انگلی اٹھانا ایک طرح کا الزام ہی سمجھا جائے گا۔ مثلاً ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر محسن جلگانوی افسانہ نگار لیسین احمد، نوجوان افسانہ نگار مظہر سلیم، بزرگ شاعر خلیل تنویر، راجستھان کے عوامی شاعر مضطر صدیقی، نوجوان شاعر و نقاد شاہد پٹھان، مرحوم پرکاش فکری، علامہ ماجد الباقری، برطانیہ میں مقیم اہم افسانہ نگار جاوید اختر چودھری ہمہ جہت قلم کار رفیق شاہین، ادبی محاذ کے مدیر شاعر و ادیب سعید رحمانی، کویت میں مقیم ادیبہ شاعر محترمہ میمونہ علی چوگلے، اسلم عمادی، خلیل فرحت، عزیز عفان اور عباس خان۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اور معین الدین عثمانی، آپ بتائیں کہ ان میں کون سا قلمکار غیر معیاری اور کمزور ہے۔ کوثر صدیقی اور سوہن راہی کے علاوہ ادے سرن ارمان کے فکر و فن پر بھی خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں۔ ادب میں مفتیوں کی کمی نہیں۔ کچھ بے دریغ فتوے جاری کرتے ہیں اور کچھ فتوے حاصل کر کے سنسنی پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ہی پیروں کے نشان مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ نہ ان کا اپنا کوئی راستہ ہوتا ہے۔ اسباق

نذیر فتح پوری - سوانحی کوائف

اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاوٹی ضلع سیکر راجستھان کے سرٹیفکیٹ کے مطابق نذیر فتح پوری کی پیدائش یکم دسمبر 1946 کو ہوئی۔ درجہ پنجم تک ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد حصول تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ 1959 کے آس پاس والد کے ہمراہ پونہ مہاراشٹر آ گئے۔ برسوں معمار سازی کا کام کیا پھر اسی شعبے میں ٹھیکے داری کرنے لگے۔

ادب کی دنیا میں شاعری کے توسط سے داخل ہوئے۔ پھر ناول نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ ساتھ ہی افسانہ نگاری کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ 1972 میں پہلا افسانہ شائع ہوا۔ 1975 میں پہلا ناول 'چٹانوں کے بیچ' عنوان سے شائع ہوا۔ اب تک مختلف اصناف شاعری میں 20 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کل کتابوں کی تعداد 65 ہے۔ جن میں ناول، سفرنامے، تذکرے، ادبی اور تنقیدی مضامین، آپ بیتی، شخصی خاکے، مکتوباتی مجموعے، افسانچے سوانحی ناول وغیرہ شامل ہیں۔

ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشن، دوردرشن وغیرہ سے کلام، انٹرویوز نشر ہوئے۔ راجستھان اور دیگر جامعات سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات ان کی شخصیت پر تحریر ہوئے۔ نیز راجستھان اور دیگر علاقوں کے نصاب میں کلام اور دیگر چیزیں شامل ہیں۔

اسباق پبلی کیشنز کے توسط سے اردو شعر و ادب کی اب تک دو سو کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی ایک عدد ادبی سہ ماہی رسالہ 'اسباق' کے نام سے 35 برس سے مسلسل شائع کر رہے ہیں۔ ملک و بیرون سیکڑوں مقامات پر مشاعروں اور سیمناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ کئی رسائل و جرائد نے آپ کی شخصیت پر گوشے اور خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ آپ کے کلام کا انگریزی اور مراٹھی زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

مہاراشٹر، راجستھان، بہار، یوپی اکادمیوں نے متعدد بار کتابوں پر انعام سے نوازہ ہے۔ اس کے علاوہ غیر سرکاری سطح پر ملک کی بیشتر انجمنوں نے اعزاز و اکرام کیا ہے۔

انٹرویو

کے گوشوں کی قارئین کرام نے بے حد داد دی ہے اور اپنی پسند سے نوازا ہے۔ اس لیے غیر معیاری کا فتویٰ اسباق کے گوشوں پر نہیں لگایا جا سکتا۔

م ع: آپ کی مکتبی تعلیم کم ہے مگر کام کی مقدار اور معیار اس کی نفی کرتے ہیں۔ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا۔

نذیر فتح پوری: آپ اسے ادبی کرامت کہہ سکتے ہیں۔ چالیس پچاس سال کی حقیقت چار سطور میں بیان نہیں ہو سکتی۔ میرے ادبی کام نے مکتبی تعلیم کے تصور کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

م ع: آپ کے اولین دور کی زیادہ تر تخلیقات پاپولر اور کمرشیل رسائل میں شائع ہوئیں جنھیں ادب کے جگادریوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ ناانصافی ہوئی ہے۔

نذیر فتح پوری: ابتدا میں ان رسائل کی بنا پر مجھے عوامی مقبولیت بہت ملی۔ اس کی بنیاد پر میں نے مستقبل کی درجہ بندی کا منصوبہ بنایا۔ آپ عوامی مقبولیت کو کم تر نہ سمجھیں۔ عوام نے جن فنکاروں کو سر پر بٹھا لیا ان کی مقبولیت قابل رشک ہے۔ ابتدا میں ایک دوشیزہ میری ایک نظم پڑھ کر دور دراز کا سفر طے کر کے میرے گھر آ گئی۔ اس نوعیت کے دوسرے واقعات بھی ہوئے۔ میرے نام رسائل میں کھلے خط بھی شائع ہوئے۔ یہ کوئی مذاق نہیں، مشاعرے کا شاعر ایک واہ کے لیے ترس جاتا ہے۔ ان معنوں میں میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے عوام اور خواص دونوں کی جانب سے پیار ملا۔ پذیرائی ملی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ادب کی دنیا میں سر پر بٹھایا گیا، بے پناہ محبتوں سے نوازا گیا۔

م ع: کہا جاتا ہے کہ ادب میں جس کا پی آر او (PRO) مضبوط ہوگا اسی کا جھنڈا بلند ہوگا۔ کیا اس بات پر آپ کا یقین ہے۔

نذیر فتح پوری: جی نہیں۔ جس تخلیق کار میں جتنا دم خم ہوگا اسی کا جھنڈا بلند ہوگا۔ مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں۔ میرا کوئی پی آر او نہیں میں اپنا سارا کام خود ہی کرتا ہوں۔

م ع: ادب میں شروع ہی سے نظریات کی ریل پیل رہی ہے مگر برخلاف اس کے آپ کے یہاں نظریات کا فقدان ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں۔

نذیر فتح پوری: میں زندگی میں بھی اور ادب میں بھی ہمیشہ صحت مند نظریے کا حامی رہا ہوں۔ اب یہ محسوس کرنے کی بات ہے۔ قاری جتنا باشعور ہوگا اتنا ہی میری تخلیقات میں پوشیدہ نظریات سے واقفیت حاصل کرے گا۔

م ع: ادب میں نظریات، مقصدیت اور تفریحی عناصر ہوتے ہیں ان میں آپ کی ترجیحات کی ترتیب کیسی ہے۔

نذیر فتح پوری: میں یہ سب جھمیلے نہیں جانتا۔ میری نظر میں تفریحی ادب بھی کوئی برا نہیں ہے۔ آپ کی کسی چیز یا کسی بات سے کسی کا دل بہل جائے تو اس میں نیکی کی بات ہے۔ مجھے ایک مصور کی بات یاد آ گئی۔ جس کی تصویروں کی نمائش سے متاثر ہو کر ایک نوجوان لڑکی نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے نوٹ میں لکھا ’’مجھے آپ کی تصویروں کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ زندگی میں کتنے رنگ ہیں اور کتنے پھول ہیں۔‘‘ آپ کی تصویریں دیکھ کر میں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں ایسے ادب کو مقدم سمجھتا ہوں جو زندگی میں کسی کے کام آئے۔ آپ اسے جو چاہے نام دے سکتے ہیں۔ میں اسے ادبی نیکی کہوں گا۔

م ع: ناقدین ادب کی طرف سے جو مقام آپ کو ملنا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں کیا آپ کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔ اگر نہیں تو آپ اس تعلق سے کسے قصوروار گردانتے ہیں۔

نذیر فتح پوری: لگتا ہے آپ نے منفی سوالات کی لمبی قطار لگا رکھی ہے۔ ایک کے بعد ایک آپ کی یلغار سے میں قطعی پریشان نہیں ہوں گا۔ آپ کے سوالات نے بہت سی پوشیدہ باتیں بھی مجھ سے ظاہر کروا لیں، آپ کے اس سوال کے جواب میں بتا دوں کہ ہمارے یہاں مقامات کم ہیں اور حقداروں کی لمبی قطار ہے جس کی جو قسمت میں ہے وہ اسے مل جاتا ہے۔ مجھے بھی میری بساط کے مطابق بہت کچھ ملا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید جیسے ناقدین نے میری تخلیق کو سراہا ہے۔ مضامین لکھے۔ عبدالمنان طرزی نے اردو کے سو دیدہ وروں میں مجھے بھی شامل کیا ہے۔ نظام صدیقی اور مناظر عاشق ہرگانوی نے میری کتابوں کے لیے پیش لفظ لکھے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے میری ایک کتاب پر بہت سیر حاصل تبصرہ کیا۔ محمد سالم جیسے نقاد نے میری غزل پر بصیرت افروز مضمون لکھا۔ وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے میری تخلیقات پر اپنی گراں قدر رائے سے نوازا۔ میں یہاں اپنے دوستوں کا نام لے رہا ہوں یہ ایک لمبی قطار ہے، میں نے اس سلسلے میں کبھی اپنا دامن نہیں پھیلایا۔ سجدۂ شکر دل کو طمانیت عطا کرتا ہے۔ اس تعلق سے میں مطمئن ہوں۔

م ع: میرے خیال سے کتابوں کی بھرمار سے ادب کا کبھی بھلا نہیں ہوا ہے۔ ایک دو معیاری کتب یا چند زندہ تحریروں سے بھی ادب میں زندہ رہا جا سکتا ہے۔ پھر کیوں آپ کتابیں چھاپ کر قارئین کا بوجھ بڑھا رہے ہیں۔

نذیر فتح پوری: پھر آپ نے ایک تیر اور چھوڑ دیا۔ لیکن میرا ایک شعر ہے:

کمان کھینچ کے بیٹھا ہوں آج لفظوں کی
وہ جان جائے گا دل کا شریر کتنا ہوں

میں نے جو لکھا ہے پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ میرا لکھا کبھی قارئین پر بوجھ نہیں ہوا جس دن بوجھ سمجھا جانے لگے گا اس دن ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ دوسری بات یہ کہ کتابوں کی اہمیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کتاب اپنے ماحول اور زمانے کا آئینہ ہوتی ہے۔ کتاب شائع کرنا دشمن کے ہاتھ میں تلوار دینے کے مترادف ہے۔ آپ میرے حوصلے اور اعتماد کی داد نہیں دیں گے کہ میں نے دشمنوں کے ہاتھوں میں کتنی تلواریں دے رکھی ہیں۔ ہر موضوع کی کتاب میری زنبیل میں ہے۔ ممکن ہے ان میں کچھ تلواروں کی دھار کند بھی ہو لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چند تحریروں سے ادب میں کون زندہ رہا ہے۔ ذرا ایک دو مثالی نام بتائیے۔ بعض لوگ پطرس بخاری کا نام لیتے ہیں۔ لیکن کیا پطرس کے بعد طنز و مزاح مکمل ہو گیا۔ قطعی نہیں۔ اگر پطرس کے مضامین کو انشائیے قرار دیا جاتا ہے تو آج بھی انشا پردازی کا سلسلہ جاری ہے۔ بہتے دریا کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔ ہوا پر کون گرفت کر سکتا ہے۔ آپ معیار کی کیا کسوٹی قائم کرتے ہیں۔ یہ میزان جن دہلیزوں پر سجدہ ریز ہے انھیں مستند کس نے بنایا ہے۔ وقت سے بڑا مصنف کوئی نہیں۔ سارے فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

م ع: آپ کی تنقیدی بصیرت کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ آپ اس میدان سے بھی سرسری گزر جاتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے۔

نذیر فتح پوری: میں کوئی نقاد نہیں، سیدھا سچا ادیب ہوں۔ میرے لیے آج تک کسی نے نہیں لکھا کہ میں تنقید نگار ہوں اور اس میدان سے سرسری گزر جاتا ہوں۔

م ع: آپ نے ’بیتے کل کا اک اک پل‘ اور ’ایک سفر عمان کا‘ لکھا ہے۔ ان دونوں سلسلوں کو ادبی دنیا میں پسند کیا گیا۔ پھر یہ تاثر دیگر تحریروں میں کیوں قائم نہ رہ سکا۔

نذیر فتح پوری: میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہر کسی کو ہر موضوع کی تحریر پسند نہ آئے اور یہ ضروری بھی نہیں۔ ہر کوئی اپنی پسند اور مزاج کے مطابق تحریریں پڑھتا ہے۔ ایسے میں کسی کو کچھ تحریروں میں متاثر کن انداز نہیں ملتا۔ ممکن ہے ایسا میرے سلسلے میں بھی ہوتا ہوگا۔ اس میں کوئی برائی کی بات نہیں۔ غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ غالب کی ہر غزل ہر ایک کو پسند نہیں آتی۔ اس میں غالب کا قصور ہے نہ غزل کا۔ یہ قاری کا اپنا معیار ہے۔ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ جسے قبول کرنا یا نہ کرنا ضروری نہیں۔

م ع: ’پونہ سے رانچی کا سفر‘ سفر نامہ سفر کی روداد ہو گیا ہے۔ آپ نے سفرنامے کے آداب کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے۔

نذیر فتح پوری: سفرنامہ اگر سفر کی روداد نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ سفرنامے کے آداب مجھے بتا دیے جائیں تو میں اپنے آئندہ آنے والے سفرنامے 'ہم نے بھی آگرہ دیکھا' میں ان آداب کو ملحوظ رکھوں گا۔ لیکن میں بنیادی طور پر اپنے سفرناموں سے مطمئن ہوں۔ میں نے جو طرزِ تحریر اپنایا ہے وہ بہت ہی سوچ سمجھ کر اپنایا ہے۔ میرے خیال میں سفرنامہ نگار کو خود سفرنامے کا مرکزی کردار ہونا چاہیے۔ میں نے سفر کے دوران اگر نماز ادا کی ہے تو اس کا ذکر کیوں نہ کیا جائے کہ میرا یہ عمل میرے سفر کا ایک حصہ ہے۔

م ع: ادب میں عجلت پسندی مناسب نہیں ہے۔ یہاں بہت ٹھہر کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے مگر لگتا ہے آپ کی بعض تحریریں اس کا شکار ہوئی ہیں۔ کیا آپ اس کا اعتراف کرتے ہیں؟

نذیر فتح پوری: قطعی نہیں، آپ ایک آدھ تحریر کا ثبوت دیں تو جواب دوں۔ جہاں تک عجلت پسندی کا تعلق ہے یہ کہیں بھی مناسب نہیں۔ میں اس مفروضے سے انکار کرتا ہوں کہ جو کثرت سے لکھتا ہے وہ عجلت پسند ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں جو ٹھہر کر لکھتا ہے کیا وہ تساہل پسند ہوتا ہے۔ قطعی نہیں، یہ اپنے اپنے قد اور پیمانے کی بات ہے۔ قطرہ اور سمندر میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے میں نے 1984 میں ایک شعر کہا تھا:

میں خود تو اپنی ذات میں قطرہ ہی تھا مگر!
مجھ کو سمندروں سے ملا دے رہے ہیں لوگ

آپ کو بہ خوبی معلوم ہے کہ قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو سمندر بن جاتا ہے۔ قطرے کو سمندر بننے کے لیے اپنا وجود کھونا پڑتا ہے۔ اپنا وجود کھونا ایک بڑی قربانی ہے۔ تیاگ ہے، یہ جسارت طویل تپسیا کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

م ع: ہم زندگی بھر ادب تخلیق کرتے ہیں مگر چند ہی چیزیں شاہ کار کے مرتبے تک جاتی ہیں۔ کیا آپ کی کوئی ایسی تحریر یا تصنیف ہے جسے ادب عالیہ قرار دیا جا سکے۔

نذیر فتح پوری: اس کا جواب ان لوگوں کے پاس ملے گا جو ادب عالیہ کو شناخت کرنے والی نظر رکھتے ہیں۔ ادب عالیہ کا انتخاب کرتے ہیں ہمارا کام پوری وارفتگی اور دل سوزی کے ساتھ تخلیقی عمل سے گزرنا ہے سو ہم گزرتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ 300 سے زائد افسانوں کا انبار لگا کر منشی پریم چند کے جوتے کی نوک تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔ یہ ترسیل کی ناکامی کا عبرت ناک المیہ ہے۔ ایسے لکھاریوں کو آپ عجلت پسند کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میں ایسے لکھاریوں کو شہرت پسند کہوں گا۔ شہرت پسند کون نہیں ہے۔ لیکن سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شہرت پسندی وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ قد کو اونچا کرتی ہے۔ اس سے انسان کے جلال و جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ بات ادب عالیہ سے دوسری طرف چلی گئی۔ میری نظر میں ادب عالیہ کے واضح نقوش نہیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں آج کے دور میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہاں علی سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی جیسے عوامی جذبات کے نمائندہ شاعروں کی عظمتوں سے انحراف کرنے والے موجود ہیں۔ وہاں نذیر فتح پوری کی کسی تخلیق کو ادب عالیہ کا حصہ کون بننے دے گا۔

م ع: صرف چند سوال۔ کہا جاتا ہے کہ آج کا قلم کار ہی آج کا قاری اور نقاد بھی ہے، تو کیا ایسے میں تخلیق ادب کا کام کارزیاں کے مترادف ہوگا۔

نذیر فتح پوری: یہ آدھا سچ ہے، باقی آدھا سچ یہ ہے کہ آج بھی اردو کی کتابیں پڑھنے والے ایسے قارئین موجود ہیں جو نہ شاعر ہیں نہ ادیب۔ اردو ادب کے لیے ان کے دلوں میں محبت ہے ایسے لوگ کتابیں خریدتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ لیکن بہت کم مقدار میں۔ قلم کار کا قاری ہونا خود قلمکار کے لیے سودمند ہے۔ کرشن چندر سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہیں۔ کرشن چندر کا جواب تھا: ''میں چار صفحے مطالعہ کرنے کے بعد ایک صفحہ لکھتا ہوں'' خیال رہے کہ کرشن چندر اپنا لکھا نہیں دوسرے کا لکھا پڑھتے ہیں۔ ہمارے قلمکاروں کے لیے بھی لازم ہے کہ اپنے بزرگ قلمکاروں کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔ اکثر شعرائے کرام ادبی رسالے کا وہی صفحہ پڑھتے ہیں جہاں ان کی غزل شائع ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اس کا علاج بہت ضروری ہے۔ قلم کار کو لازم ہے کہ وہ اپنا ناقد خود ہی بنے۔ میری شاعری میں جانور، عنوان سے میں نے اپنی غزلوں پر ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ یہ ایک دلچسپ تحریر ہے۔ ممکن ہے بڑے ناموں میں بعض کو یہ اچھا نہ لگے۔ لیکن ہمت تو میں نے کر لی ہے۔ بنیاد بھی قائم کر دی ہے۔ اب دیکھیں اس بنیاد پر کون عمارت اٹھاتا ہے۔

م ع: کیا آپ اپنے آج تک کے کام سے مطمئن ہیں؟

نذیر فتح پوری: ہاں بھی اور نہیں بھی۔ ویسے بھی میں مطمئن ہو کر بیٹھنے والوں میں نہیں ہوں۔ حرکت میں برکت ہے۔ قلمکار کو لازم ہے کہ اپنے قلم کو خشک رکھ کر شرمندہ نہ ہونے دے۔ قلم کی عظمت اور وقار اسی میں ہے کہ اسے مسلسل رواں دواں رکھنا چاہیے۔ میں نے اب تک یہی کیا ہے۔ بقول فیض احمد فیض:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اس سلسلے میں اپنے اشعار بھی سنا سکتا ہوں:

ابھی تو ہے تخلیق کی مانگ سونی
ادب غیرت کہکشاں کب ہوا ہے
ابھی انگلیاں تازہ دم ہیں ہماری
قلم سے ابھی خوں رواں کب ہوا ہے

م ع: ادب سے متعلق مستقبل کے آپ کے منصوبے کیا ہیں:

نذیر فتح پوری: میں منصوبے تو بناتا ہوں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ لیکن میرے کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ کہ قدرتی طور پر جو میرے لیے بہتر ہوتا ہے وہ کام پہلے ہو جاتا ہے۔ کچھ کام اور منصوبے ایسے بھی ہیں جو برسوں سے ذہن میں موجود ہیں اور بہت سے فائلوں میں بھی بند ہیں لیکن پورے نہیں ہو پا رہے ہیں۔ اب تک مختلف موضوعات پر میری پینسٹھ 65 کتابیں آ چکی ہیں لیکن تشفی نہیں ہوتی، یوں لگتا ہے کہ قلم اور قرطاس کے اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔

م ع: اردو زبان کا مستقبل ہند و پاک کے تناظر میں کیا ہوگا؟

نذیر فتح پوری: جو بھی ہوگا اچھا ہوگا۔ میں تو مایوس نہیں ہوں۔ مجھے تو اردو کا آسمان آج بھی چاند ستاروں سے منور نظر آتا ہے۔ جب تک اس شیریں زباں کی دنیا کو چاہت اور ضرورت رہے گی اردو زندہ اور پائندہ رہے گی۔

م ع: آپ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں نئی نسل سے کیا کہنا چاہیں گے؟

نذیر فتح پوری: سوال پرانا ہے لیکن جواب پرانا نہیں ہوگا۔ میں چاہوں گا کہ نئی نسل دل کھول کر انگریزی اور دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے بھرپور استفادہ کرے لیکن ایک انگلی اردو کے ہاتھ میں بھی رہے۔ اردو کو بھلانا اپنے آپ کو بھلانے کے برابر ہے اردو وہ بنیاد ہے جس پر آپ کی تہذیب کا محل تعمیر ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس بنیاد کی حفاظت نہ ہوگی تو محل زمین کا حصہ بن جائے گا اور تہذیب مٹ جائے گی اور اگر تہذیب مٹ گئی تو آپ کی شناخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے اپنی شناخت کے لیے اردو کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

م ع: بہت بہت شکریہ نذیر صاحب!

نذیر فتح پوری: شکریہ آپ کا ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بہت اہم سوال نامہ تیار کیا اور ایسے جوابات حاصل کر لیے جو باتیں ہنوز ظہور میں نہیں آئی تھیں۔

■

Moyeenuddin Usmani 264, Shahu Nagar, Jalgaon - 4255001 (MS)
Mob.: 942039082
Nazeer Fatehpuri,230/B/102 Viman Darshan, Sanjay Park, Lohgaon Road, Pune - 411006 (MS), Mob.: 9822516338

ریاستِ کیرلہ میں اردو نصاب کا خاکہ

(اسکولوں کے حوالے سے)

فیصل ماولڈتل

یکم نومبر 1956 کو لسانی بنیادوں کے تحت ہندوستان میں کئی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس سلسلے میں مغربی گھاٹیوں اور بحیرۂ عرب کے درمیان کنیا کماری سے منگلور تک ملیالم بولی جانے والے تینوں خطوں ٹراونکور، کوچین اور ملبار کو ملا کر ایک نئی ریاست کیرلہ کے نام سے تشکیل دی گئی۔ جغرافیائی اعتبار سے تین مختلف النوع علاقوں پر مشتمل یہ ریاست جنوبی ہند کے آخری سرے پر بحیرۂ عرب کے کنارے آباد ہے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے دورِ حکومت میں ٹراونکور اور کوچین کے علاقوں پر مقامی راجا حکومت کرتے تھے تو ملبار کا علاقہ مدراس پریسی ڈینسی کا حصہ تھا۔ لسانی بنیادوں پر تشکیل شدہ یہ ریاست جنوبی ہند کی سب سے چھوٹی مگر اہم ریاست ہے۔ 14 اضلاع پر مشتمل اس ریاست کی آبادی تقریباً چار کروڑ ہے۔ اس ریاست کا 30 فی صد حصہ پہاڑیوں اور تقریباً اتنا ہی حصہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ناریل، کٹھل، چائے، سیاہ مرچ، مصالحے، بجلی کی پیداوار اور سیاحت کے لیے یہاں زبردست امکانات موجود ہیں۔ بے شمار خوبصورت گھاٹیوں، قابلِ دید مقامات کے علاوہ کوولم بیچ، موناّر، تیکّڈی، کاپاڑ، سائی لینٹ والی، (Silentvalley) مالک دینار، شبری ملا جیسے سیاحتی مقامات بھی کیرلہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہاں کی شرح خواندگی بھی 100 فی صد ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کا ایک منفرد کلچر بھی ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی لوگ شامل ہیں۔ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ریاستِ کیرلہ کو جہاں ہر میدان میں ایک علاحدہ حیثیت حاصل ہے، وہاں زبانِ اردو اور اس کی تعلیم کو بھی ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

ریاستِ کیرلہ میں اردو کی آمد کے تعلق سے مختلف فرامین اور مختلف لوگوں کے بیانات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ یہاں زبانِ اردو کی آمد سولہویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ پرتگالیوں نے جب کالی کٹ کے سامودری راجا پر حملہ کیا تھا تو اس نے پرتگالیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہانِ عادل شاہی سے فوجی مدد کی درخواست کی تھی۔ اس درخواست کے پیشِ نظر شاہانِ عادل شاہی نے اپنی فوج کالی کٹ بھیجی۔ جنگ ختم ہونے پر اردو بولنے والے یہ فوجی لوگ یہاں کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر بجائے اپنے وطن لوٹنے کے ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان کے دورِ حکومت میں بھی اردو زبان کو کافی فروغ ملا۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں اردو بولنے والے میمن برادری کے لوگ مختلف ضرورتوں سے کیرلہ آ کر آباد ہو گئے۔ اسی طرح ہندوستان کے شمالی علاقوں اور جنوبی ہند کی دیگر ریاستوں سے بھی مختلف امور کے سلسلے میں جو لوگ یہاں آتے گئے وہ سب اردو ہی بولتے تھے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس طرح ریاست کیرلہ میں زبانِ اردو کئی مراحل طے کرتی ہوئی آج ہم تک پہنچی ہے۔

لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیمِ نو کے بعد یہاں اردو کو زبردست دھکا پہنچا لیکن جلد ہی اس نے پھر سے یہاں اپنا مقام بنا لیا۔ کیرلہ کے حکمران فراخ دل تھے۔ لسانی عصبیت کے شکار نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں اردو والوں کے لیے ایک نرم گوشہ تھا۔ جو آج بھی قائم ہے۔ اس لیے اس ریاست نے جہاں اردو کو ہندوستان کی ایک اہم زبان کی حیثیت سے قبول کیا وہیں اس نے اس زبان کی ہمہ جہت ترقی و ترویج کے لیے عملی اقدام بھی اٹھائے۔ ریاستِ کیرلہ میں اردو کسی علاقے کسی قوم اور کسی طبقے کی مادری زبان نہیں ہے۔ لیکن اہلِ کیرلہ کے لیے یہ اجنبی بھی نہیں ہے۔ یہاں کے عوام میں بلا امتیاز مذہب و ملت جو بھی چاہتا ہے وہ اردو سیکھتا ہے۔ پڑھتا ہے اور بولتا بھی ہے۔ اس طرح یہاں کے تقریباً 40 فی صد غیر مسلم طلبا و اساتذہ اردو زبان پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے بیشتر شعرا و ادبا جہاں اپنی مادری زبان کو ادبی اظہار کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں وہیں اپنی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کے لیے اردو کو ترجیحی طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ مجموعی طور پر پچھلے چالیس پینتالیس سال سے یہاں اردو پڑھنے اور پڑھانے کا

یہاں زبان اردو کی آمد سولہویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ پرتگالیوں نے جب کالی کٹ کے سامودری راجا پر حملہ کیا تھا تو اس نے پرتگالیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہانِ عادل شاہی سے فوجی مدد کی درخواست کی تھی۔ اس درخواست کے پیشِ نظر شاہانِ عادل شاہی نے اپنی فوج کالی کٹ بھیجی۔ جنگ ختم ہونے پر اردو بولنے والے یہ فوجی لوگ یہاں کی خوب صورتی سے متاثر ہوکر بجائے اپنے وطن لوٹنے کے ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان کے دور حکومت میں بھی اردو زبان کو کافی فروغ ملا۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں اردو بولنے والے میمن برادری کے لوگ مختلف ضرورتوں سے کیرلہ آکر آباد ہو گئے۔

رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے اور آج کل اردو پڑھنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ اس طرح یہاں اردو کی تعلیم میں دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، جس کا ثبوت یہاں آئے دن منعقد ہونے والے غزل پروگراموں اور مختلف مقامات پر منعقد ہونے والے اردو جلسوں سے ملتا ہے۔ اسی طرح یہاں انجمن ترقی اردو ہند کی کیرلہ شاخ، کیرلہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، کیرلہ اردو کورس ایسوسی ایشن، کیرلہ اردو پرچار کمیٹی جیسی اردو تنظیمیں نہ صرف اردو کی اشاعت و ترقی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں بلکہ ہر موقع پر اردو کانفرنسیں، اردو سیمینار اور اردو سے متعلق دیگر جلسے منعقد کر کے اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے قومی رہنماؤں، مرکزی و ریاستی وزرا اور دیگر متعلقہ ذمہ داروں کو مدعو کر کے ان کے سامنے اپنے مطالبات بھی پیش کرتی رہی ہیں۔

ریاست کیرلہ نے لگ بھگ ہر میدان میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ مگر بعض میدانوں میں اس کو اس حد تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس حد تک اس کو ہونے کی ضرورت تھی۔ شعبۂ تعلیم بھی ان میں سے ایک ہے۔ خاص طور پر اردو تعلیم۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس کی تعلیم سے کیا جاتا ہے۔

موجودہ اکیسویں صدی تعلیمی و تکنیکی مہارتوں اور معلومات کی صدی ہے۔ اس میں سماجی مسائل مختلف شکلوں میں رونما ہو رہے ہیں۔ ملک و قوم کو درپیش سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔

تعلیم کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہر ریاست میں SCERT کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس کے بجٹ پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا انتظام کرنا ریاستوں کی بھی ذمے داری ہے۔ لہٰذا ریاستِ کیرلہ میں بھی 1994 کو SCERT کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ریاستی سطح پر اسکولی نظام تعلیم کی اصلاح اور بہتری نیز اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں جو ادارے بنیادی رول ادا کر رہے ہیں، ان میں SCERT (ریاستی مجلس تعلیمی و تحقیق و تربیت) کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے تحت اسکولی نظام تعلیم کی اصلاح و ترقی اور بہتری کے لیے جو بنیادی کام انجام دیے جاتے ہیں ان میں ریاستی درسیات کا خاکہ State Curriculum Framework تیار کرنا اور وقتاً فوقتاً اس پر نظرِ ثانی کرنا مختلف مضامین کی از سرِ نو ترتیب دینا اساتذہ کی تربیت نیز تعلیمی امور پر تحقیق اور تجزیہ شامل۔

ریاست کیرلہ میں SCERT کے قیام کے بعد کچھ عرصہ قبل تک بھی یہاں کی تعلیم کا طریقۂ کار روایتی سا رہا ہے۔ خصوصاً اردو کی تعلیم کا مروجہ ڈھانچہ ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں رہا۔ یہ بے لچک، جامد اور غیر منظم رہا ہے۔ نیز ہماری سماجی ضرورتوں کے تئیں بے حس بھی۔ اس لیے موجودہ تقاضوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے اس شعبے میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔

دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے زیر اثر علم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان ساری تبدیلیوں کو نصاب میں جگہ دینا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ نصاب عصری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہو جائے گا۔ سماج کو نت نئے مسائل سے جوجھنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا پرتو بھی نصاب میں ضرور نظر آتا ہے۔ تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ لہٰذا ہر پانچ سال بعد ریاستی درسیات کے خاکے پر نظر ثانی اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے مزید مفید بنایا جا سکے۔ ان ساری باتوں کے پیش نظر کیرلہ میں تعلیم کو مزید فعال بنانے اور اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ریاستی سطح پر چند سال پہلے ریاست کیرلہ کی SCERT نے اردو زبان کے نصاب پر نظر ثانی کے لیے ناچیز کی سربراہی میں ماہرین تعلیم کی ایک ہائی لیول کمیٹی کو تشکیل دی۔

میری قیادت میں تشکیل شدہ اس کمیٹی نے پہلی جماعت سے لے کر بارھویں جماعت تک کی درسی کتابوں کی تیاری کے لیے مختلف ورک شاپ منعقد کیے۔ ان میں شریک اسکول اساتذہ نیز ماہرین تعلیم کے باہمی مشوروں سے اردو کے نصاب کو آخری شکل دی گئی۔ تیار شدہ نصاب کے خاکے کی روشنی میں چار مراحل میں یعنی پہلی سے بارھویں جماعت تک کی درسی کتابیں تیار کر کے شائع کی گئیں۔ پہلے مرحلے میں پانچویں، ساتویں اور گیارھویں جماعتوں کے لیے دوسرے مرحلے میں چھٹی، آٹھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے۔ تیسرے مرحلے میں نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے اور چوتھے اور آخری مرحلے میں پہلی دوسری تیسری اور چوتھی جماعتوں کے لیے نصابی کتابیں تیار کی گئیں۔ اس سلسلے میں غور طلب اور کیرلہ کی اردو تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھی جانے والی خاص بات یہ ہے کہ کیرلہ کے دیگر محبانِ اردو کے تعاون اور ناچیز کی کوششوں سے پہلی بار پہلی جماعت سے لے کر چوتھی جماعت تک کی درسی کتابیں تیار کرنے کے لیے سرکار سے منظوری ملی ہے۔ اب تک یہاں صرف پانچویں جماعت سے ہی اردو کی درسی کتابیں تیار کی جا رہی تھیں۔ برسوں سے پانچویں جماعت سے ہی اردو پڑھائی جا رہی تھی۔ امید ہے آئندہ کیرلہ کے سارے اسکولوں میں پہلی جماعت سے اردو پڑھائی جانے کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

اس طرح مختلف اوقات میں منعقد کیے گئے ورک شاپوں میں شرکا نے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر نہایت غور وخوض اور باہمی صلاح و مشورے کے بعد پہلی سے بارھویں جماعت تک کی جو درسی کتابیں 'کیرلہ اردو ریڈر' کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اب کمرۂ جماعت میں بہتر انداز میں بچوں کو اردو پڑھائی جا سکے گی۔ ان میں اردو کا ذوق و شوق پیدا کیا جا سکے گا۔ انھیں کلاسیکی شعرا و ادبا سے روشناس کیا جا سکے گا۔ خواہ ان کا تذکرہ درسی کتابوں میں کیا گیا ہو یا نہ ہو، اساتذہ کی رہنما کتابوں کے ذریعے اردو کی ادبی کتابوں کی معلومات ان تک پہنچائی جا سکے گی۔ اسی لیے ماہرین تعلیم کو CoreSRG,SRG, DRG کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے اور تمام اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ MANUU, Hamdard university Delhi, NCERT, UTRC Lucknow وغیرہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین تعلیم سے بھی اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے لیے کیرلہ کے اندر بھی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اور اساتذہ کو باہر بھیجنے کی سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔

بے حد مسرت و خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی، ثانوی اور ہائیر سیکنڈری اسکولوں کی تعلیم کے لیے عمدہ طریقے سے جدید انداز میں جو نیا نصاب مرتب ہو کر شائع کیا گیا ہے، اس کے مطالعے سے یقیناً بچوں میں اردو کے تعلق سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ خاص کر واقعات کی تصاویر ادبا و شعرا کے خاکے دلکشی کا باعث ہوں گے۔ درسی کتابوں کے ذریعے بچے اور نوجوان ایک زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادب کا مطالعہ بھی کر سکیں گے۔ اور زبان و ادب کے متعلق ان کا ایک ذہن بنے گا۔ اسی لیے لفظوں جملوں اور لکھاوٹ میں قواعد، محاورات اور املے کی صحت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور دوسرے ادبا و شعرا اور ان کی تحریروں کے انتخاب و ترتیب میں تناظر، تناسب اور توازن کو مکمل طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ درسیات میں صرف مسلم الثبوت اساتذۂ ادب کی بہترین تحریروں کی جنھیں کلاسیکی کہا جاتا ہے، شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی گروہ بندی شخصی تعصب نہیں ہے۔ طالب علمی کے دور میں بچہ جو کچھ بھی پڑھتا ہے اسے بہت

اعتماد کے ساتھ اور بے چون وچرا اپنے دماغ میں اتار لیتا ہے۔ اگر اس میں کوئی کوتاہی یا کوئی کمی رہ جائے تو اسے درست کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ابتدائی وثانوی تعلیم کے نصابِ تعلیم کی ترتیب کو ہر قسم کی غلطی سے پاک وصاف اور ہر شبہ سے بالاتر رکھا گیا ہے۔

ان کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں بڑی دیدہ زیب تیار ہوئی ہیں۔ ان کے اسباق ماہرین تعلیم کے تجربوں اور مشوروں کی روشنی میں جدید ترین تدریسی اصولوں کو نظر میں رکھ کر تیار کیے گئے ہیں، جن سے بچّوں کی دلچسپی بھی باقی رہے گی اور ان کی ذہانت میں اضافہ بھی ہوگا۔ ان کے تجسّس اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی ابھرنے کا موقع ملے گا۔ صاف چھپائی اور رنگین تصویروں سے مزین ان کتابوں کو پاس رکھنے سے بچّوں کو خوشی بھی محسوس ہوگی۔

ان کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جدید نظریۂ تدریس کے مطابق نصاب کا حصہ گھٹا کر مشق کے حصے کو بڑھایا گیا ہے۔ اسے کلاس ورک کا ایک حصہ بنایا گیا ہے، تاکہ بچّے کلاس میں پڑھے ہوئے سبق کو کلاس ہی میں مشق کی مدد سے اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے تحت مشق کو بھی روایتی انداز سے ہٹا کر اس میں تنوع پیدا کیا گیا ہے کیونکہ غیر اردو طلبا کا نصاب اردو طلبا کے نصاب سے مختلف ہونا فطری طور پر لازم ہے۔ دیگر زبانوں کی تعلیم کی نفسیات مادری زبان کی تعلیم کی نفسیات سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اس کا انتظام جدید تعلیمی نفسیات اور جدید ترین سمعی و بصری آلات کے ذریعے کیا ہے۔ طالبِ علم کی زبان اور سیکھی جانے والی زبان کے درمیان صرفی نحوی اور صوتی مطالعہ تقابلی انداز پر کتاب کے مولف اور مدرّس کے ذہن میں رہنا ضروری ہے تاکہ ضرورت کے وقت وہ مادری و دیگر زبان کے اختلاف اور اتحاد وتشابہ کی تشریح بھی کر سکے۔ اردو زبان سکھانے کی درسی کتاب اور اس کے مدرّس کو اردو تہذیب وتمدن اور معاشرے کی معلومات کا بھی ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر زبان کی مزاج شناسی مشکل ہوگی۔ تعلیمی مواد پیش کرتے وقت اصطلاحات مفردات وتعبیرات اور لغوی تراکیب کے ساتھ ساتھ صحت نطق اور صوتیاتی نظام پر توجہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مخارج حروف کی صحت کا کام مستقل طور پر ہماری بے توجہی کا شکار ہے۔ بحیثیت معلّم روزِ اوّل ہی سے اس پر توجہ مرکوز رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے باہر کے ماہرین تعلیم کو یہاں بلا کر اردو کا ماحول پیدا کر کے تربیت دی جا رہی ہے۔

تیار شدہ درسی کتابوں کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر جماعت کی درسی کتاب یونٹوں میں اور ہر یونٹ کو مختلف موڈیولوں میں تقسیم کر کے الگ الگ اور نئے نئے عنوانات سے منسوب کیا گیا ہے۔ ہر یونٹ کو عالم انسانیت، کھیل کود، تہذیب، صحت، کھیتی باڑی، ماحولیات، محنت مزدوری کی اہمیت جیسے ISSUES میں تقسیم کر کے پریم چند، کرشن چندر جیسے مشہور افسانہ نگاروں کی انسان دوستی، مذہبی رواداری، پیار ومحبت، ہمدردی، صبر وتحمّل، عزت واحترام، حلم وبردباری، سلیقہ مندی، دوسروں کے دکھ درد سمجھنے کی صلاحیت وغیرہ اقدار سے بھرپور افسانے اور کہانیاں شامل کیے گئے ہیں۔

اسی طرح ہندوستان میں مختلف ذات پات، مذاہب، نسلوں اور طبقوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر ایک کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور زبان جداگانہ ہے۔ ان سب کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ملک میں انتشار کی کیفیت پیدا نہ ہو کر کثرت میں وحدت پیدا ہو سکے اور قومی یکجہتی قائم کرنے کا اہم مقصد پورا ہو سکے۔ لہٰذا اس بات کا ان کتابوں میں پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے۔

ہر ملک کی اپنی ایک الگ تاریخی تہذیبی شناخت ہوتی ہے اور اسے قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی تاریخ، تہذیب اور لسانی شناخت از بس ضروری ہے۔ ان کتابوں میں ایسی باتوں کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تعلیم، امن وسلامتی کی امین تہذیب وثقافت کی ضامن اور معراج انسانیت کی نقیب ہے۔ اتحاد واتفاق کو مقدم سمجھنا اور اس کے استحکام کی پوری کوشش کرنا، غرور اور غصّے کو دل سے دور رکھنا، وقت کی پابندی کرنا، صحیح اردو بولنا، طلبا میں اس کی اہمیت پیدا کرنا، یہ ساری باتیں ان کتابوں میں شامل ہیں۔ اسی طرح فطرت اور قدرتی وسائل کا تحفظ اور ماحول کی صفائی بہت ضروری ہے۔ اس لیے اس سے متعلق بنیادی باتیں ابتدائی جماعتوں سے ہی درسی کتابوں میں شامل کی گئی ہیں۔

صحت اور کھیل کود کی تعلیم سے کون انکار کر سکتا ہے؟ صحت اور کھیل کود کی تعلیم کے امکانات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف مضامین میں ان کی ترسیل کی گئی ہے۔

مختلف پیشہ ور سماج کے لیے خوب محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی سماج میں ان لوگوں کو کم عزت دی جاتی ہے۔ ہاتھ سے کام کرنے والے لوہار، سنار، کمہار، فنکار اور دوسرے دستکاروں کی خدمات سماج کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ ان کی اہمیت اور ان کی عزت کرنے کی ضرورت سمجھانے کے لیے جہاں جہاں گنجائش ہے وہاں اس بات کی طرف بھی ان کتابوں میں اشارہ ملتا ہے۔

اسی طرح زراعت پر مبنی نظمیں، محنت مزدوری کی اہمیت جتانے والی نظمیں اور کھیل کود کی افادیت واہمیت پر مبنی مضامین ہماری پرانی تہذیب پر مشتمل سفر نامے، سوانح عمریاں، آپ بیتیاں، غزلیں، ڈرامے، رباعیاں، شخصی مرثیے اور جدید تہذیب کے مسائل سے دو چار انشائیے، خاکے، طنزیہ ومزاحیہ اسباق وغیرہ ان کتابوں میں موجود ہیں۔ غرض درسی کتابوں میں ادب کی ہر صنف کے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ماہرین تعلیم کی ہائی لیول کمیٹی کے بنائے گئے منصوبہ بند تعلیمی نصاب کے مطابق پہلی جماعت سے لے کر بارھویں جماعت تک کی درسی کتابوں میں آسان اور سلیس طریقے سے دلچسپ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تاریخ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

ریاست کیرلہ میں چند گنے چنے اہل قلم وفن کار موجود ہیں۔ ان کے کلام کو بھی درسی کتابوں میں حسب ضرورت واہمیت کے مطابق جگہ دی گئی ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ہم اب جس دور میں داخل ہوئے ہیں وہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، جس نے نہ صرف دیہاتوں کو شہروں سے قریب کر دیا ہے، بلکہ مشرق ومغرب میں علمی وفکری مماثلت اور ہم آہنگی بھی پیدا کر دی ہے۔ اس کے پیش نظر نئے نئے سائنسی علوم کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔

محض معلومات کی فراہمی سے ہی تدریسی عمل کی تکمیل نہیں ہو پاتی بلکہ تدریسی سرگرمیوں کے ذریعے بچّوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں بزرگوں اور سماج کے دیگر افراد کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، اپنے اردگرد ہونے والے واقعات یا حادثات کا کس طرح تجزیہ کریں، اور اپنے تجزیے کے نتائج کس طرح اخذ کیے جائیں، اپنے جذبات، خیالات اور فطری صلاحیتوں کا اظہار کس طرح کریں۔ یہ ساری باتیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔

غرض میں اپنے مضمون کا خاتمہ بڑے فخر کے ساتھ ان الفاظ میں کروں گا کہ ہندوستان کی دوسری تمام ریاستوں کی بہ نسبت کیرلہ میں اردو تعلیم کا موقف نہایت اطمینان بخش ہے اور اس میں مزید بہتری کے آثار نمایاں ہیں۔

■

Dr. Faisal Mavulladathil (Research officer, Urdu) SCERT) Vidyabhavan, Poojappura, Thiruvananthapuram - 695012 (Kerala)
Mob.09446254923
E-mail.:scertkerala@gmail.com

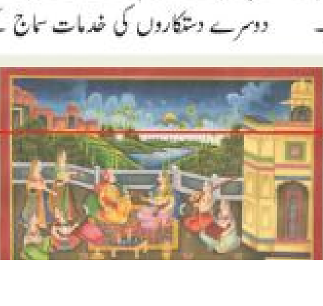

ادبی مباحث

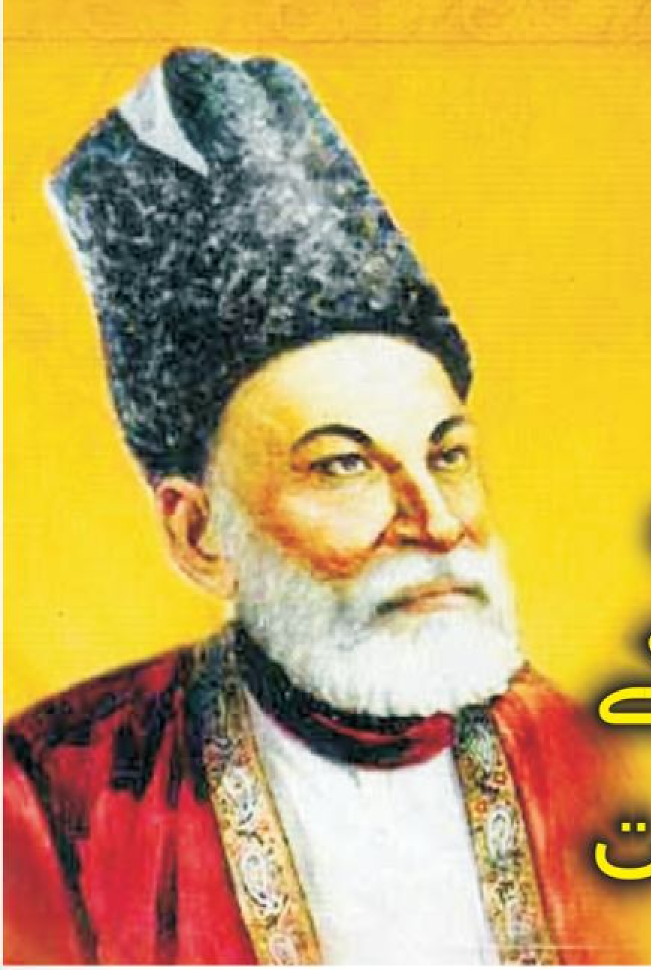

غالب کے کلام میں حقوق انسانی کے واضح اشارات

خواجہ عبدالمنتقم

ہر معیاری شاعر اپنے مشاہدات اور تجربات کو سمیٹ کر اپنے خیالات وتصورات کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ اظہار کبھی صریحی ہوتا ہے تو کبھی معنوی، کبھی بالواسطہ ہوتا ہے تو کبھی بلا واسطہ۔ کبھی بات تو وہ اپنے معشوق سے کرتا ہے مگر اشارہ معاشرے یا معاشرتی امور کی جانب ہوتا ہے اور اس اشارے کا تجزیہ شعری تخلیقی قوت (Poetic genius) اور سیاق وسباق کے مطابق کرنا پڑتا ہے نہ کہ قدر عرفی (Face value) کی بنیاد پر۔ اس ادبی مفروضے کا اطلاق مندرجہ بالا عنوان کے حوالے سے فارسی کے ملک الشعرا مرزا نوشہ اور اردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب پر بھی ہوتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس میدان میں علامہ اقبال کو حیثیت سر بفلک حاصل ہے مگر مرزا کے درج ذیل شعر کا مصرعہ ثانی ان کے انسانی حقوق کے عظیم علمبردار ہونے کا ایک معتبر دستاویزی ثبوت ہے جبکہ اس وقت جب اس قسم کے خیالات کو نظمیہ جامہ پہنایا گیا تھا انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ جیسی کلیدی دستاویزات بھی وجود میں نہیں آئی تھیں مگر انسانی حقوق بشکل حقوق انسانی یا حقوق العباد کی شکل میں ہمیشہ موجود رہے ہیں:

انسانیت :

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بادی النظر میں اس شعر کا مصرعہ ثانی ایک معمولی سی بات پر مشتمل ہے لیکن انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے یہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے چونکہ انسانی حقوق اور انسانیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی موجودہ صورت حال میں جب دہشت پسندی، دہشت گردی، انسان دشمنی، نا انصافی، جبر وتشدد اور استحصال جیسی برائیاں معاشرہ میں گھر کر چکی ہیں اس مصرعہ میں نہاں تصور کو محض شاعرانہ استدلال نہیں کہا جا سکتا۔ یہ یقینی طور پر منطقی استدلال ہے۔ یہ نظریہ مبنی بر حقیقت ہے۔ غالب کا یہ تصور کافی حد تک ماضی اور حال دونوں ہی ادوار کے حالات کی منظر کشی ہے اور اگر آج کی زبان میں کہا جائے تو یہ انسانی حقوق اور ان کی خلاف ورزی کی جانب راست اشارہ ہے۔

قربت کفر و ایماں اور عبادت گاہوں ومذہبی مقامات کا احترام

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ اب خانہ کعبہ میں بت نہیں ہیں مگر پہلے تو تھے اس لیے ان بتوں کو کعبے سے دور کی نسبت تو ضرور ہے۔ دراصل ان کا عبادت گاہوں کی جانب اشارہ ہے۔ ان کی اس سوچ کا مظہر ہے کہ تمام مذاہب دعوتِ قربت دیتے ہیں اور ان کے بیچ اگر کوئی خلیج ہے تو اسے پاٹا جانا چاہیے۔

زُنار باندھ سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ زُنار اور تسبیح میں ایک ہی ڈورا ہے یعنی دونوں میں مشابہت ہے اور ان دونوں کے ذریعہ ہی منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے یعنی دونوں کے ذریعہ ہی پروردگار کی اپنے اپنے حساب سے خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تسبیح کے دانوں کے اتار چڑھاؤ سے زندگی کے نشیب وفراز کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ مرزا صاحب نے یہ بات 100 سال سے زیادہ ہوئے جب کہی تھی اور ہماری سپریم کورٹ نے یہ بات 1996 میں مابعد محولہ والسما پال والے معاملے میں کہی۔

"...Pluralism is the keynote of Indian culture and religious tolerance is

the bedrock of Indian secularism. It is based on the belief that all religions are equally good and efficatious pathways to perform for God realisation."

(1996 (3) S.C.C. 545)

کعبہ میں جارہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

اس شعر سے غالب کی ملک کے تئیں محبت اور کسی بھی مذہب سے عدم نفرت اوران کی رواداری کا اشارہ ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ ہندوستان سے ہجرت کرکے کعبہ میں جارہے ہیں تو اس پر طعنہ کشی نہ کریں کیونکہ وہ اپنے ملک جس کے لیے انہوں نے لفظ بتکدہ استعمال کیا ہے اس کی صحبتوں یعنی اس کی ہر چیز کو وہ بھولنے والے نہیں۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شاعر موصوف نے وفاداری کے حوالے سے کعبہ اور بت خانہ کی قربت کا متذکرہ بالا شعر کی طرف پھر اشارہ دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانہ میں کاٹ کراور وہیں اپنا آخری سانس لے کراس دنیا سے رخصت ہوجائے تو وہ اس بات کا حقدار ہے کہ اسے کعبہ میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے اپنی وفاداری مکمل طور پر ثابت کردی ہے۔ شاعر کے دماغ میں ہر وقت کعبہ اور بت خانہ جیسے الفاظ کا رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان دونوں مقامات کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ویسے بھی ہم سب کا یہ فرض ہے کہ ہم سب کی عبادت گاہوں اور مذہبی مقامات کا پورا پورا احترام کریں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ مذہبی آزادی اوررواداری کے بنیادی انسانی حقوق کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔

گفتگومیں شائستگی

ہر شخص کا یہ اخلاقی وقانونی فریضہ ہے کہ وہ دوسرے شخص کے ساتھ گفتگو کے دوران شائستگی سے کام لے اور کوئی بھی ایسی بات نہ کہے کہ جو اسے ناگوار گزرے۔ بداخلاقی اور بدزبانی سے بچا جائے، خوش کلامی سے کام لیا جائے اوراعتدال سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اگر اعتدال سے تجاوز کیا جاتا ہے تو یہ یقینی طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی کیونکہ ایسا کرنے سے فریق ثانی کے جذبات مجروح ہوں گے اور انسانی حقوق کی پابندی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کسی کے جذبات کو مجروح کرسکیں یا کسی کو زک پہنچا سکیں۔ مرزا غالب کا درج ذیل شعر بھی اسی تصور پرمبنی ہے:

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب فرماتے ہیں کہ شوخ زبانی اور حاضر جوابی پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا اور نہ ہی شوخ زبانی اور حاضر زبانی کوئی بری بات ہے لیکن اگر حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے تو اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ فریق ثانی یا متاثرین اس شوخ زبانی کی شکایت کریں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے:

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہوجایئے
بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہوجایئے

ان کا کہنا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حالت اضطرابی وناگواری میں بھی ہمیں ضبط سے کام لینا چاہیے۔ بقول ان کے شرار پتھر سے نکلتا ہے اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ افسردگی دل یعنی مایوسی یا ناگواری کی حالت میں بھی بے تاب و بے صبر ہوجانا حرام ہے:

کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام
ورنہ دنداں دردل افشردن بنائے خندہ ہے

صرف یہی نہیں بلکہ مرزا صاحب انداز گفتگو جیسے موضوع کو اپنے شعر کا موضوع بناتے ہوئے بڑی بے باکی کے ساتھ فرماتے ہیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اگرچہ یہ شعر محتاج وضاحت نہیں پھر بھی یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ شاعر موصوف ہمیشہ شائستگی کی وکالت کرتے رہے ہیں اور کسی کو بھی حقیر وذلیل سمجھنے کے قائل نہیں ہیں اور یہاں تک کہ اپنی تلخ نوائی کے لیے بھی معافی کے خواستگار ہیں:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس ضمن میں ان کے ایک شعر کے مصرعۂ اول کا حوالہ بھی بے محل نہ ہوگا:

نہ سنو گر برا کہے کوئی

ان کی قوت برداشت اور ظالم کے تئیں رویے کے بارے میں اس سے بڑی مثال کیا ہوگی:

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بے داغ کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی تیر ستم خطا ہوتا ہے تو وہ دوڑ کر اس تیر کو اٹھا لاتے ہیں اور ناوک فگن کی نذر کردیتے ہیں تاکہ وہ اس تیر کو دوبارہ چھوڑیں اور وہ ہدف تیر ستم کیے بغیر نہ رہیں۔

ظلم وستم انسانی حقوق کا دشمن

مرزا نوشہ ستم ہائے زمانہ سے تنگ آکر فرماتے ہیں:

نوید امن ہے بے داد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

یہاں ان کا کہنا ہے کہ ظلم وستم ان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا چونکہ ظلم وستم کے جتنے بھی طریقے ہوسکتے تھے ان سب کا استعمال کرلیا گیا اور اس طرح مظالم کی فہرست میں کوئی مد باقی نہ رہی۔ وہ طنزیہ انداز میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اب آسمان کوئی نئی طرز ستم ایجاد نہیں کرسکتا اور وہ اب آسمان کے ظلم سے عمر بھر کے لیے محفوظ ہوگئے۔ اسی بات کو انہوں نے اپنے اس شعر میں بھی دوہرایا تھا:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

اثبات جرم سے قبل ہی تہمت بے جا

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

اثبات جرم سے قبل ہی تہمت بے جا لگانا اور ملزم کو مجرم قرار دینا عام سی بات ہوگئی ہے جبکہ یہ انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ یہ سلسلہ دور غالب میں بھی جاری تھا۔ وہ فرماتے ہیں وہ کون سا دن تھا جب دشمنوں نے ان پر تہمتیں نہیں لگائیں اور جھوٹی باتوں میں آکر ان پر آرے نہیں چلائے یعنی ان پر ظلم وستم نہیں کیے۔

قوت گویائی سے محرومی یعنی اظہار خیال کی آزادی سے محرومی

ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ

اظہار خیال کی آزادی کا شمار انسانی حقوق کے زمرۂ اول میں ہوتا ہے۔ذرا سوچیے کہ اگر کسی کے لب سی دئے جائیں اور وہ بھی کسی جمہوری ملک میں تو اس پر کیا گزرے گی؟ آیئے غالب کا درد بانٹنے کی جرأت کرتے ہیں:

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض ایک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

مطلب یہ کہ ازالۂ شکایات کے لیے بولنا تو ضروری ہے مگر لحاظ رازداری نے مرزا نوشہ کے لب سی دئے ہیں۔ ویسے اب خاموشی کو بھی انسانی حقوق کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا ہے۔اگر آپ کسی معاملے میں خاموش رہنا چاہیں تو آپ کو حق خاموشی بھی حاصل ہے یعنی Right to silence۔اسی بات کو انھوں نے اپنے درج ذیل اشعار میں بھی دوہرایا ہے:

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

مرزا صاحب کا فرمانا ہے کہ خاموشی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور اس خاموشی میں بہت سی آرزوئیں چھپی ہوتی ہیں۔انھوں نے گور غریباں یعنی قبرستان کے چراغ کی لو کو آدمی کی زبان سے تشبیہ دی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ قبرستان کا چراغ بے زبان آدمی کی طرح ہوتا ہے۔اسی طرح کے خیال کو اپنے ایک اور شعر میں ظاہر کیا ہے:

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

ان کا کہنا ہے کہ وہ نالہ جو بے اثری اور نارسائی کی وجہ سے لب تک نہیں پہنچتا وہ سینہ کا داغ بن کر رہ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ قطرہ جس میں دریا بننے کی قوت نہیں ہوتی وہ خاک میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

حق سے نامحرومی کا احساس

اگر کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے یا اس شخص کو جسے مضرت پہنچی ہو یا جس کی حق تلفی ہوئی ہو اسے انصاف کے حق سے محروم رکھا جائے تو یہ یقیناً ناانصافی ہوگی اور کبھی کبھی تو ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر انسان کو اپنا حق نہ ملے تو وہ کبھی کبھی خودکشی پر بھی آمادہ ہوجاتا ہے یا اس میں اس طرح کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے حالانکہ ایسا کرنے کا نہ کوئی قانونی جواز ہوتا ہے اور نہ اخلاقی۔ غالب کے اس شعر میں بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے:

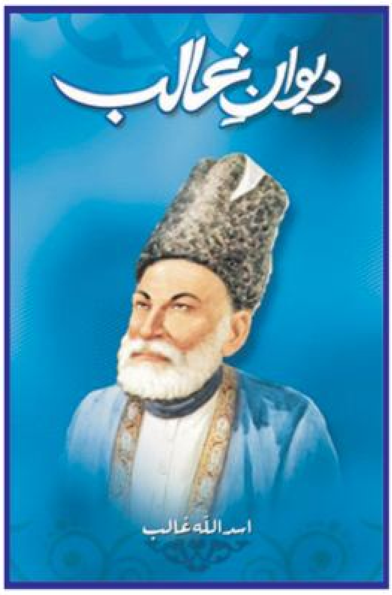

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

غالب کے درج ذیل شعر کے مصرعۂ اول میں بھی اسی طرح کا اشارہ ہے:

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غم ہستی

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر شخص اپنی زندگی میں مختلف النوع نشیب وفراز سے دوچار ہوتا ہے یعنی کبھی خوشی کبھی غم ۔درج ذیل شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی کو جب تک موت نہیں آتی تب تک اسے غم سے نجات نہیں ملتی۔ان کا کہنا ہے کہ جس طرح زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہے اسی طرح شمع بھی بجھنے تک اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔کبھی روشنی دیتی ہے، کبھی ٹمٹماتی ہے تو کبھی بجھ جاتی ہے:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آزادی کی اہمیت

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

ہر جمہوری نظام میں آزادی کی بڑی اہمیت ہے اور جن لوگوں کو آزادی میسر نہیں ہے وہ اس کے لیے ترستے ہیں۔ قید سے آزادی یقینی طور پر انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں آزادی کے مفہوم کو آزادیٔ نسیم کا حوالہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور نسیم کو بوئے گل کہا ہے۔انہوں نے بوئے گل کو اس لیے آزادی کی مبارکباد دی ہے کہ پھول کھلنے پر بوئے گل قید سے آزاد ہوجاتی ہے۔

شناخت وقدر شناسی

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

ہر شخص کا یہ قانونی حق ہے اور اسے بنیادی انسانی حقوق کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کی اپنی شناخت ہو اور اس میں جو خوبیاں ہیں ان کی قدر کی جائے مگر کبھی کبھی جب انسان کو اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اپنے ملک میں پہچان نہیں مل پاتی اور اگر اس کے ساتھ دوسرے ملک میں کوئی زیادتی بھی ہوتی ہے تو وہ بھی اس کے لیے قابل برداشت ہوتی ہے۔ غالب کا مندرجہ بالا شعر بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے وطن میں آخری سانس لے مگر جب اسے اپنے ملک میں کماحقہ اہمیت نہ ملے اور اسے کسی غیر ملک میں، جسے مرزا نے دیار غیر کا نام دیا ہے اور وہاں اسے بے گور وکفن رہنا پڑے تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں چونکہ وہاں کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے اور یہ کہ اس کا رتبہ کیا ہے لیکن اگر اپنے وطن میں اس طرح کی صورت حال ہو یعنی اس جگہ جہاں ہر شخص واقف حال تو ہو مگر غمخوار نہ ہو تو یہ یقینی طور پر رسوائی اور ذلت کا سبب بنے گی۔اسی لیے مرزا کا کہنا ہے کہ خدا نے مجھے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی لاج رکھ لی۔

دقیانوسی خیالات

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

جب کوئی بزرگ آج کے نوجوانوں کو پسند کسی سرگرمی کی تنقید کرتا ہے یا انہیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو اکثر یہ نوجوان یا بلکہ زمانہ کے ساتھ چلنے والے بزرگ بھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو پرانے زمانے کے لوگ ہیں اور ان کے خیالات دقیانوسی ہیں۔ یہاں مرزا صاحب فرماتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان کے اس قول سے بہت سے لوگ اتفاق بھی نہ کریں کہ وہ لوگ جو شراب اور گانے کو غم غلط کرنے والا سامان سمجھتے ہیں وہ ابھی ماضی میں جی رہے ہیں اور انہوں نے دوسرے مصرعہ میں اپنی اس بات کو یہ کہہ کر خود ہی کاٹ دیا کہ مے ونغمہ اندوہِ افزا ہے نہ کہ اندوہ ربا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی سامانِ نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یاد یار تازہ ہوجاتی ہے اور غم غلط ہونے کے بجائے انسان ماضی کے جھروکوں میں چلا جاتا ہے۔اس طرح انہوں نے غالباً شراب اور گانے کی

وکالت کرنے کے سبب کسی ردعمل سے بچنے کے لیے بات کو اس طرح گھما دیا ہے ورنہ ان کی روشن خیالی یا خیالات مخصوص سے کون واقف نہیں۔

درجۂ کمال تک رسائی

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

زندگی کے کسی بھی شعبہ میں درجۂ کمال تک پہنچنا ہر شخص کا بنیادی حق ہے مگر درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ صرف بنیادی حق ہی نہیں بلکہ اس کا شمار اہم ترین انسانی حقوق میں ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اس شعر میں اپنی اس فکر کا اظہار کیا ہے کہ انسان کو کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ قطرہ یوں ہی گوہر نہیں بن جاتا۔

منافقت عدو

آج کے اس دور میں ہمیں اکثر انسان کے دو چہرے ہونے کی شکایت ملتی ہے اور کبھی کبھی تو مختلف ممالک اور قومیں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک طرف امن کی بات کرتی ہیں تو دوسری جانب جنگ کی تیاری۔ مرزا غالب نے بھی درج ذیل شعر میں دشمن کے منافقانہ برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے، مختلف پس منظر میں ہی سہی اور انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کبھی کبھی دوست کے نام نہاد اظہار التفات میں بھی جذبۂ دشمنی نہاں ہوتا ہے۔

غیر کیوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

بد امنی

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

اس شعر میں معاشرے میں بدامنی کا اشارہ ملتا ہے ورنہ غالب کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ چمن کی سیر کو آنے والا ہر شخص قمری کی طرح گرفتار چمن ہو جائے گا جب کہ بہار کے موسم میں جوش جنوں ہوا کرتا ہے نہ کہ فضاء جنوں خیز۔

چھوت چھات

غالب نے انیسویں صدی میں اپنے درج ذیل شعر میں چھوت چھات کی لعنت کی طرف اشارہ کیا تھا اور چھوت چھات کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ اسے 1950 میں ہندوستان کے آئین میں ختم نہیں کر دیا گیا:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یہاں غالب کا خیال ہے کہ جس پیالے میں انہیں شراب

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔

دی جائے گی وہ ان کے اس میں شراب پینے سے نجس ہو جائے گا۔ دریں صورت وہ ساقی سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں آپ شراب اوک سے ہی پلا دیجیے۔ اگرچہ یہ شعر محض رندانہ روش کا اظہار ہے لیکن اس میں چھوت چھات کا تصور صاف ظاہر ہے۔

غربت و بے سروسامانی

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر موصوف کو مہمان نوازی کا شوق تو ہے مگر ساتھ ہی اپنی بے سروسامانی کا احساس بھی ہے۔ بالفاظ دیگر غربت تب بھی تھی اور آج بھی ہے اور انسانی حقوق کے علمبردار خاتمۂ غربت کے لیے آج بھی ہر طرح کوشاں ہیں۔

خامہ فرسائی یعنی اظہار خیال بذریعہ تحریر

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

اس شعر میں اگرچہ شاعر نے اپنے محبوب کو لکھے ہوئے خطوط کی بات کہی ہے مگر یہاں انہوں نے انسان کے اپنے جذبات و خیالات کو تحریری طور پر اظہار کو، اظہار خیال کا ذریعہ بھی مانا ہے اور آج بھی اس ذریعہ کو اظہار خیال کا ایک معتبر ذریعہ مانا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ذوق خامہ فرسائی مجھ پر ظلم کرتا ہے اور اسی لیے میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہوں جب کہ انہیں جواب کی امید نہیں۔ آج بھی ایک عام عرضی گزار کو بار بار عرضی دیے جانے کے باوجود کوئی جواب نہ ملنے کی بہت سی شکایتیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔

ناامیدی میں بھی احساس خوش امیدی

بہ فیض بے دلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

مصرعۂ اول میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ناامیدی کے فیض سے ہمیشہ کی ناکامیابی آسان ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام سے پوری طرح ناامید ہو جاتا ہے تو اس کام کی کامیابی میں جو کاوش دلی کوششوں کی وجہ سے ہوتی ہے وہ ہٹ جاتی ہے مگر مصرعۂ ثانی میں ان کا یہ کہنا ہے کہ جب ان کا عقدۂ مشکل کشاکش کو پسند آ گیا ہے تو وہ اسے کیوں کھلنے دے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شے کسی کو مرغوب طبع ہوتی ہے اور پسند آ جاتی ہے تو وہ اس کو قائم رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔

قناعت (Contentment)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

ایک اچھے انسان کو ہوس نہیں ہوتی اور اگر اس کو کوئی چیز ملتی ہے جس سے کہ اس کا کام چل سکے تو وہ اپنے حالات اور مالی حالت کو دیکھتے ہوئے اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ اس طرح انسان کسی غلط راستے پر نہ جا کر آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں بھی شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوت متخیلہ نے ان تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دے کر اس قابل کر دیا کہ زبان اس کو پڑھ کر زبان متلذذ اور کان اس کو سن کر محظوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے، اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے۔ اس کا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبۂ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے۔ (مولانا حالی)

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Aptt, 2-I.P.Extn.
Delhi-110092
Email.:amkhwaja2007@yahoo.co.in

ادبی مباحث

اردو افسانہ
روایت اور تجربے

مظہر محمود

ہمارے ادب میں کہانی کا آغاز کہاں سے اور کب ہوا اس کے بارے میں مختلف نقادوں، دانشوروں اور محققین نے کچھ منطقی اندازے لگائے ہیں۔ یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں لگتا کہ انسان نے، وہ جہاں بھی رہتا ہو، جو بھی زبان بولتا ہو اس کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کا جو زبانی اظہار کیا ہوگا اس کا تعلق اس کی اپنی زندگی یا اس کے گرد و پیش سے ضرور رہا ہوگا۔ رام لعل نے اپنے ایک مضمون 'افسانہ اور قاری' میں یہ مسئلہ اُٹھاتے ہوئے کہ 'ہمارا پہلا کہانی کار کون تھا' کہا ہے:

''ہمیں بہت دور نہیں جانا ہوگا۔ وہ یقیناً ایک جفا کش وہٹر رقبائلی ہی رہا ہوگا۔ جس نے ایک دن اچانک کسی بھیانک جانور کو تن تنہا مار گرایا ہوگا تو اس کے دل میں خوف و ہراس کے جذبات کے ساتھ ساتھ ایک اور خواہش جو پیدا ہوئی ہوگی وہ اپنے ساتھیوں کو دشمن پر فتح پانے کی رُوداد سنانے کی ہی ہوگی۔ جنگل سے لوٹ کر اُس نے الاؤ کے گرد اپنے ساتھیوں کو جمع کیا ہوگا اور اُس وقت کی اپنی عجیب و غریب زبان اور ہاتھوں و آنکھوں کے اشاروں سے کام لے کر اُنھیں اپنی رووداد سنائی ہوگی، حملے اور بچاؤ کے داؤ پیچ کی ایک تفصیل، بار بار دم پھول جانے کی گھات لگا کر وار کرنے کی، دشمن کے جسم سے خون نکل نکل کر بہنے کی اور پھر دشمن کو ختم کرنے کی خوشی سے چیخ اُٹھنے کی۔ یہ بھی اغلب ہے کہ وہ بھیانک جانور جسے وہ اپنا دشمن سمجھتا تھا اُس وقت الاؤ کے اوپر ہی بھونا جا رہا ہو! سننے والوں کو پوری طرح متوجہ رکھنے کے لیے بہت سی باتیں تو اُس نے اپنی طرف سے بھی ملا دی ہوں گی تاکہ لڑائی کا قصہ اور زیادہ حیرت ناک اور ڈراؤنا ہو جائے۔ سُننے والوں نے بھی اس کی رووداد کو کئی طرح کی دلچسپیوں کے تحت سنا ہوگا۔ سنانے والے کا دلچسپ ترین اندازِ بیان، تجربے کا آواگون، جگ بیتی اور آپ بیتی کی چیتنا اور ایسے ہی معرکے سے خود بھی کبھی نپٹنے کی خواہش!''

(اقتباس از مضمون ''افسانہ اور قاری'' صفحہ 18 مطبوعہ ''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'' از رام لعل۔ سیمانت پرکاشن، نئی دہلی 1985)

ہمارے دانشور اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ کہانی کا ظہور قدیم داستانوں کے بطن سے ہی ہوا تھا۔ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

''کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے۔ کہانی انسان کے اُن کارناموں کی رُوداد ہے جس میں اُس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے۔ کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور تخیل، تصور اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے۔ کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔''

(اقتباس از ''داستان سے افسانے تک'' صفحہ 2 مطبوعہ اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی)

ڈاکٹر وزیر آغا اردو کہانی کا بنیادی تعلق داستانوں سے جوڑنے کے باوجود اسے زندگی کے جملہ عوامل سے سراسر دور قرار نہیں دیتے۔ دیگر محققین اور تنقید نگار اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ مختصر افسانہ صنعتی دور کی پیداوار ہے جس کا آغاز پہلے پہل مغربی ممالک میں ہوا اور اس کا اثر اردو میں مغرب کے افسانہ نگاروں سے ہی قبول کیا گیا۔ موپاساں کے زیادہ تر افسانے اردو میں پہلے پہل سعادت حسن منٹو نے منتقل و متعارف کرائے تھے۔ انھوں نے روس کے ممتاز افسانہ نگاروں چیخوف اور گورکی کے افسانوں کے تراجم بھی کئے تھے۔ منٹو پر موپاساں کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں، اس بات کا اعتراف ممتاز شیریں بھی کرتی ہیں۔ وہ چیخوف کے اثرات بیدی، حیات اللہ انصاری، محمد حسن عسکری اور غلام عباس کے افسانوں میں تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ 'سوغات' بنگلور 1958 میں رام لعل کے دو اہم افسانوں ''ایک شہری پاکستان کا'' اور 'او-سی' پر چیخوف اور گورکی کے واضح اثرات کی نشاندہی کی تھی۔ یہ بات تسلیم کر لینے میں اہل اردو کو کوئی قباحت محسوس نہیں ہونی چاہئے کہ اردو افسانہ درحقیقت مغربی افسانے ہی کی دین ہے لیکن اب اردو افسانہ اپنا آزادانہ وجود تسلیم کرانے میں بھی کامیاب ہو چکا ہے کیونکہ اس کے اساسی پہلوؤں میں مشرقی زندگی کے جملہ عوامل اور یہاں کے لوگوں کی ساری نفسیات، ان کی معاشی جدوجہد اور ان کے ارمانوں و خوابوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ اردو افسانہ جب داستانوں، قصوں اور ابتدائی ماجرا نگاری سے نکلا تو اس کے سامنے کئی تحریکوں کی منزلیں آموجود ہوئیں۔ اُن کی آگ میں تپ کر اردو افسانہ کندن کی طرح کھرا اور سچا ثابت ہوا۔ اردو افسانے نے رومانی تحریک، مذہبی تحریک، ترقی پسند تحریک، حقیقت پسندی اور انفرادی آزادی کے رجحانات جو جدیدیت کے نام سے موسوم ہوئے، کے ساتھ مختلف ادوار میں خود کو وابستہ رکھا اور اپنا سفر کسی ایک پڑاؤ پر ختم نہیں کر دیا بلکہ یہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ ہر زبان کے ادب میں کسی نہ کسی غیر مرئی یا واضح تحریک کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ تحریک اجتماعی بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے تحریک اور اس کے عوامل کے بارے میں لکھا ہے:

''تحریک جمود کی یک رنگی کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع

پیدا کرنے کا عمل ہے اور اس کی تہہ میں تحرک کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ عہد نامۂ قدیم کے حوالے سے تخلیقِ کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتدا میں ہر طرف جمود تھا۔ فضا یکسر ساکن تھی اور تحرک پر صرف خدا کو قدرت حاصل تھی۔ پھر آدم کو پیدا کیا گیا اور اس جامد فضا میں حرکت کی پہلی لہر پیدا ہوئی۔ ابتدائے کائنات کے ان ایام میں زندگی ہموار اور احکام خداوندی کے تابع تھی اور آدم عمل تغیر سے نا آشنا تھا۔ اس لیے اُسے جمود کی فضا کہا گیا۔ مگر جب آدم نے دانۂ گندم چکھ لیا تو دیکھتے ہی دیکھتے جمود کی یہ فضا پارہ پارہ ہوگئی اور پھر اُس ذہنی اور جذباتی جزر ومد کا آغاز ہوا جس سے ہر تحریک عبارت ہوتی ہے۔''

(اقتباس از ''اردو ادب کی تحریکیں'' صفحہ 141 مطبوعہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی۔1985)

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے تحقیقی مقالے میں متعدد ادبی تحریکوں پر سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ بحث عالمی تحریکوں کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ان میں سے چند ایک تحریکیں جو ہمارے یہاں واضح طور پر اُبھریں اُن میں رومانی، وجودیت، نفسیات ، تجریدیت، علامت نگاری، مارکسزم اور بھگتی تحریکوں کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں رومانوی تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک کا بول بالا رہا۔ ترقی پسند تحریک مارکسی نظریات کی تبلیغ کے لیے ہی شروع کی گئی تھی۔ لیکن کسی ادب میں کسی بات کو فن کے دائرے میں رکھ کر پیش کرنا اور بلند و بانگ پروپیگنڈے کے ذریعے بالکل صحافیانہ انداز میں کہنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں یہ دونوں رجحان کہیں الگ الگ افسانہ نگاروں کے یہاں، کہیں ایک ہی افسانہ نگار کے یہاں اُس کے تخلیقی سفر کے مختلف مدارج میں ملتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے 1936 سے لے کر 1960 تک ایک تاریخی رول ادا کیا۔ پھر اس کا تنظیمی ڈھانچہ کافی حد تک بکھر گیا۔ اس کے فکری نظام میں بھی کافی تبدیلیاں در آئیں۔ بہت سے ادیب تو ترقی پسند بنے رہے۔ بعض افسانہ نگار ایک دوسرے رجحان کے ہم نوا ہوگئے جو اردو ادب میں جدیدیت کے نام سے موسوم ومقبول ہوا۔ اردو افسانہ علامت نگاری و تجریدیت کا آغاز برصغیر میں دراصل پاکستان سے ہوتا ہے جہاں آزادی کے بعد 1958 سے پے درپے تین فوجی حکومتوں کا تسلط قائم رہا۔ جو بالآخر 1988 میں تمام ہوا۔ لگ بھگ تیس سال تک پاکستانی ادیبوں کو فکر و خیال اور اظہار کی آزادی سے محروم رکھا گیا تو انھوں نے علامت نگاری کو اپنا کر افسانے اور شعر میں وہ سب کچھ کہنا شروع کردیا جو وہ کھل کر اُن حالات میں نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اردو ادب کا ہی ایک واحد رشتہ ہے جو فکری اور تخلیقی سطح پر بے حد مضبوط اور توانا ہے۔ دونوں ملکوں کا اردو ادب نہ صرف ایک دوسرے کے یہاں مقبول و ہر دل عزیز ہے بلکہ دونوں طرف کے ادیب ایک دوسرے سے اثر بھی قبول کرتے ہیں، چنانچہ پاکستان کی علامت نگاری کو ہندوستان کی آزاد فضا میں ایک فیشن کے طور پر اپنا لیا گیا۔ ہمارے یہاں کے ادیب یوروپی و امریکی ادبی تحریکوں کے قریب جانے لگے تھے۔ اس لیے پاکستان کی علامت نگاری اور مغرب کی وجودیت، تجریدیت اور سرئیلیزم نے مل کر اردو سے زائد عرصے تک ایک فکری انقلاب پیدا کردیا۔ ہندوستان میں جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں تین نقادوں پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور محمود ہاشمی کا خاص ہاتھ رہا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اردو افسانے پر کئی پہلوؤں سے تنقیدی مضامین لکھے ہیں جن میں علامتیت، استعاریت اور اساطیر و داستان گوئی کی نشاندہی کرنے کے علاوہ انھوں نے ساختیات اور بعد ساختیات کے ادق مضامین بھی کثرت سے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کے ایسے لکھنے والوں کو قابلِ اعتنا سمجھا ہے جو ترقی پسندی اور مقصدیت کے سیلاب میں بے مایہ تنکوں کی طرح بہہ نہیں نکلے بلکہ انھوں نے اپنی فکری اور فنی توانائی کے ساتھ اردو افسانے کو نئی جہتوں سے ہمکنار کرنے میں کما حقہٗ مدد دی ہے۔ وہ افسانے میں زندگی کی جامعیت اور اس کے نارمل حسن کو اس کی سیاہی اور سفیدی کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا راجندر سنگھ بیدی کے سر پر باندھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نئی نسل کے بیشتر لکھنے والے بھی زندگی کی ہمہ پہلو ترجمانی کرنا چاہتے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بیدی والی بات نہیں، البتہ یہ لوگ اس لحاظ سے پچھلے افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں کہ ان میں سے بیشتر کسی طرح کی نظریاتی وابستگی قبول نہیں کرتے اور ''سوچے سمجھے نتائج'' کی فارمولہ کہانی سے بچتے ہیں۔ ان کے ہاں بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہے اور بجائے ٹائپ کے کردار پر زور ملتا ہے۔ یہ زندگی کے حقیقی خدوخال کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رام لعل، جوگیندر پال، شرون کمار ورما، اقبال متین، ستیش بترا، قیصر تمکین، رتن سنگھ، اقبال مجید، امر سنگھ اور عابد سہیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ (صفحہ 500)

.....لیکن ادھر نئی نسل کے بعض افسانہ نگاروں نے (علامت کو) ایک رجحان کی حیثیت سے اپنایا ہے۔..... وزیر آغا نے ایک جگہ لکھا ہے: ''اشاراتی عنصر تمام اصناف ادب میں اہمیت حاصل کر رہا ہے اور افسانے نے بھی اسے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ دراصل تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ فرد کی تیز نگاہی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ اب وہ پلک جھپکتے ہی بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس لیے واشگاف انداز کا کچھ دلدادہ نہیں رہا۔'' سیدھے سادے روایتی افسانے کے مقابلے میں علامتی افسانہ کچھ غیر مرئی سا ہوتا ہے۔ اس میں ٹھوس ہونے کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو منطقی افسانے کی خصوصیت ہے۔ اس میں زمان ومکان کا واقعاتی احساس بھی نہیں ملتا بلکہ زماں اور مکاں دونوں ذہنی تجرید کی سطح پر واقع ہوتے ہیں اور ان میں اچانک تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ علامتی افسانے میں ٹھوس کرداروں کا کام تمثیلوں اور علامتوں سے لیا جاتا ہے۔ ...... علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کردیتا ہے۔ علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی سے محض خاص طرح کے تاثر اُبھارنے کا کام لیتا ہے۔ ایسے افسانوں کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جاسکے۔ بعض افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت پیدا کرلیتا ہے کہ اُن میں علامتی افسانہ کی شان از خود پیدا ہوجاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'سلطان' اس کی بہترین مثال ہے۔ تجریدی افسانہ ہمارے افسانے کے اس سفر کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کا رُخ خارج سے داخل کی طرف ہے یہ انسان کے ذہنی مسائل، اس کے کرب اور حقیقت کے عرفان کی تلاش کا اظہار ہے۔ صرف فکر یا ذہنی سوچ کی سطح پر۔ افسانہ علامتی ہو یا تجریدی، اس میں لغوی معنی صرف ایک طرح کا اشارہ کردیتے ہیں۔ باقی کام پڑھنے والے کے ذہنی استعداد کا ہے۔ دراصل لفظوں کے ظاہری، منطقی اور لغوی معنی کے علاوہ اور معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ ایسے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اگر یہ بات نظر میں رہے تو ان سے لطف اندوز ہونا چنداں مشکل نہیں۔''

(اقتباس از ''اردو افسانہ: روایت اور مسائل'' مرتبہ گوپی چند نارنگ، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، صفحات 502-501، 1981)

گوپی چند نارنگ نے اس رجحان کو بڑھانے والے

افسانہ نگاروں میں پاکستان کے انتظار حسین، عبداللہ حسین، خالدہ اصغر، انور سجاد، غلام الثقلین نقوی اور ہندوستان میں دیویندر اسر، بلراج مینرا، سریندر پرکاش وغیرہ کو قابل ذکر قرار دیا ہے۔ ادھر علامت نگاری فیشن کے طور پر نئے لکھنے والوں میں اتنی عام ہوئی کہ انھوں نے علامتیت اور تجریدیت پسند نقادوں کی نظر میں چڑھنے کے لیے اپنے ایک ہی افسانے میں کئی کئی علامتیں ٹھونس ٹھانس کر اس طرح رکھ دیں کہ افسانے کا بنیادی حسن ہی مسخ ہوکر رہ گیا۔ کسی بھی تخلیق میں علامت کا دخل شعوری ہونے کے بجائے لاشعوری طور پر آجانے سے ایک نئی معنویت کو پیدا ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید علامت نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامت نگاری کی تحریک پر اگرچہ ابہام کا الزام عائد ہوتا ہے تاہم اس تحریک کے شعراء نے ارضی سطح سے بلند ہوکر زندگی کے حسن کو نئے زاویے سے پیش کیا۔ انگریزی ادب میں ییٹس اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ ہمنگوے کا ناول ''بوڑھا اور سمندر''، جیمز جائس کی ''یولیسس'' اور جارج آرویل کے ''اینی مل فارم'' میں علامت نگاری کو نسبتاً نئے زاویوں سے استعمال کیا گیا ہے۔ علامت نگاری کی تحریک میں فرد کی شخصیت کو اہمیت ملی۔ اس تحریک کے شعراء نے شعر کی غنائیت سے ذہن پر ایسے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی جنھیں صرف موسیقی کی لہریں ہی پیدا کرسکتی ہیں۔ چنانچہ اس تحریک نے علامت کو سُر کی تجریدی قدر کا حاصل قرار دیا۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا کہ علامت ایک خاص تہذیبی پس منظر میں ہی سحر آفرینی کرسکتی ہے اور مجرد علامت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس غیر ارضی کیفیت نے شعرا کو مشکل پسندی پر مائل کیا اور بالآخر علامتی شاعری زندگی سے گریز اور حقائق سے فرار کے ہم معنی قرار دی جانے لگی۔ بودلیر، میلارمے اور رامبو شعرا چونکہ زبان پر قدرت اور گرفت رکھتے تھے اس لیے ان کی شاعری ابہام کے باوجود قاری کو سحر سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ اس کے برعکس ناپختہ شعرا نے علامت کو اتنا ذاتی بنا دیا کہ اس کے داخل سے روح غائب ہوگئی اور نظم کا تانا گا الجھتا چلا گیا۔ چنانچہ آج جب مغربی ادب میں علامت نگاری کی تحریک کا تذکرہ ہوتا ہے تو چند بڑے ناموں کے سوا باقی سب شعرا انھی علامتوں کے جنگل میں گم نظر آتے ہیں۔ تاہم بودلیئر، میلارمے اور والیری کے اثرات نے دنیا بھر کے ادب کو متاثر کیا اور اس تحریک کی بازگشت یوروپ سے باہر کے ممالک کی شاعری میں بھی سنی جانے لگی۔''

(اقتباس از اردو ادب کی تحریکیں، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، صفحات 4-133:1985)

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہندوستان کے اردو ادبیات میں علامت نگاری پاکستان کے تتبع میں فیشن نگاری کے طور پر اس زمانے میں اختیار کرلی گئی تھی۔ جب وہاں پے درپے فوجی حکومتوں نے اظہار کی آزادی پر سخت پابندیاں عائد کردی تھیں جب کہ ہندوستان میں کسی بھی دور میں ماسوائے ایمرجنسی کے چند ماہ میں اظہار کی پوری آزادی حاصل رہی۔ پھر بھی چونکہ کسی صنف ادب میں علامت نگاری یا مشکل پسندی کبھی کبھی اس کا حسن بن جاتی ہے اس لیے ہمارے ادیبوں نے اپنی تخلیقی تحریروں کو مزید خیال انگیز بنانے کے لیے ابہام وایہام کا دامن تھاما۔ جب کہ ہمارے یہاں نقاد اور دانشور اس بات پر پوری طرح متفق نظر آتے ہیں کہ علامت، استعارہ، رمز، کنایہ وغیرہ شاعری کا ہی اصل حسن ہے خصوصاً نظمیہ شاعری میں۔ اردو افسانے میں علامت نگاری بیج تنتر کی کہانی کے دور سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ ایسی پرانی حکایتوں میں جو بظاہر بہت ہی سیدھی سادی اور عام بیانیہ نثر میں پیش کی گئی تھی اور زندگی کے بعض حقائق تو جانوروں اور پرندوں کے ذریعے بیان کئے گئے تھے لیکن ان سب کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے پیچیدہ مسائل ہی سے تھا۔ اگر یہی بات پیش نظر رکھی جائے تو ہماری علامتی کہانیوں کا آغاز آج سے سینکڑوں سال پہلے ہوچکا تھا۔ پروفیسر گیان چند جین نے اپنی معروف تحقیق ''اردو کی نثری داستانیں'' مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1987 میں حکایات کے باب میں متھ، لجنڈ، رومانس وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے صفحہ 26 پر قدیم حکایتوں کے بارے میں لکھا ہے:

''ان افسانوں کو خیالی، غیر حقیقی یا لغو کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک قوم یا گروہ کی ابتدائی فکر کی تاریخ ہیں۔ اولین تہذیب کا رنگ وغازہ ہیں۔ ان سے ماضی میں دل کشی اور جاذبیت آجاتی ہے۔ عہد قدیم کے متعلق اکثر مواد انھیں روایتوں اور کہانیوں سے ملتا ہے۔ سنسکرت میں رامائن اور مہابھارت، ہومر سے منسوب ایلیڈ اور اوڈیسی رائج الوقت گیتوں اور مختصر رومانوں کو ملاکر ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ اور فردوسی کے شاہنامے کے ماخذ مروجہ کہانیاں ہی تھیں۔ تمام مذہبی کتابوں میں افسانے کو جگہ دی گئی ہے۔ حکمائے یونان کے بقول قصہ گوئی شاعری اور موسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تر ہے۔ ابتدائی نقوش موجود نہیں ہیں۔ کون جانے ہماری بعض لوک کہانیاں دس پانچ ہزار سال پیشتر وجود میں آچکی ہوں۔ فی الحال ہماری دسترس انھیں افسانوں تک ہے جو ضبط تحریر میں لائے جاچکے ہیں۔ ابتدا میں حکایات مختصر تھیں۔ واقعات سیدھے سادے ہوتے تھے۔ بعد میں بڑے بڑے ادیبوں نے ان میں تخیل کی جولانیاں دکھائیں۔ پروہتی دور کے بعد سامنتی دور میں قومی سورماؤں کی سوانح پیش کی گئیں۔ یہ نہ صرف رزم کے ہیرو ہوتے تھے بلکہ دل بانکی میں بھی پختہ کار ثابت ہوتے تھے۔ یہ نہ صرف حریف سورماؤں کو زیر کرتے تھے بلکہ دیوؤں اور بلاؤں کو بھی خاک میں ملا دیتے تھے۔ پریوں کو شیشے میں اتار لیتے تھے۔''

(اقتباس از اردو کی نثری داستانیں از گیان چند جین، صفحہ 26، مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1978)

اردو کے معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے اپنے ایک مضمون میں کتھا سرت ساگر اور جاتک کتھاؤں کو علم ودانش کا ایک بیش بہا خزانہ قرار دیا ہے اور وہ بھی ہزاروں سال پرانی کتھاؤں کو علامت کے انداز میں لکھی ہوئی ان کہانیوں کو انسانی زندگی کے رموز کا مجموعہ قرار دیتے ہیں:

''مہاتما بدھ نے پیڑ تلے بیٹھے بیٹھے جھڑتے پتوں سے مٹھی بھری اور آنند کو دیکھا۔ ''اے آنند! کیا سارے پتے میری مٹھی میں آگئے ہیں؟'' آنند جھجکا، پھر بولا ''تتھاگت، یہ رُت پت جھڑ کی ہے۔ پتے جنگل میں اتنے جھڑے ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہوسکتی۔'' مہاتما بدھ بولے ''اے آنند، تونے سچ کہا۔ پت جھڑ کے اَن گنت پتوں میں سے بس میں مٹھی بھر سمیٹ سکا ہوں۔ یہی گت سچائیوں کی ہے۔ جتنی سچائیاں میری گرفت میں آئیں میں نے ان کا پرچار کیا۔ پر سچائیاں اَن گنت ہیں، پت جھڑ کے پتوں کے سمان۔''

(اقتباس از جنم کہانیاں از انتظار حسین سنگ میل پبلی کیشن، لاہور۔ 1978، صفحہ 13)

اردو افسانے میں علامت کے استعمال کے بارے میں رام لعل نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''1960 کے بعد نئے افسانہ نگاروں کے یہاں تنقید میں جگہ پانے کا رجحان عام ہوگیا ہے۔ اسی کے اثرات کے تحت وہ تجریدیت، ابہام، علامتوں وغیرہ کا سہارا لے کر افسانے کو شاعری کے قریب لے آئے اور اسے فلسفیانہ خیالات سے بوجھل بنانے کی کوشش کی۔ بعض ایسے لوگوں کی تعریفیں بھی ہوئیں لیکن اس سے افسانے کی بنیادی خصوصیات بہت مجروح ہوئیں۔ لیکن

نئے اردو افسانے کا یہ ایک تجرباتی دور تھا جس کا عرصہ دس سال پر محیط ہے۔ اس کے بعد کہانی واپس آنے لگی۔ علامت کو علامت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا، نہ کہ فیشن کے طور پر 'علامت زدہ' بنانے پر زور دیا گیا۔''

(رام لعل سے ایک انٹرویو از ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، 'رام لعل شخصیت اور بساط فکر و فن' مرتبہ خان فہیم، مطبوعہ بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، 1994، صفحہ 257)

وہ علامت اور استعارے کے فرق کی وضاحت کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''کہانی میں شعوری طور پر علامت کا استعمال کبھی کبھی تو کامیاب ہوجاتا ہے لیکن زیادہ تر افسانے کو مصنوعی بنا دیتا ہے۔ میرے نزدیک افسانہ نگاری بھی کبھی کبھی وجدانیت کے سحر میں مبتلا ہوجاتی ہے اور افسانہ لکھ چکنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں ایسے معنی پیدا ہوگئے ہیں جو پہلے سے سوچ کر ہرگز نہیں لائے جاسکتے تھے۔ وہ معنویت جو افسانہ نگار کے ذہن میں نہ ہو، استعارہ ہوسکتی ہے۔ علامت شعوری طور پر آئے یا غیر شعوری طور پر وہ ایک فرد، زمانہ یا کوئی ٹھوس چیز ہوسکتی ہے لیکن علامت یا استعارے کا تعلق تنقید سے زیادہ ہے۔ بعض اچھی تنقیدوں میں ان ہی کی مدد سے ایک معمولی افسانے میں نئی معنویت دریافت کرلی گئی ہے۔ اگر چہ اس بات کا بھی امکان رہتا ہے کہ افسانہ نگار اس سے اتفاق نہ کرے۔''

(اقتباس از ''روبرو'' مطبوعہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 1992، ص 80)

جوگیندر پال علامتی اور تجریدی رجحان کے بارے میں کہتے ہیں:

''ہمارے حالیہ ادب میں علامتی اور تجریدی رجحان کی موجودگی کا احساس دو جداگانہ سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک سطح ان لوگوں کی ہے جو علامت اور تجرید کے شوق میں ادب پیش کرنے کے بجائے صرف علامت اور تجرید پیش کرتے ہیں۔ فن کے شعوری تجربوں (Experiments) کے ان ماہرین کو معلوم نہیں کہ تجربوں کی بنیاد پہلے سے کچھ فرض کر لینے پر ہوتی ہے تاکہ بالآخر کچھ ثابت کیا جاسکے۔ ادب میں کچھ فرض کیا جاتا ہے نہ ثابت۔ ادب لازماً تخلیقی وارادات سے عبارت ہوتا ہے اور زندگی کے مانند اسے جیسے ہونا ہوتا ہے 'بس' ہو' جاتا ہے۔ ادیب کو اس بات کے فنی عرفان کے بغیر چارہ نہیں کہ واردات کی تخلیق پیش کشی پر نپے تلے نتائج کا گمان نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی واردات بے نتیجہ تو نہیں ہوتی مگر ادیب شعوری طور پر نتائج کو مرتب کرتا ہوا لگے تو اس کی تخلیقیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جانب پروپیگنڈا لٹریچر تعلیم گاہوں کے معصوم نصاب میں لمبی تان کر پڑا رہتا ہے، تو دوسری جانب شعوری بے مقصدیت چابی کی گڑیا کے مانند تھوڑی دیر تک پھدک کر گر جاتی ہے۔ ادب میں مقصدیت پر اصرار قطعاً جائز نہیں۔ لیکن اس کی متحرک پیش کش کا ادراک اولین شرط ہے۔ ادبی مفہوم میں مقصدیت اسی صورت باضمیر ہوتی ہے، جب 'کہی' نہ گئی ہو، بلکہ یوں لگے کہ 'کی' گئی ہے۔ اسی مقام پر اسلوب کے اجزا تجریدی اور دیگر اجزا کے فطری یا غیر فطری استعمال کا مسئلہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے... علامتی اور

ادب لازماً
تخلیق وارادات سے عبارت
ہوتا ہے اور زندگی کے مانند اسے جیسے
ہونا ہوتا ہے 'بس' ہو' جاتا ہے۔ ادیب کو اس بات
کے فنی عرفان کے بغیر چارہ نہیں کہ واردات کی تخلیق
پیش کشی پر نپے تلے نتائج کا گمان نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ
کوئی واردات بے نتیجہ تو نہیں ہوتی مگر ادیب شعوری طور
پر نتائج کو مرتب کرتا ہوا لگے تو اس کی تخلیقیت مشکوک
ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جانب پروپیگنڈا
لٹریچر تعلیم گاہوں کے معصوم نصاب میں لمبی تان
کر پڑا رہتا ہے، تو دوسری جانب شعوری
بے مقصدیت چابی کی گڑیا کے
مانند تھوڑی دیر تک پھدک کر
گر جاتی ہے۔

تجریدی رجحان کی دوسری سطح گہرے پانیوں کی خاموش سطح ہے۔ یہاں علامت اور تجرید کسی ادبی پارے میں کچھ اس طرح گھل مل کر آتے ہیں کہ ان کی طرف دھیان جانے کی بجائے قاری کے ذہن میں اس پارہ کی کوئی گرہ کھلنے لگتی ہے۔ علامت اور تجرید کے وسائل سے ادب کے امکانات یقیناً وسیع تر ہوئے ہیں لیکن یہ بھی ہے علامتوں کو محض علامتوں کی علامتیں بنا بنا کر پیش کرنا بچکانہ مشق کے مترادف ہے۔ علامت اور تجرید کا استعمال اگر پرکار ہے تو انہیں ادبی تخلیق کے اندر سے پھوٹنا ہوگا۔ جیسے ہمارے چہروں کے نقوش ہمارے اندر سے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ان ہی کی بدولت ہمارے بونافائیڈز پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ کئی لوگ آج علامت اور تجرید کو ان پرانے لکھنے والوں کی طرح برتتے ہیں جو محض زور بیان کے لیے الفاظ کے ٹوکرے ڈھویا کرتے تھے۔ ان کی ونگیریٹی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ونگر ہیں...

اگر آپ علامت اور تجرید کے حوالے سے کہانی کی بات کرنا چاہیں تو مجھے یہ کہنا ہے کہ کہانی کے سارے اجزا سے بننے والی ساری کی ساری شکل اس کے بیج میں ہی مضمر ہوتی ہے... کسی نوزائیدہ کی شکل میں اس کے ماں باپ تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ اپنا کوئی دوٹوک فیصلہ کرکے اسے اپنی مرضی کی کوئی بھی شکل نہیں دے پاتے ہیں۔ بچہ اپنی شکل خود آپ اختیار کرتا ہے اور جیسے جیسے زندگی کر کر کے اونچا ہوتا ہے ویسے ویسے اس کے چہرے میں اس کے کردار اور عمل آباد ہوتے ہیں... اس تعلق سے مجھے خیال آتا ہے کہ میری ایک کہانی 'نوزائیدہ' کا تانا بانا علامتی ہے اور مجھے اس لئے پسند ہے کہ اس کی گاڑھی علامت اس کے بدن کا ہی کوئی انگ بن گئی ہے، اس کی کوئی علاحدہ شناخت ہے ہی نہیں... میرا اپنا خیال بھی اس طرف کہانی کی آخری سطر لکھتے ہوئے بہ اتفاق چلا گیا... اسی طرح اپنی ایک اور کہانی 'پیچھے' میں تجریدی واردات کا ایک گھنا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب اس میں اجنتا کیوز کی تصویریں دیکھتے ہوئے مجھ پر یہ احساس غالب ہو رہا تھا کہ وہ سب اپنی بستی میں بسے ہوئے زندہ لوگ ہیں اور میں ایک بت جسے وہ استعجاب اور استفہام سے دیکھے جا رہے ہیں۔''

(اقتباس از ''روبرو'' مطبوعہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992، صفحات 89-88)

مذکورہ بالا مباحث سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ ہمارا اردو افسانہ فکر و خیال 'بیانیہ' تجربات و مشاہدات کے متعدد مدارج دو سو سال سے زائد میں طے کرتا ہوا اب اس نہج پر آپہنچا ہے کہ اسے ہم نہ صرف اردو کی مختلف اصناف میں ایک ممتاز و معتبر مقام دے سکنے کے قابل ہوئے ہیں بلکہ اسے عالمی سطح پر بھی بڑے فخر کے ساتھ ایک اہم صنف کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں خصوصاً انگریزی اور روسی میں اردو افسانہ کے بے شمار تراجم کو دیکھتے ہوئے اردو افسانے کی مقبولیت کے بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتی۔ غیر ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں میں برصغیر کے اردو ادبیات پر جو ریسرچ کا کام ہو رہا ہے اس میں بھی اردو افسانے کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

■

Dr. Mazhar Mahmood
Asstt. Station Director,
DD Kisan, CPC, Asiad Village Complex,New Delhi -110049
Mob: 09891241192

ادبی مباحث

شاہ عالم

جدید نظم کا فکری پس منظر

انیسویں صدی کا نصف آخر گرچہ مغلیہ سلطنت کے غروب آفتاب کا زمانہ تھا لیکن علمی و ادبی اعتبار سے یہ زمانہ نہایت تابناک رہا ہے۔ 1857 میں ہندوستان پر انگریزی حکومت کے مکمل تسلط نے یہاں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کا تانا بانا ٹوٹنے بکھرنے لگا۔ زندگی کے بنے بنائے سانچے ناکافی معلوم ہونے لگے۔ نئی اقدار مروجہ اقدار کی جگہ لینے لگیں۔ علمی و ادبی سطح پر تعبیر و تفہیم کے نئے پیمانے وضع کیے گئے۔ انگریزی حکومت کے سیاسی تسلط کے ساتھ ہی انگریزی علم و ادب کی برتری روز افزوں بڑھتی گئی اور انگریزی علم و ادب سے اہلِ علم کی دلچسپیاں بھی بڑھنے لگیں۔ مغربی ادب سے استفادہ اور تراجم سے نہ صرف ہیئت و اسلوب کے نئے پیمانے وجود میں آئے بلکہ نئی نئی اصناف کا ظہور ہوا۔ لیکن اس تضمن میں جدید نظم کا آغاز نظم نگاری کے باب میں بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ نتیجتاً اس عہد کے ادبی حلقوں میں نظم جدید کو سب سے زیادہ موضوع بحث بنایا گیا اور اس کی حمایت اور مخالفت میں مباحثوں اور مضامین کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ ادبی منظرنامے پر ان تبدیلیوں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی محرکات بھی تھے جن پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

1857 کے انقلاب نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی و ادبی تصورات کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ یہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط ہی نہیں مغلیہ سلطنت کے مکمل زوال کی بھی تاریخ ہے۔ مغلیہ دور کے نہایت روشن اور مستحکم تہذیبی روایت میں رچے بسے معاشرے کے لیے نئی حکومت اور نئی تہذیب کو قبول کرنا آسان نہ تھا۔ بہ قول حالی ''مغلوں کے سیاسی زوال کے باوجود عہدِ مغلیہ کی روایات، اقتدار، تہذیبی تصورات اور اسالیب کا چراغ 1857 کے بعد بھی آب و تاب کے ساتھ روشن رہا۔'' دراصل پورا معاشرہ جس طرز پر سوچ رہا تھا اس کے پیچھے صدیوں کی تہذیبی روایات کارفرما تھیں۔ مغلیہ دور حکومت سے ایک جذباتی وابستگی اس عہد کے معاشرے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی نام نہاد بادشاہت کے باوجود ان سے لوگوں کی امیدیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ مغلیہ حکومت سے گہری وابستگی رکھنے والے معاشرے کے لیے انگریزوں کے تسلط کو قبول کرنا نہایت صبر آزما تھا۔ ویسے بھی حکمراں طبقے کے طور طریقے، عادات و اطوار، تہذیبی و مذہبی تصورات و عقائد معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس صورتِ حال نے خارجی و داخلی دونوں سطحوں پر انتشار اور تصادم کو جنم دیا۔

دراصل ہندوستان پر برطانوی حکومت کا تسلط محض ایک حکومت کا قیام ہی نہ تھا بلکہ ایک نئی تہذیب کی بالادستی کا قائم ہونا بھی تھا جس کے رد و قبول میں پورا معاشرہ کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے اور اپنے علمی، ادبی اور تہذیبی سرمائے کی جگہ نئے علوم و فنون، نئی تہذیب اور انگریزوں کے تسلط کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ جو فکری سطح پر ایک تضاد اور تصادم کی شکل میں رونما ہوا۔ مشرق و مغرب کے تصادم جدید و قدیم کے تصادم، عقلیت پسندی اور روایت پرستی کے تصادم نے ایک انتشار کی صورت کو جنم دیا لیکن اسی عہد کے شکست و ریخت اور شدید بحران سے ہماری فکری بیداری کا نیا دور بھی شروع ہوتا ہے اور سرسید تحریک ہماری بیداری کو انگیز کرنے کی ایک منظم کوشش کہی جاسکتی ہے۔

ہندوستان پر مکمل تسلط قائم کرنے کے بعد انگریزی حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ نظم و نسق قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اقتدار کو مضبوط کرنے اور نظامِ حکومت کو موثر بنانے کے لیے انھوں نے انجمنیں قائم کیں۔ یہ انجمنیں حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنیں۔ ان انجمنوں کے ذریعے عوام کے مسائل سے حکومت کو باخبر کیا جاتا تھا اور حکومت کی پالیسیوں اور فلاحی کاموں کی اطلاع عوام کو دی جاتی تھی۔ یہ انجمنیں علمی و ادبی ترقی اور سرگرمیوں کا مرکز بھی تھیں۔ ان انجمنوں میں انجمنِ

پنجاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ 21 جنوری 1865 میں 'انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب' کا قیام عمل میں آیا۔ یہی انجمن 'انجمن پنجاب' کے نام سے مشہور ہوئی۔ انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد کچھ اس طرح سے ہیں:

(1) قدیم مشرقی علوم کا احیا
(2) باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علومِ مفیدہ کی اشاعت
(3) حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنے کے لیے علمی ترقی، معاشرتی مسائل اور نظم و نسق کے مسائل پر تبادلۂ خیال
(4) پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنا
(5) ملک کی عام ترقی اور شہری نظم و نسق کی درستی کے لیے کوشاں رہنا
(6) حاکم و محکوم میں رابطہ، اتحاد و موانست کو ترقی دینا

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کچھ چیزیں ناگزیر تھیں مثلاً کتب خانہ کا قیام، رسالے کا اجرا، تعلیمی، علمی و ادبی، سماجی اور اصلاحی موضوعات پر مذاکرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا مقاصد سے واضح ہوتا ہے کہ انجمنِ پنجاب کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔ ظاہر ہے یہ سیاسی، سماجی، علمی و ادبی اور تعلیمی غرضیکہ ہر طرح کے مسائل اور موضوعات پر گفتگو کرنے اور ان کے حل تلاش کرنے کا اہم مرکز تھا۔ انجمن کی مختلف کمیٹیوں سے ریاست کی اہم اور مقتدر شخصیات وابستہ تھیں۔ ان شخصیات نے انجمن کی سرگرمیوں میں خاطر خواہ حصہ لیا اور انجمن کو فعال بنانے میں خاص دلچسپی بھی لی، جس سے انجمن کو فروغ حاصل ہوا۔ انجمنِ پنجاب کے روحِ رواں مولانا محمد حسین آزاد کی کوششوں نے اُسے علمی و ادبی سرگرمیوں کا نہایت فعال مرکز بنا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سرگرمیوں کے پیچھے ڈاکٹر لائٹنر کی تحریک کارفرما تھی۔ لائٹنر کی علم دوستی اور خود آزاد سے ان کے بہتر تعلقات کے سبب علمی و ادبی کاموں کے لیے بھرپور تعاون ملتا رہا جس سے انجمنِ پنجاب کے جلسوں سے ادب کے لیے سازگار فضا قائم ہوئی۔ 15 اگست 1867 کے انجمنِ پنجاب کے جلسے میں آزاد نے 'نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات' کے عنوان سے ایک لکچر دیا۔ جس میں شعر و ادب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کے کلام موزوں و مقفّٰی لکھے ہیں۔ لیکن در حقیقت چاہیے کہ وہ کلام موثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے۔

> انجمن کی مختلف کمیٹیوں سے ریاست کی اہم اور مقتدر شخصیات وابستہ تھیں۔ ان شخصیات نے انجمن کی سرگرمیوں میں خاطرخواہ حصہ لیا اور انجمن کو فعال بنانے میں خاص دلچسپی بھی لی، جس سے انجمن کو فروغ حاصل ہوا۔ انجمن پنجاب کے روح رواں مولانا محمد حسین آزاد کی کوششوں نے اُسے علمی و ادبی سرگرمیوں کا نہایت فعال مرکز بنا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سرگرمیوں کے پیچھے ڈاکٹر لائٹنر کی تحریک کارفرما تھی۔

اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔''1

''شاعر گویا ایک مصور ہے لیکن نہ وہ مصور کہ خرواشتر درخت اور پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے بلکہ وہ ایسا مصور ہے کہ معنی کی تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینیٔ فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی تصویر مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔......... کبھی تصویر غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے کبھی مضامین فرحت و عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہائے مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔''2

''شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔''3

آزاد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ہمارے معاشرے میں شاعری کی جڑیں کس قدر گہری ہیں۔ آزاد اپنی شعری روایت اور متقدمین شعرا کی خدمات کا اعتراف کھلے دل سے کرتے ہیں اور اپنے گراں قدر ادبی سرمائے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن مروّجہ شاعری انھیں بے وقعت نظر آئی۔ ان کی بے اطمینانی موضوعات اور بیان دونوں اعتبار سے ہے۔ آزاد اپنے لکچر میں شاعری سے متعلق ایک نیا منشور وضع کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ شاعری دراصل کیا ہے، شاعری کیسی ہونی چاہیے اور اس کے مضامین کس طرح کے ہوں وغیرہ۔ یہاں ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آزاد کا یہ لکچر 15 اگست 1867 کا ہے۔ گویا 1874 کے موضوعاتی مشاعرے سے سات برس پہلے وہ شاعری کی اصلاح کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اردو شاعری میں 1874 کا موضوعاتی مشاعرہ آزاد کی انقلابی فکر کا عملی نمونہ تھا جس سے باقاعدہ طور پر جدید نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ لیکن اس مشاعرے سے پہلے 19 اپریل 1874 کو شکشا سبھا کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں کرنل ہالرائڈ کے علاوہ مسٹر جسٹس بولنو جج چیف کورٹ مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل منکلیکن مسٹر ینگ کمشنر مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور، نواب عبدالمجید خاں، سید قمرالدین وغیرہ جیسی مقتدر شخصیات شامل تھیں۔ اس جلسے میں نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے سکریٹری کی تحریر بھی پیش کی گئی۔ جس میں اس مشاعرے کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا تھا۔ یہ اقتباسات دیکھیے:

''اردو کی نئی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے، ان میں اردو نظم بالکل نہیں مگر ان میں کچھ کلام نہیں کہ عمدہ نظم وسیلہ تعلیم کا ہے۔...... اگر شعرائے مذکورہ بالا کے دیوانوں سے ایسا انتخاب نہ ہو سکے تو حسب الہدایت دریافت کیا جاتا ہے کہ شعرائے زمانۂ حال سے خاص مدارس کے لیے ایک ایسی تصنیف کا کام سرانجام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس طور پر مدارس سرکاری کے وسیلے سے دیسی نظم کا رواج ہو جائے اور واہیات نظم جو بالفعل بہت رائج ہے ختم ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہوگی۔''4

''شاعر کو چاہیے کہ جو لکھے ایسا لکھے کہ سنتے ہی انسان کا دل راستی کی طرف مائل ہو اور ہمدردی، پاک دامنی اور خوش اخلاقی کی طرف راغب ہو۔ باغ کی سبزی اور ہریاول، غروب آفتاب کے وقت افق کو خوشنمائی اور اس کے طلوع کے وقت جو خدا کی صنعت کاملہ کا نمونہ ہے کہ شاعر ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ بس اسے چاہیے کہ ان کیفیتوں کے بیان سے خاص و عام کے دلوں پر اثر پیدا کرے تاکہ مشکل کے وقت عبرت حاصل کریں اور فرحت کے وقت اس نعمت غیبی کا شکر بجالائیں۔''5

''اب اس میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس طرح ہر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے آپ بھی ایک مشاعرہ مقرر کریں مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے مصرع طرح کے کوئی مضمونِ خاص ملا کرے جس پر سب لوگ طبع آزمائی کر کے لایا کریں......... میری یہ رائے ہے کہ مہینہ بھر

کے بعد یہ جلسہ ہوا کرے اور اب کی دفعہ جو جلسہ ہو سب اہلِ سخن ایک نظم 'برسات' کی تعریف پر لکھیں۔''[6]

کرنل ہالرائڈ اسی جلسے میں اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

''یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اس لیے جملہ روسا اور اہلِ علم اور ان لوگوں سے جو شعروسخن اور تصانیف سے لذت اٹھاتے ہیں درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ کریں۔''[7]

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ نصاب کے لیے نظموں کی فراہمی اس مشاعرے کا مقصدِ خاص تھا۔ لیکن بات صرف یہی نہیں تھی۔ دراصل لیفٹیننٹ گورنر کے سکریٹری نے اردو شاعری کے مزاج اور سمت ورفتار کا لائحہ عمل بھی پیش کیا۔ مثلاً شاعری کیسی ہونی چاہیے۔ اس میں کس قسم کے مضامین پیش کیے جائیں۔ شاعر کو کن مقاصد کو دھیان میں رکھ کر شاعری کرنی چاہیے، ہر ماہ ایک ایک مشاعرہ منعقد ہوا کرے، مصرع طرح کی جگہ شاعر کو موضوع دیا جائے جس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں وغیرہ۔ ان تحریروں کی روشنی میں وہ اردو شاعری کو چاہِ تنزل سے نکال کر اوجِ ترقی پر پہنچانا چاہتے تھے۔ یہاں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ آزاد جن خطوط پر اردو شاعری کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ انگریز بہادر کے خیالات ان سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ دراصل اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور علمی، ادبی اور تہذیبی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے جن خیالات کو انگریز بہادر پیش کرتے ہیں، آزاد انھیں خیالات کو علمی شکل دینے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ 19 اپریل 1874 کے اسی جلسے جس میں کرنل ہالرائڈ نے تقریر کی تھی اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے سکریٹری کی تحریر کو پیش کیا گیا تھا۔ آزاد نے ایک لکچر دیا اور پھر اپنی مثنوی 'شب قدر' سنائی۔ آزاد اپنے اس لکچر میں مروجہ شاعری کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اہلِ وطن سے یوں خطاب کرتے ہیں:

''اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زورِ مضمون کا جوش وخروش اور لطائف و صنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہوگئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جن میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت وارمان اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندی کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔''[8]

''میرے اہلِ وطن! آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو اٹھو! اہلِ وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ زنجیروں میں مقید ہے اس کے آزاد کرانے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔''[9]

آزاد اپنے لکچر میں اردو شاعری کے جن عیوب کی نشاندہی کرتے ہیں اور جس طرز کی شاعری کو رواج دینے کی طرف توجہ دلاتے ہیں انگریز بہادر اسی طرز کی شاعری کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ آزاد اردو شاعری کے جن عیوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر انھیں عیب تسلیم کرلیا جائے تو ہماری غزلیہ شاعری نیز قصیدہ اور مثنوی کا بڑا حصہ بے معنی قرار پاتا ہے۔ لیکن آزاد اس مقام پر ایک کش مکش میں مبتلا نظر آتے ہیں وہ اپنے گراں قدر ادبی سرمائے کو نظرانداز نہیں کر پاتے بلکہ مشرقی شاعری پر فخر کرتے ہیں اور اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دراصل آزاد کو شکایت مروجہ شاعری سے ہے جس میں بہ قول آزاد بہت سی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ نئی شاعری کو رواج دینے کے جذبے سے مغلوب آزاد بار بار ماضی کی طرف دیکھتے ہیں۔ آزاد نہ تو اپنے علمی وادبی سرمائے کو پوری طرح چھوڑ پاتے ہیں اور نہ ہی نئی چیزوں کو آنکھ بند کرکے قبول کرسکتے ہیں۔ ان کے یہاں تشکیک اور تذبذب کی شدید صورت حال نظر آتی ہے۔ دراصل یہ مسئلہ آزاد کا ہی نہیں بلکہ جدید وقدیم کی کش مکش اور اس کے رد وقبول کی الجھنوں کا تھا جو اس عہد کی پیدا کردہ تھیں اور پورا عہد جس کا اسیر تھا۔

''اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان. تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں. کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہوگئے ہیں. وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جن میں کچھ وصل کا لطف. بہت سے حسرت وارمان اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندی کی خوشامد ہے. یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔'

آزاد کی سرگرمیاں گرچہ نظم جدید کی تحریک میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں لیکن آزاد کے بعد اگر کسی اردو شاعر کو نظم جدید کی تحریک میں نمایاں مقام حاصل ہے تو وہ بے شک حالی ہی ہیں۔ آزاد نے جس تحریک کو فکر عطا کی حالی نے اسی تحریک کی بہتر تعبیر اور عملی صورتیں پیش کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشاعرے سے وابستہ شاعروں میں سے کوئی بھی حالی کی نظم نگاری کے مقام تک نہ پہنچ سکا۔ آزاد جس طرز کی شاعری کو رواج دینا چاہتے تھے اس میں حالی کی شخصیت، فکر، ان کی شاعری اور گورنمنٹ بک ڈپو سے وابستگی بہت معاون ثابت ہوئی۔ دراصل حالی کے خیالات میں تبدیلی لاہور کے موضوعاتی مشاعرے سے پہلے پنجاب گورنمنٹ کے بک ڈپو کی ملازمت کے دوران آچکی تھی۔ یہاں حالی انگریزی کتابوں کے ترجمے کی درستگی پر مامور تھے۔ حالی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ مغربی خیالات اور انگریزی لٹریچر تک رسائی انھیں ترجموں کے ذریعے ہوئی۔ لکھتے ہیں:

''نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی رفعت دل سے کم ہونے لگی۔''[10]

شاعری سے متعلق حالی کے خیالات میں جو تبدیلیاں واقع ہورہی تھیں 1874 کے مشاعرے سے اسے اور جلا ملی۔ حالی کو نئی طرز کی شاعری کے لیے نہایت مناسب پلیٹ فارم میسر ہوا۔ راستی، ہمدردی، پاک دامنی اور خوش اخلاقی کی طرف رغبت دلانے والی شاعری جس کی طرف اپریل 1874 کے جلسے میں توجہ دلائی گئی تھی حالی کی شاعری اس کی ترجمان نظر آتی ہے۔ اثر وتاثیر کی بنا پر یہ نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ حالی نے جس قدر دردمندانہ انداز میں نظمیں لکھیں اس سے ایک بڑے طبقے کو متاثر

ہونا ہی تھا۔

انگریزی نظموں کے خیالات نے حالی کو اس حد تک متاثر کیا کہ مشرقی شاعری کی وقعت دل سے کم ہوگئی۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے شاعری سے متعلق تمام امور پر بحث کی ہے۔ وہ نیچرل شاعری سے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن مسدس جس میں حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔

مسدس کے دیباچے میں حالی اپنی روایتی شاعری اور اس عہد کے مذاقِ شعر پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کردیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے رُبع مسکوں کو ہلا ڈالا۔ کبھی چشمِ دریابار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کرّوبیوں کے کان بہرے ہوگئے۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بدگمان ہوگئے۔ جب شوق کا دریا امنڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدانِ قیامت میں اکثر گزر ہوا بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانۂ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی۔ کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے ایمان سے بیزار رہے پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی۔''[11]

اردو کے مجموعی شعری مزاج کے بارے میں حالی کا انشائی اسلوب میں تنقیدی تبصرہ ایک الگ بحث کا متقاضی ہے لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مروجہ شاعری سے کس قدر بیزار تھے۔ حالی نے بھی اردو غزل کی شعری رسومات کو ہدفِ ملامت بنایا اور اردو غزل کی جو فردِ جرم تیار کی اس کی رو سے اصلاحی اور مقصدی شاعری کے سامنے حسن و عشق کی کیفیات سے معمور شاعری بے وقعت نظر آئی اور ماضی قریب اور بعید کی شاعری پر ان کی نظر کہیں نہیں ٹھہرتی۔ گرچہ آزاد اور حالی جس طرز کی شاعری کو فروغ دینا چاہتے تھے ماضی قریب میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری اس کی زندہ مثال تھی۔ یہاں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حالی کے سامنے نظیر کا کلام نہیں تھا۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے الفاظ کا زیادہ استعمال کرنے والے

آزاد اور حالی کی تحریروں اور تقریروں میں نظیریا اس طرز کے دوسرے شعرا کا تذکرہ غالباً اس لیے نہیں ملتا کہ حالی اور آزاد ان شعرا کی انفرادی کوششوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے جدید نظم کو ایک تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے۔ یہاں ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آزاد اور حالی محض محکمۂ تعلیم کے تحت ہونے والے مشاعرے سے ہی وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کی وابستگی فکری طور پر سرسید تحریک سے بھی بہت گہری تھی۔ بالخصوص حالی سرسید سے بہت متاثر تھے اور ان سے بڑی قربت بھی تھی۔ حالی کی شاعری سرسید کے اصلاحی مشن کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئی۔ سرسید تحریک جن مقاصد کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی تھی نظم کا یہ بدلا ہوا انداز اور لاہور کا موضوعاتی مشاعرہ اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔

شاعروں میں نظیر اکبرآبادی کو سرفہرست رکھا ہے۔ بقول حالی:

اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں مگر ان کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔''[12]

یہاں حالی نظیر کی شاعری میں زیادہ لفظیات کے استعمال کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن جیتی جاگتی زندگی کی حقیقتوں سے بھری پڑی ان کی شاعری اور ان کے منفرد اور عوامی موضوعات پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ جبکہ نظیر کی بیشتر شاعری انھیں اوصاف سے مزین نظر آتی ہے جن اوصاف سے معمور شاعری کو آزاد اور حالی رائج کرنا چاہتے تھے۔ آزاد اور حالی کی تحریروں اور تقریروں میں نظیر یا اس طرز کے دوسرے شعرا کا تذکرہ غالباً اس لیے نہیں ملتا کہ حالی اور آزاد ان شعرا کی انفرادی کوششوں سے پہلوتہی کرتے ہوئے جدید نظم کو ایک تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے۔ یہاں ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آزاد اور حالی محض محکمۂ تعلیم کے تحت ہونے والے مشاعرے سے ہی وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کی وابستگی فکری طور پر سرسید تحریک سے بھی بہت گہری تھی۔ بالخصوص حالی سرسید سے بہت متاثر تھے اور ان سے بڑی قربت بھی تھی۔ حالی کی شاعری سرسید کے اصلاحی مشن کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئی۔ سرسید تحریک جن مقاصد کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی تھی نظم کا یہ بدلا ہوا انداز اور لاہور کا موضوعاتی مشاعرہ اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ سرسید کو انجمن پنجاب کے مشاعرے کی نظموں میں نیچرل شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ سرسید فروری 1875 کے 'تہذیب الاخلاق' کے ایک مضمون علم انشا اور اردو نظم میں لکھتے ہیں:

''ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہمارے زمانے کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں، واسوختوں، مدحیہ قصیدوں، ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع اور تلاش مضمون کے لیے نہایت مفید ہیں مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی کچھ تھا۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں نیچر سے علاقہ رکھتے نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گو ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا ہے۔ اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں 1874 کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا یادگار رہے گا۔''[13]

سرسید کی نظر میں اس مشاعرے سے نیچرل پوئٹری کا آغاز ہوا جس سے انھیں نظم میں تبدیلی اور وسعت کی امید نظر آئی۔ ابھی جبکہ اردو شاعری میں جدید نظم کا رواج عام نہیں ہوا تھا، سرسید نے اردو شاعری کے مضامین اور ردیف و قافیہ کی پابندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سرسید بے قافیہ نظموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس مشاعرے سے جس طرز کی نظم نگاری کا آغاز ہوا سرسید اس سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں انھیں نیچرل شاعری کا پرتو نظر آتا ہے۔ فروری 1875 کے 'تہذیب الاخلاق' کے مضمون علم انشا اور اردو نظم' میں لکھتے ہیں:

''لیفٹیننٹ گورنر پنجاب بہادر اور مسٹر ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اس مشاعرے کے قائم ہونے میں بڑی توجہ کی ہے جس کی شکرگزاری ہماری قوم پر واجب ہے۔ ہماری قوم کے لائق اور فائق لوگوں نے بھی اس پر توجہ کی ہے مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرے کے بقا اور قیام کے سلسلے میں سب سے زیادہ ہمت صرف کی ہے ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکتِ الفاظ اور طرزِ ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں ان کی مثنوی

'خواب امن' جو 'آفتاب پنجاب' میں چھپی ہے ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے، مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی 'حب الوطن' اور مثنوی 'مناظرہ رحم و انصاف' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے وہ درحقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے، وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں زبان میں آمد میں الفاظ کی ترکیب میں سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم بڑھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہمسر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے مگر ان تینوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ اگر ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھائے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی۔"14

سرسید نہ صرف نیچرل شاعری کو فروغ دینا چاہتے تھے بلکہ مغربی شعراء مثلاً ملٹن اور شیکسپیئر وغیرہ کی شاعری سے استفادے پر زور دیتے تھے۔ اس ضمن میں نذیر احمد کے خیالات کچھ کم اہم نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد اپنے معاصرین کے بہ نسبت زیادہ پر زور انداز میں انگریزی سے استفادے کی تلقین کرتے ہیں۔ نذیر مغربی علوم وفنون کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسروں کے علوم وفنون سے استفادہ کو ایک ترقی یافتہ قوم کی ترقی کے اسباب میں شامل کرتے ہیں۔ ایشیائی قومیں مغرب کے مقابلے میں پس ماندہ ہیں۔ ان کی پس ماندگی کے اسباب میں نذیر ایشیائی قوم کے لٹریچر کو مانتے ہیں۔ آزاد کی طرح نذیر احمد بھی انگریزی زبان کو علوم مفیدہ کی کلید تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کے بغیر ایشیائی قوموں کی ترقی ممکن نہیں۔ ایشیائی شاعری سے متعلق نذیر احمد کے خیالات ملاحظہ فرمائیے:

"میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ علوم قدیمہ کو مسلمانوں کی ترقی کا سدراہ جانتا ہوں اور علوم قدیمہ میں سے بھی خاص کر لٹریچر کا سخت مخالف ہوں۔ مسلمانوں میں ایز اے نیشن (بحیثیت قومی) جتنی خرابیاں ہیں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا۔ یہ لٹریچر واقعات اور موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا یہ لٹریچر متوہمات اور مفروضات بے اصل کو فیکٹس (واقعات) بناتا ہے۔ یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا ہے۔

اگرچہ بڑی عمر میں میں نے بوڑھے طوطے کی طرح آپ ہی آپ تھوڑی سی انگریزی بھی پڑھ لی تھی لیکن میری طبیعت میں ایشیائی تعلیم کا رنگ رچ چکا تھا۔ انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجھ کو اپنے یہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر مذاق وہی کا وہی رہا۔ اب بھی اگر کوئی برجستہ شعر سن پاتا ہوں چاہے اس میں کتنا ہی مبالغہ خلاف قیاس کیوں نہ ہو بے اختیار بھڑک اٹھتا ہوں۔ یہ خرابی کم بخت فارسی کی پھیلائی ہوئی ہے۔"15

"شاعری جس سے زیادہ موثر کوئی عمل نہیں ایشیائی ملکوں میں مدتوں سے ایسی بری طرح سے اس کا استعمال کیا جا رہا ہے کہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں لٹریچر کی خرابی کو بھی ایشیائی قوموں کے تنزل میں بڑا دخل ہے۔ جھوٹ اور مبالغے اور بے اصل خیالی باتوں پر تو اس کی بنیاد ہے اور مضامین جن سے شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں اکثر گندے تو ایسی شاعری قومی اخلاق کو بگاڑا ہی چاہیے۔"16

نذیر احمد نے انجمن حمایت اسلام، طبیہ کالج دہلی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں مختلف موضوعات پر لکچر دیے اور اس عہد کا معاشرہ جن مسائل سے دوچار تھا نذیر نے ان مسائل کو زیر بحث لانے کی کوشش کی۔ بالخصوص تعلیمی مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ شاعری سے متعلق نذیر احمد کے خیالات اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ سخت نظر آتے ہیں۔ ایشیائی شاعری کے باب میں نذیر احمد کے خیالات نہایت توجہ طلب ہیں۔ نذیر احمد واضح طور پر انگریزی طریقۂ تعلیم اور انگریزی شعر و ادب کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد ایشیائی شاعری کو ایشیائی قوموں کی تنزلی کا سبب مانتے ہیں۔ ایشیائی شاعری کو مذموم قرار دے کر نذیر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں لیکن آزاد نے اپنے لکچر میں اپنے ادبی سرمائے کو یکسر مسترد نہیں کیا۔ ان کا اصرار اس پر تھا کہ روایتی شاعری سے آگے بڑھ کر مغربی شاعری سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ نظم جدید کی تحریک کا آغاز 1874 کے موضوعاتی مشاعرے سے ہوا۔ گرچہ اس مشاعرے کا سلسلہ سال بھر بھی قائم نہ رہ سکا۔ لیکن جدید نظم نگاری کی بنیاد اسی مشاعرے سے قائم ہوئی۔ سرسید قوم کی اصلاح کے لیے جس طرح کی شاعری کی ضرورت محسوس کر رہے تھے وہ نظم جدید کی تحریک سے پوری ہوتی نظر آئی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی فکری اور عملی کوششوں نے جدید نظم نگاری کو جلا بخشی۔ نظم کی یہ تحریک سرسید کی اصلاحی تحریک کے لیے نہایت موزوں وسیلہ ثابت ہوئی۔ آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی اور نذیر احمد نے جدید نظم نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ گرچہ اس عہد کے دوسرے شاعروں نے بھی نظم میں ہیئت و اسلوب کے تجربے کیے۔ لیکن جدید نظم نگاری کو فروغ دینے میں سرسید تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔

حواشی

1. نظم آزاد: محمد حسین آزاد، لاہور، 1926، ص 10
2. ایضاً، ص 11-12
3. ایضاً، ص 19-20
4. آزاد معاصرین کی نظر میں: ڈاکٹر محمد صادق بحوالہ محمد حسین آزاد، جلد (اول)، ڈاکٹر اسلم فرخی: انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1965، ص 236-237
5. ایضاً، ص 238
6. ایضاً، ص 238-239
7. ایضاً، ص 236
8. نظم آزاد: محمد حسین آزاد، لاہور، 1926، ص 26-27
9. ایضاً، ص 28
10. مقالات حالی: حصہ اول، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1982، ص 266-267
11. مقدمہ مسدس حالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی 2004، ص 3-4
12. مقدمہ شعر و شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1993، ص 192
13. بحوالہ محمد حسین آزاد جلد اول: ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی، 1965، ص 555-56
14. ایضاً، ص 280-283
15. لکچروں کا مجموعہ جلد اول، مرتب: مولوی بشیر الدین احمد، مفید عام، اسٹیم پریس، آگرہ، 1918، ص 59-60
16. لکچروں کا مجموعہ جلد دوم، مرتب: مولوی بشیر الدین احمد، مفید عام، اسٹیم پریس، آگرہ، 1918، ص 314

■

Dr. Shah Alam
Dept of Urdu,
Zakir Husain Delhi College (University of Delhi)
J N Marg, New Delhi - 110002
Mob.:09868669498
Email.:salamzhc@yahoo.com

صابر علی سیوانی

شیفتہ
سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال

محمد مصطفیٰ خان شیفتہ دہلی کے ان شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جو غالب کے شاگردوں میں سرفہرست تھے جنھیں حالی جیسے بہترین شاعر اور اردو کے پہلے نقاد کا استاد ہونے کا شرف حاصل رہا۔ شیفتہ کو جاگیرداری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے دادا ولی داد خان فرخ سیر کے عہد میں بنگشات (کوہاٹ، علاقہ سرحد) سے ہندوستان آئے اور فرخ آباد میں مقیم ہوگئے۔ شیفتہ کے والد نواب مرتضیٰ خان مہاراجہ جسونت رائے ہلکر کے لشکر میں ملازم تھے۔ انھیں ایک پلٹن کی کمان سونپ دی گئی۔ 1812 میں لارڈ لیک نے نواب مرتضیٰ خان کو تین لاکھ روپے کی جاگیر میں ہوڈل اور پلول کا علاقہ جو گڑگاؤں میں آتا تھا، ان کی زندگی بھر کے لیے انھیں دے دیا۔ نواب مرتضیٰ خان اپنے بیٹے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے لیے جہانگیر آباد (بلند شہر یوپی) کا علاقہ خرید لیا۔ اس طرح شیفتہ کو وراثت میں ایک بڑی دولت حاصل ہوگئی جس کے باعث انھیں آسودہ حالی کی زندگی میسر آئی۔ ویسے بھی شیفتہ کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن جب جہانگیر آباد کا پورا علاقہ ان کے تصرف میں آگیا تو وہ اپنے عہد میں روسا میں شمار کیے جانے لگے۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ 1806 میں دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ جس طرح عام رئیسوں کی زندگی عیش و آرام اور سکون و اطمینان سے گزرتی ہے اسی طرح شیفتہ کی زندگی کا ابتدائی دور عیش و طرب اور عشق و مستی میں گزرا، لیکن بہت جلد وہ اس راہ سے الگ ہوگئے اور مے و میخانہ سے دوری اختیار کرلی۔ خدا نے انھیں توفیق دی اور وہ 1839 میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد نہایت پاکباز اور نیک طینت بن گئے۔

شیفتہ کی تعلیم و تربیت نامور اساتذہ کے زیر سرپرستی ہوئی۔ عربی، فارسی اور علوم مروجہ سے آراستہ ہوئے۔ نوعمری میں ہی مشق سخن کا آغاز کیا اور بہت جلد فن کی پختگی کو پہنچ گئے۔ پہلے مومن خاں مومن سے شرف تلمذ حاصل کیا اور پھر مرزا اسداللہ خاں غالب کی شاگردی اختیار کی۔ مصطفیٰ خان فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے اور اردو میں شیفتہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔ مرزا غالب جیسا سخنوراُن کے علم و فضل کا قائل تھا۔ شیفتہ کو جن اہل علم و فضل کی صحبت میسر آئی، ان میں ذوق، نصیر، امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین خان آزردہ، حکیم آغا جان عیش، میر حسین تسکین، نواب ضیاء الدین خاں نیر، حکیم احسن اللہ خان، غلام علی وحشت، مومن خان مومن اور اسداللہ خان غالب جیسے اکابر ادب شامل ہیں۔ مرزا غالب نے متعدد بار شیفتہ کے اعلیٰ شعری ذوق اور ادبی بصیرت کا اعتراف کیا ہے۔ غالب نے اپنے ایک فارسی شعر میں ان کی علمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

غالب، ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاش معنی و مضموں نہ کردہ کس

خواجہ الطاف حسین حالی نے 'یادگار غالب' میں شیفتہ کے مذاق شعر و سخن کے حوالے سے لکھا ہے:

''شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، ویسا بہت کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق شعر و سخن کو حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔''

(یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، ص 115)

شیفتہ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے سیدھے سادے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہنے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری مبالغہ آرائی سے پاک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جذبے کی صداقت لفظوں کی ثقالت میں کھوئی نظر نہیں آتی ہے۔ سادگی بیان ہی ان کی شاعری کا اہم وصف ہے۔ شگفتہ معنی اور خوش انداز الفاظ اور صاف ستھرے پیرائے میں شعر کہنا انھیں اچھی طرح آتا تھا۔ سہل پسندی کے وہ قائل تھے اور لفظوں کے گورکھ دھندے سے وہ پرہیز کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، اس میں کسی طرح کی پیچیدگی کا عنصر شامل کرنا ان کے مذہب شاعری میں گناہ کے مترادف تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے انداز اور اس میں پوشیدہ معانی کے حوالے سے بڑی صفائی سے یہ بات کہی ہے کہ:

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش، انداز صاف ہو

شیفتہ کا یہ شعر ان کی شاعری کے نہج اور ان کے طرز فکر کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ شیفتہ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سہل ممتنع کی صفت سے آراستہ وہ کلام ہے جس کی وجہ سے انھیں میر کے بعد اس روایت کو آگے بڑھانے والا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سہل ممتنع میں انھوں نے صرف لفظی خانہ پری سے کام لیا ہو، بلکہ انھوں نے عام فہم لفظوں اور سیدھے سادے پیرائے میں اپنے دل کی بات کہہ کے اسے عام انسانوں کے دل کی آواز بنانے کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے شیفتہ کی سادگی بیان والی شاعری کے حوالے سے بالکل نپی تلی رائے قائم کی ہے:

''شیفتہ کی شاعری ان کے تنقیدی خیالات کے عین مطابق ہے، چنانچہ سیدھے سادے الفاظ میں دل کی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ مبالغہ نہیں کرتے۔ اس لیے جذبے کی صداقت لفظی گورکھ دھندوں سے مجروح نہیں ہوتی۔ میر کے بعد شیفتہ کی سادگی کو سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جرأت کے رنگ سے بچتے ہوئے چوماچاٹی کی شاعری سے خود کو بچائے رکھنے کی سعی ملتی ہے۔ اس کا دعویٰ خود بھی کیا:

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ
ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم
ہاں ذکرِ خد و خال اگر ہے تو خال خال''

(اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: ڈاکٹر سلیم اختر، کتابی دنیا، دہلی، 2005، ص 243)

جب شیفتہ کی شاعری میں سہل ممتنع کے حوالے سے

گفتگو کی جارہی ہے، تو ایسے میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایسے چند اشعار نقل کیے جائیں، جو سہل ممتنع کی صفت سے متصف نظر آتے ہیں اور جس انداز نے انھیں میر کے بعد سب سے بڑا شاعر بنادیا اور وہ ہے سہل ممتنع میں کہے گئے ان کے سیکڑوں اشعار۔ یہ وہ اشعار ہیں جن کے باعث شیفتہ کو اپنے عہد میں امتیازی مقام حاصل ہوا اور جس سے غالب جیسے استاد شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ملاحظہ کیجیے شیفتہ کے یہ چند اشعار:

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا
جب رقیبوں کا ستم یاد آیا — کچھ تمھارا بھی کرم یاد آیا
توسنِ ناز اٹھاتے کیوں ہو — خاک میں شہر ملاتے کیوں ہو
ناصحو یوں بھی تو مرجاتے ہیں — عشق سے مجھ کو ڈراتے کیوں ہو
آتشِ عشق کہیں بجھتی ہے — شیفتہ اشک بہاتے کیوں ہو

کرتے ہیں جور و جفا ناز و ادا کہتے ہیں
یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں
ہر شیوہ سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو
ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو
یاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
نہ خاکیوں سے تعلق نہ قدسیوں سے ربط
نہ ہم زمیں کے لیے ہیں نہ آسماں کے لیے
زہر سے الماس سے تلوار سے
مجھ کو الفت ہے انھیں دوچار سے
پھر بلا سے کوئی بیٹھے شیفتہ
اٹھ گئے جب آپ کوئے یار سے
یہ کیسا تفرقہ ہجراں نے ڈالا
کہیں کیا، ہم کہیں ہیں دل کہیں ہے
نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب
یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

ان اشعار میں سادگی بیان کے ساتھ ساتھ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کے اوصاف پنہاں نظر آتے ہیں۔ صنعتِ تضاد کے ضمن میں تضاد لفظی اور تضاد معنوی دونوں اہم صنعتیں ہیں اور ان صنعتوں کا استعمال کرکے شاعر اپنے کلام میں تاثیر اور معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی کوشش ہمیں شیفتہ کے درج بالا اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں لطف اور مصرع ثانی میں ستم، دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ 'ستم' اور دوسرے مصرع میں 'کرم' لفظ کا استعمال کرکے شاعر نے صنعت تضاد سے کام لیا ہے۔ اسی طرح پانچویں شعر میں آتش اور اشک جیسے لفظوں سے شعر میں دلکشی، معنویت

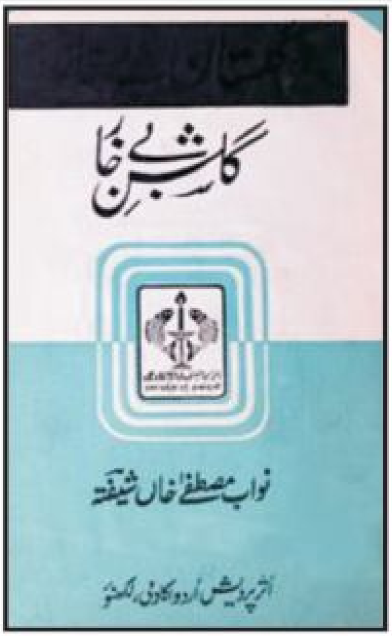

اور کشش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

آتشِ عشق کہیں بجھتی ہے
شیفتہ اشک بہاتے کیوں ہو

سہل ممتنع کے حامل اس شعر میں شیفتہ نے عشق کی آگ کی کیفیت بیان کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب عشق کی آگ عاشق کے سینے میں لگ جاتی ہے تو وہ لاکھ بجھائے نہیں بجھتی ہے۔ اس شعر میں شیفتہ نے عاشق دلگیر کی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جسے عاشق بجھانے کے لیے آنسوؤں کا سہارا لیتا ہے، لیکن عشق کی آگ اس آگ سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو پانی سے بجھ جاتی ہے۔ عشق کی آگ جب لگ جاتی ہے تو وہ تاحیات جلتی رہتی ہے، اسے اشکوں کے ذریعے نہ کم کیا جاسکتا ہے اور نہ اس آگ کے اثرات کو کسی بھی طرح سے زائل کیا جاسکتا ہے۔ شیفتہ نے مندرجہ بالا اشعار میں تکرار لفظی سے بھی کام لیا ہے اور لفظوں کے الٹ پھیر کے ذریعے بڑی معنویت پیدا کی ہے۔ مثلاً آخری شعر جس میں شیفتہ نے 'حال' اور 'حالت' لفظ کے استعمال سے شعر میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غرض یہ کہ شیفتہ کو مختلف صنعتوں کو استعمال پر قدرت حاصل تھی اور انھوں نے ان صنائع لفظی و معنوی کے استعمال سے اپنے کلام میں ندرت اور جدت پیدا کی ہے۔ کیوں کہ انھیں مومن اور غالب کی شاگردی کا جو شرف حاصل رہا اور استاد کا اثر شاگرد میں کچھ نہ کچھ تو آہی جاتا ہے جبکہ شیفتہ کی شاعری پر ان کے اساتذہ فن کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

شیفتہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلوب پر مفہوم کو فوقیت دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے چند اشعار بالکل واضح انداز میں پیش کیے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ ان کی شاعری صنعتوں سے خالی ہے، لیکن یہ صنعتیں ارادتاً یا قصداً ان کی شاعری میں داخل نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ آمد کے طور پر ان کی شاعری میں در آئی ہیں، جس کی وجہ سے ان کی شاعری معنوی اور لفظی دونوں اعتبار سے سحر انگیز ہوگئی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ شیفتہ کے ہاں نہ تو غالب کی طرح لہجے کو قصداً نامانوس بنانے کا اہتمام نظر آتا ہے اور نہ مومن کی طرح بے مثال حسی لطافت سے انھیں کوئی خاص تعلق نظر آتا ہے۔ وہ شاعری میں صنعت گری کے شائق نظر نہیں آتے کیونکہ وہ سادہ بیانی ہی کو اپنی شاعری کا اصل جوہر تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے پنی سادہ بیانی کو ہی اپنی مقبولیت کی اہم ترین وجہ گردانا ہے۔ تبھی وہ کہتے ہیں:

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے
میں سادگی سے بیاں کررہا ہوں وصف سخن
وہ ہونٹ کاٹتے ہیں اپنی نکتہ دانی سے

شیفتہ کی شاعری کے اوصاف بیان کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ نے بڑی منصفانہ رائے قائم کی ہے۔ چند جملوں میں شیفتہ کی شاعری کے محاسن و معائب کو نہایت جرأت مندی سے بیان کردیا ہے:

''اردو میں شیفتہ اپنے استاد مومن کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ ان کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ ان کے اردو اشعار بہت اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر بلند پایہ مضامین اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجے کے شعرا میں ان کا درجہ ممتاز ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ادارہ کتاب الشفا، دہلی 2000، صفحہ 192)

رام بابو سکسینہ نے اپنی تنقیدی رائے کے ذریعے شیفتہ کی شاعری کے اہم ترین خصائص اور اس میں پائی جانے والی معمولی کمیوں کی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شیفتہ کے ہاں بلند پایہ مضامین، بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات ضرور پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ انھیں میر و غالب جیسے اول درجے کے شعرا میں شمار نہیں کیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی صداقت ہے کہ ان کے ہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو صف اوّل کے شعرا میں انھیں مقام دلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیفتہ کی شاعری میں بامحاورہ زبان، پاکیزہ خیالات اور بلند پایہ مضامین کی خصوصیت سے آشنائی حاصل کرنی ہو تو ان کے درج اشعار پر نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ بامحاورہ زبان کا انداز دیکھیے:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے
پانی پانی ہوئے مرقد پہ مری آکے وہ جب
شمع کو نعش پر پروانہ کی گریاں دیکھا
اس جنبش ابرو کا گلہ ہو نہیں سکتا
دل گوشت ہے ناخن سے جدا ہو نہیں سکتا
آج ہی ٹیکا لگانے سے لگے کیا چار چاند
بے تکلف بے تکلف مہ جبیں تو کب نہ تھا
تم غیر کے قابو سے نکل آؤ تو بہتر
حسرت یہ میرے دل کی نکل جائے تو اچھا

پاکیزہ خیالات کی تابانی دیکھنی ہو تو ہمیں شیفتہ کے یہ اشعار ذہن نشیں کرنے ہوں گے جن میں تازگی، شگفتگی اور زبان کی سلاست بھی پائی جاتی ہے:

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
کیا مانگتے ہو جان بہت لوگ دے چکے
وہ بات ہم سے کہیے جو حدِ بشر نہ ہو
اِک حال خوش میں بھول گئے کائنات کو
اب ہم وہاں ہیں مطرب و ساقی جہاں نہیں
افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں
جس کو سمجھا آشنا نکلا غرض کا آشنا
دل ہے افسردہ نہایت گرمی احباب سے

شیفتہ نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں سچے جذبات اور پراثر خیالات سے لبریز ہیں۔ وہ جذبات کی خیالی تصویر نہایت خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں داخلی جوش نہیں پایا جاتا ہے، جو علامہ اقبال کا خاصہ تصور کیا جاتا ہے۔ شیفتہ کے علمی تبحر، فارسی دانی، اور شعری عناصر پر ان کی گرفت کے قائل تو مومن اور غالب بھی رہے ہیں، لیکن یہ تمام اوصاف ان کے فن کو وہ بلندی نہیں عطا کر پاتے ہیں، جس کی وجہ سے شیفتہ شعرا کی صفِ اوّل میں جگہ پا سکیں، لیکن ان کی شاعری کے محاسن سے واقعتاً یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک نہایت اہم اور نمائندہ شاعر تھے۔ شیفتہ کو زیادہ مقبولیت اور شہرت اس لیے بھی نہیں حاصل ہو سکی کہ ان کے بارے میں غالب، مومن، آتش و مصحفی کے مقابلے میں ناقدین نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کی شاعری کے جہات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش اس حد تک نہیں کی گئی ہے، جس کے وہ مستحق تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری آج بھی اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ تصور کی جاتی ہے۔ شیفتہ کی شاعری اور ان کی تنقید نگاری کے حوالے سے سید ایاز محمود نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''شیفتہ کے اعلیٰ ادبی ذوق، علمی تبحر اور شعری عناصر پر ان کی گرفت کے غالب و مومن بھی معترف رہے ہیں۔ مگر یہ لوازمات اس معجزۂ فن میں منقلب نہیں ہوتے جو شیفتہ کو شعرا کی صفِ اول میں براجمان کر سکے۔ وہ غالب و مومن اور آتش و مصحفی کی طرح صفِ اول کے شاعر نہ ہوتے ہوئے کسی طور غیر اہم شاعر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ ان نکات کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ سوقیانہ پن اور ابتذال نام کو نہیں، لہجہ صاف اور آرائش سے پاک ہے۔ شوکت الفاظ کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ رکاکتِ مضمون سے اجتناب کرتے ہیں۔ تجرید، ابہام اور غلو سے کوسوں دور ہیں۔ خیال کے ارتفاع کو مس کرنے کی شعوری کوشش نہیں کرتے ہیں۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو ان کی افتادِ طبع سے لگا نہ کھاتی ہو۔ ادق اور غیر مانوس زمینوں میں طبع آزمائی کا انھیں کوئی شوق نہیں۔ وہ عصری منظر نامے سے خود کو دور نہیں رکھتے۔ تنقید شعر ایک واضح نقطۂ نظر بن کر اس طرح ان کی شاعری میں در آیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔''

(مضمون شیفتہ کی تنقید شعر اور ان کی شاعری، سید ایاز محمود، رسالہ مخزن، مدیر ڈاکٹر تحسین فراقی، شمارہ 26، جلد 13، سال 2013، ص 118)

سید محمود ایاز نے اپنے اس مضمون میں شیفتہ کی شاعری کا نہایت ایماندارانہ انداز میں جائزہ پیش کیا ہے۔ اس اقتباس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شیفتہ کی شاعری کے محاسن و معائب کیا تھے۔ اس مختصر سی تحریر میں شیفتہ کی شاعری کے بارے میں ایک پورے مقالے کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے فنی ارتفاع اور شعری وسعت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ شیفتہ نے تخیل کی بلندی کی معراج حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، ہاں ان کی تنقیدی بصیرت ان کے معاصرین میں سب پر بھاری ضرور نظر آتی ہے۔ ان کی انشاپردازی بھی اپنی جگہ مسلم ہے جس کا ثبوت فارسی میں تحریر کردہ ان کا 'سفر نامۂ حجاز' ہے۔

شیفتہ کا اسلوب اور شعری مذاق بالکل روایتی ہے، کیونکہ ان کی شاعری میں مضامین وہی قدیم ہیں، جو کلاسیکی شعرا کے ہاں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کے شعری لہجے کو کسی بھی طرح دقیانوسیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ شاعری میں جن جذباتی وفور کی جلوہ سامانی ہمیں اس عہد کے بڑے اور نمائندہ شعرا میں دیکھنے کو ملتی ہے، اس صفت سے شیفتہ کی شاعری

شیفتہ نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں. ان کی غزلیں سچے جذبات اور پراثر خیالات سے لبریز ہیں. وہ جذبات کی خیالی تصویر نہایت خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں. ان کی شاعری میں داخلی جوش نہیں پایا جاتا ہے ، جو علامہ اقبال کا خاصہ تصور کیا جاتا ہے.

خالی ہے۔ بقول سید محمود ایاز ''ایک حساس اور دردمند شخص کی طرح شیفتہ کا بھی دل بھر آتا ہے، مگر یہ تجربہ جب شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے تو وہ محسوساتی سے زیادہ زورِ بیان اور روایت سے پاسداری کی دلیل نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

(ایضاً، ص 119)

مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ایسے متعدد اشعار ہیں جو ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مگر عام طور پر ان اشعار کے خالق سے عوام و خواص ناواقف ہیں۔ شعر کا ضرب المثل بن جانا یا کسی شاعر کے شعر کے ایک مصرع کو ضرب المثل کے طور پر زبان زدِ خاص و عام ہونا، اس کی مقبولیت کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں اشعار یا مصرعوں کا استعمال کر کے لوگ اپنی بات میں وزن اور ایک خاص تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح مضمون نگار بھی اپنی تحریروں کو پرکشش اور بااثر بنانے کے لیے بھی ان ضرب المثل اشعار یا مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں۔ یہاں شیفتہ کے چند ایسے ہی اشعار نقل کیے جا رہے ہیں جنھیں عوام و خواص میں زبردست مقبولیت حاصل ہے اور جس کا اکثر و بیشتر مختلف مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ شیفتہ کا ایک نہایت ہی مشہور مصرع جو بے پناہ مقبول ہے، لیکن اس کے مصرعِ اولی سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہ شعر یہ ہے:

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اس شعر کا مصرعِ ثانی کافی مشہور ہے جسے عام طور پر کسی کی بدنامی کی وجہ سے حاصل شہرت کے بارے میں طنزیہ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن مصرعِ اولیٰ کا استعمال شاذ و نادر ہوتا ہے۔ شیفتہ کا ایک اور بہت ہی مشہور شعر ہے جس میں صنعتِ تلمیح کا استعمال ہوا ہے اور شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مبالغے کو انتہا تک لے جانا درست نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حقیقت بیانی

کے لیے بس انصاف پسندانہ رویہ اپنایا جانا چاہیے:

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

عشق و محبت کے حوالے سے ہزاروں اشعار کہے گئے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے کلاسیکی شعرا کے بہت سے اشعار کو شہرت حاصل ہے، جس میں جگر مرادآبادی کا وہ شعر تو سب سے زیادہ مشہور ہے جس میں عشق کو نہایت مشکل شغل قرار دیا ہے اور اسے آگ کا دریا سے تعبیر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ عاشق کو اس آگ کے دریا میں ڈوب کر اپنی زندگی کو خطرات میں ڈالنا پڑتا ہے:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

لیکن شیفتہ نے یہی بات کچھ دوسرے ڈھنگ سے کہی ہے۔ شیفتہ نے عشق کو بس سینے کی آگ سے تعبیر کیا ہے اور اس کو اس قدر شدت آمیزی کا لبادہ نہیں پہنایا ہے، جس قدر جگر کے مذکورہ شعر میں عشق کے شغل کو نہایت مشکل عمل قرار دیا گیا ہے۔ شیفتہ نے محبت کو سینے کی اس آگ سے تعبیر کیا ہے، جو ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ شیفتہ کہتے ہیں:

شاید اس کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

جو لوگ اپنی پاک دامنی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور اپنے عیوب و نقائص سے لاعلم و بے پروا ہوتے ہیں، انھیں بس خود کو نہایت عابد، متقی، پرہیزگار اور اللہ والا بتانے کی ہی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی ذات کتنے عیوب کا پیکر ہے۔ اسی بات کو شیفتہ کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنی پاک دامنی پر بہ نظر خود نازاں ہوتے ہیں اور انھیں اپنا دامن بھی دیکھنا چاہیے جو گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے۔ شیفتہ کا یہ شعر بھی ان کے دیگر متعدد ضرب المثل اشعار کی طرح شہرت رکھتا ہے۔ شیفتہ کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

شیفتہ کا ایک مصرع عام طور پر اس وقت اہلِ قلم استعمال کرتے ہیں جب وہ کسی کے بارے میں یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ فلاں شخص میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں۔ لیکن وہ اس شخص کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے داستان کو زیادہ پراثر بنانے کی خاطر کچھ مبالغہ آمیزی کا عنصر بھی شامل کر دیتے ہیں۔ شیفتہ کے اس شعر کا مصرعِ ثانی نہایت مشہور ہے، جس میں شیفتہ نے محبت کی داستان بیان کرنے والوں کی تخلیقی اُپج کی بات کی ہے:

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم، زیبِ داستاں کے لیے

شیفتہ کے یہاں ایسے ضرب المثل اشعار کی تعداد کہیں زیادہ ہے، جو صفِ دوم کے شعرا کے ہاں کم پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے اخلاق و تصوف کے مضامین کو بھی شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے اشعار بھی ان کے ہاں پائے جاتے ہیں جو تخیل کی بلندی پر تو نہیں پہنچ پاتے ہیں، لیکن ان میں اتنی معنویت اور تہہ داری تو ضرور پائی جاتی ہے، جس کے باعث وہ اشعار لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہ سکیں۔ کچھ ایسے ہی اشعار یہاں پیش ہیں جو ضرب المثل بن کر عوام و خواص کے حافظے میں محفوظ ہیں:

اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

نہ خاکیوں سے تعلق نہ قدسیوں سے ربط
نہ ہم زمیں کے لیے ہیں، نہ آسماں کے لیے

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے، تو جادو نگاہ میں

دھوکہ مجھی کو صرف نہیں میلِ یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

یاروں کو رنج ہو یہ گوارہ نہیں مجھے
ایسی جگہ مروں، کہ کسی کو خبر نہ ہو

اڑتی سی شیفتہ کی خبر کچھ سنی ہے آج
لیکن خدا کرے، یہ خبر معتبر نہ ہو

یہ وہ اشعار ہیں جس کی وجہ سے شیفتہ کو کسی حد تک مقبولیت حاصل ہو سکی، ورنہ ان کی شہرت کی اصل وجہ تو ان کا وہ فقید المثال کارنامہ ہے جسے ادبی دنیا میں تذکرہ 'گلشن بے خار' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھیں شاعر سے زیادہ ناقد کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ شیفتہ کی ناقدانہ صلاحیتوں کا تذکرہ نہ صرف بڑے بڑے ناقدین اور محققین نے کیا ہے، بلکہ ان کی انتقادی بصیرت کا اعتراف نامور تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔ شیفتہ کے 'گلشن بے خار' کی صورت میں پہلی بار ادبی دنیا کو ان کے انتقادی زاویۂ نگاہ کا علم ہوا۔ یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے، جس میں روایتی تذکرہ نگاری کے نہج سے ہٹ کر نپی تلی تنقیدی رائے دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں شعرا کی مداحی تو ضرور ہے تو ان کی شاعری کے سقم اور اس میں پائی جانے والی سطحی جذباتیت کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ اس تذکرے میں میر، سودا، انشا، جرأت، شاہ حاتم، ذوق، آتش، مصحفی، ناسخ، غالب اور نظیر وغیرہ کی شاعری پر دوٹوک رائے ملتی ہے۔ 'گلشن بے خار' میں شیفتہ کے اسلوب کو انشاپردازی کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ رام بابو سکسینہ شیفتہ کی ناقدانہ بصیرت اور ان کی انصاف پسندی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو فارسی شاعری کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ 'گلشن بے خار' ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، نئی دہلی 2000، ص 191)

'گلشنِ بے خار' کا برملا اعتراف کیا گیا ہے کہ اردو شعرا کے فنی کمالات پر ان کی رائے عام طور پر غیر جانبدار ہے۔ لیکن نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر ان کی رائے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ نظیر کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''اشعار بسیار دارد کہ زبان سوقین جاریست و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا نشاید ش شمرد۔'' (گلشن بے خار، مصطفیٰ خاں شیفتہ، مجلس ترقی ادب لاہور، 1973، ص 623) الغرض شیفتہ کا تذکرہ بعض معمولی کوتاہیوں اور اسقام کے باوجود ایک تاریخ ساز تنقیدی کارنامہ ہے جو اس عہد کے تذکروں میں انفرادی مقام رکھتا ہے۔

مصطفیٰ خان شیفتہ کی شاعری کے محاسن اور فنی کمالات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ ناقدین، ادبا، شعرا اور محققین نے شیفتہ کی تذکرہ نگاری پر اپنی صلاحیتیں زیادہ صرف کی ہیں، مگر ان کی شاعری پر اتنی توجہ نہیں دی ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شیفتہ بھلے ہی اعلیٰ پائے کے شاعر نہ ہوں، لیکن ان کی تخلیقات میں ایسے سیکڑوں اشعار موجود ہیں، جو انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

ماخذ و منابع

1. تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ، نئی دہلی 2000
2. اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: ڈاکٹر سلیم اختر، نئی دہلی 2005
3. اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، نئی دہلی 1997
4. دیوان شیفتہ (مصطفیٰ خاں شیفتہ): اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1985
5. انتخاب کلام مصطفیٰ خاں شیفتہ، مرتب: خواجہ ذکی احمد، دہلی 1959
6. مضمون، شیفتہ کی تنقید شعر اور ان کی شاعری: سید ایاز محمود، مخزن، لاہور، پاکستان، جلد 13، 2013

■

Sabir Ali Siwani
Ho No-9-4-87/C/7, First Floor
Behind Moghal Residency, Owaisy Colony
Toli Chowki, Hyderabad - 500008(TS)
Mob.:09989796088
Email.:mdsabirali70@gmail.com

مظفر حنفی

حقّی حزیں دہلوی

حقّی حزیں دہلوی (پ۔1920۔م 1970) کے انتقال کوتقریباً پینتالیس برس ہوگئے۔اس مدت میں اردو شاعری کا مزاج بہت کچھ بدل گیاہےاوراب کلاسیکی طرز کی شاعری کے قدردان بہت کم رہ گئے ہیں۔بے شک میروغالب کے کلام سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اب بھی موجود ہیں لیکن متاخرین مثلاً فانی اصغر،حسؔ کہ جگر جیسے شاعروں کے بھی اشعاراب بہت کم دہرائے جاتے ہیں کہ ان کے اورعہدرواں کے درمیان ترقی پسند تحریک اورجدیدیت کے رجحان کی موٹی موٹی دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں۔شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مقتدرخانوادے سے تعلق رکھنے والے توفیق الحق حقّی نے اردو،عربی اور فارسی زبانوں میں بی اےاورایم اے کے مساوی اعلیٰ اسناد حاصل کی اوراوائل عمری سے ہی شعرگوئی کا عمل شروع کردیاتھا۔ جگر مرادآبادی جیسے فنکاروں کی صحبتیں اٹھائیں۔شکیل بدایونی، روش صدیقی، حفیظ میرٹھی جیسے نامور شاعروں سے قریبی تعلقات رہے، مشاعرے لوٹے، اپنے زمانے کے مقبول عام رسالوں جیسے کہ کارواں، نکہت، شمع، آجکل، کلیم، معیار، بیسویں صدی وغیرہ میں ان کا کلام شائع ہوتارہااوراس جہان فانی میں صرف نصف صدی گزارکراللہ کو پیارے ہوگئے۔ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ معیار ومقدار ہردواعتبار سے حقی حزیں کم از کم شکیل بدایونی اور روش صدیقی کی قامت کے شاعرتھے۔جانے وہ کون سے عوامل تھے جن کے تحت دوران حیات ان کا ایک بھی شعری مجموعہ منظرعام پرنہیں آیا حالانکہ وہ ایک آدھ مجموعے کے نہیں بلکہ کلیات کے مستحق تھے۔ چار پانچ دہائیوں کی گرد میں تقریباً گمشدہ ان کی شاعری توجہ کی مستحق ہے۔

حزیں کلاسیکی روایتوں کے پاسدار ایک ہمہ جہت شاعر تھے۔'زمزمے' میں شامل ان کے قصائد، نعتیں، سلام، منقبتیں متعدد مرثیے اوردیگر مذہبی نظمیں شہادت فراہم کرتی ہیں کہ موصوف ہرصنف سخن میں شعر کہنے پر قادر تھے۔ بیشترمدحیہ قصیدوں میں حزیں نے قصیدے کے متعینہ اجزائے ترکیبی (تشبیب، گریز، مدح اورعرض مدعاودعاوغیرہ) کا التزام کیاہے۔ان کی تشبیب بطورخاص ندرت اورنزاکت خیال کی حامل ہوتی ہے۔مثالیں دیکھیے:

اگرذوق تماشاہے تواے چشم تماشا بیں
سیہ خانے میں دل کے چاہیے اک شمع ایمانی

(قصیدہ درمدح حضرت عباسؑ)

مقام صدق وصفا سے گریز کیا اے دل
یہ راہ وہ ہے نہیں جس میں خطرۂ رہزن

(قصیدہ درمدح امام حسینؑ)

رسول اکرمؐ کی شان میں نعتوں کے علاوہ انھوں نے حضرت امام حسینؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ، حضرت عباس علمدارؑ کی شان میں کئی قصیدے اورسلاموں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔حضرت علیؑ کی شان میں منقبت بھی لکھی ہے اوران میں ہرجگہ سلاست وفصاحت کی جلوہ فرمائی نظرآتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ ایسے

شخصیات

مقامات پر جہاں سودا اور غالب جیسے استاد اپنے قصیدے میں شریعت کی حدیں پھاند گئے ہیں (حضرت علیؓ سے متعلق قصائد) وہاں حقی حزیں وفورعقیدت کا بھرپور اظہار کرنے کے علی الرغم خدا، رسولؐ، خلیفۃ المسلمین اور امام کے مراتب کا پورالحاظ رکھتے ہیں:

عجب کیا ہے جو ہم پر بھی نگاہ لطف ہو جائے
سنا ہے وسعت کونین ان کے زیر داماں ہے

جیسا ایک آدھ شعر غالبًا موصوف نے اپنی تخلیق کو نظر بد سے بچانے کے لیے شامل کرلیا ہے۔

حقی حزیں نے نظمیں بھی جم کرلکھی ہیں۔'زمزمے' میں ان کی لگ بھگ چالیس طویل ومختصر نظمیں پائی جاتی ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ یہ نظمیں اس زمانے کی زائیدہ ہیں جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی آندھی چل رہی تھی اور بعدازاں جدیدیت کے رجحان نے اتھل پتھل مچائی جس کے نتیجے میں روایتی پابند نظم کے بڑے بڑے تناور درخت بھی زمیں بوس ہوگئے اوراحمد ندیم قاسمی اور جذبی سے لے کر ساغر نظامی تک آزاد نظمیں کہنے لگے۔ نیز ساقی فاروقی، احمد ہمیش، عین رشید وغیرہ نے نثری نظموں میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے۔ ایسے میں جوش ملیح آبادی اور شاد عارفی جیسے معدودے چند اہم شعرا کی مانند حقی حزیں نے پابند نظم کی چھتنار روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور ایک بھی آزاد نظم نہیں لکھی۔ حتیٰ کہ معرا نظم بھی نہیں۔ حکمائے ادب نے قافیے، ردیف، اور دیگر ہیئتوں کی پابندیوں کو خیال کے ارتباط اور اظہار مدعا کی راہ میں رکاوٹیں قرار دے کر نظم معرا پھر آزاد نظم اور حال ہی میں نثری نظموں کے لیے جواز پیدا کیا ہے۔ حقی حزیں نے ہیئت کی حصار بندیوں کو کم سے کم کرنے کے لیے اپنی بیش ازبیش نظمیں مثنوی کے فارم میں تخلیق کی ہیں (مولانا حالی نے مثنوی کو'بکارآمد صنفِ سخن' یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا) حزیں کی نو دس نظمیں دو تین یا چار ہم قافیہ وہم ردیف مصرعوں پر ایک یا دو مصرعوں کے ٹیپ کے بند لگا کر مکمل کی گئی ہیں۔ تین چار نظمیں غزلوں کی ہیئت میں ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف نے پانچ چھ تعزیتی نظمیں (نوحۂ جگر، یادرفتگاں، آہ ندرت میرٹھی، روح غالب سے خطاب وغیرہ) بھی غزل کی ہیئت میں ہی قلمبند کی ہیں۔ البتہ ایک تعزیتی نظم 'آہ شکیل' مثنوی کے فارم میں پائی جاتی ہے۔ ہیئت کی کشادگی اور قادرالکلامی کی آمیزش نے حقی کی اکثر عشقیہ نظموں میں گہرے میدانی دریا کی سی مدھم روانی پیدا کردی ہے۔ ایسے دریا کی روانی جس میں بالائی سطح پرخروش وجوش سے عاری سکوت وسکون کا التباس ہوتا ہے لیکن زیر آب طوفان رواں دواں رہتا ہے۔

ہیئت سے ہٹ کر جہاں تک ان نظموں کے فکری افق اور موضوعاتی دائروں کا تعلق ہے۔ شاعر نے سختی سے

عربی ، فارسی ، ھندی اور اردو جیسی باھمی رشتہ رکھنے والی زبانوں میں درک رکھنے والے حقّی حزیں کو نازک سے نازک جذبے اورپیچیدہ ترین خیال کی ترجمانی کرنے میں کوئی دشواری محسوس نھیں ھوتی۔ ان کی نظموں میں خوبصورت اور نادرترکیبیں نگینوں کی طرح جڑی ھوئی ھیں۔ مذاق خلش، فتنۂ صبح قیامت، مضراب نگاہ ناز، نگھہ حسن بداماں، جیسی تراکیب سے کلام حقی حزیں جگمگاتا ھے۔ چست قوافی وردیف اوردرست زبان ان کے بنیادی وصف ھیں۔

اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ اس کے کلام میں مکروہات زمانہ اور آلائش روزگار کو کم سے کم جگہ ملے۔ دیوالی کی رات تخلیق شعر، بے کیف عبادت، گرونانک، میرے نغمے اور شاعر کا پیغام، جیسی چند نظموں کو چھوڑ کر جن میں کچھ آلام روزگار اور کچھ اپنے فنی کمالات کا بیان ہے، بقیہ تمام نظمیں حسن وعشق کے موضوعات، ہجر ووصال کے بیانات اور واردات قلب کے اظہار کے لیے مختص کی گئی ہیں اور شاعر کو عہد حاضر کے بیشتر شاعروں جیسی سماجی مقصدیت اورعصری حسیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی، آج کی رات، سرودمستانہ، برسات کی راتیں، جان حیات وغیرہ میں حقی حزیں نے محبت کی سرشاری، والہانہ کیفیات اور عشق میں کامیابی کے رجائی نغمے الاپے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری انبساط ونشاط سے ہمکنار ہوتا ہے تو'عید'اور محرومی دید، معذرت، محبت اور آشوب محبت، یاد ماضی جیسی نظموں میں حقی حزیں نے ہجر وفراق کی حزنیہ کیفیات کو کامیابی کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں کسک پیدا ہو جاتی ہے۔

عربی، فارسی، ہندی اور اردو جیسی باہمی رشتہ رکھنے والی زبانوں میں درک رکھنے والے حقّی حزیں کو نازک سے نازک جذبے اور پیچیدہ ترین خیال کی ترجمانی کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں میں خوبصورت اور نادر ترکیبیں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ مذاق خلش، فتنۂ صبح قیامت، مضراب نگاہ ناز، نگہہ حسن بداماں، جیسی تراکیب سے کلام حقی حزیں جگمگاتا ہے۔ چست قوافی وردیف اور درست زبان ان کے بنیادی وصف ہیں۔

ایک اور انوکھی بات میں نے حقی کی عشقیہ نظموں میں یہ محسوس کی کہ ہر چند متعدد نظموں میں ان کا لہجہ رجائی ہے اور عشق میں ان کی سرخروئی کی شہادت دیتا ہے لیکن ان نظموں میں محاکات اور معاملہ بندی کو بہت کم جگہ ملی ہے۔ اسی طرح حزنیہ کیفیات کی ترجمان اور ہجر کی صعوبتوں کے بیانات پر مشتمل نظموں میں شاعر کا محبوب بے اعتنائی، بے وفائی اور بے رخی کے طعنوں سے بہت کم نوازا گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں حقی حزیں کسی صنف سخن میں بند نہ تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں قطعات ورباعیات کا بھی وافر سرمایہ موجود ہے۔ رباعی کوزے میں سمندر سمو کر پیش کرنے جیسا عمل ہے۔ چار مصرعوں میں ایک وسیع خیال کو اپنی تمام تر جمالیاتی رعنائیوں اور فلسفیانہ پہلوؤں کے ساتھ سمیٹ لینا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فن پر زبردست عبور اور زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آشنائی نہ ہو۔ حزیں ان تمام اوصاف سے متصف تھے جس کا انھیں بخوبی احساس بھی تھا۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

تا چند یہ فرسودہ نظام اے ساقی
تا چند یہ دور مئے جام اے ساقی
مستی ہے اگر حاصل سامان نشاط
رندوں کو سنا میرا کلام اے ساقی

چند جدید قطعات میں بھی ان کے ان اوصاف کی جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں بلکہ رباعی کی بہ نسبت قطعہ گو کو ہیئتی جکڑ بندی سے قدرے کشادگی حاصل ہوتی ہے اس لیے حقی حزیں کے چار چار مصرعوں پر مشتمل قطعوں میں زیادہ دلکشی، ندرت اور تازگی خیال پائی جاتی ہے۔ خرورے کی دو مٹھیاں:

بھولے بسرے ہوئے تخیل سے
دل کو بہلا کے شاد کرتا ہوں
تم نے جتنا مجھے بھلایا ہے
میں تمھیں اتنا یاد کرتا ہوں

اور کیا خوب کہا ہے:

حد سے بڑھتا ہے جب مذاق خلش
اور دل میں چبھن سی ہوتی ہے
ایسے عالم میں جانے کیوں مجھ کو
چاندنی میں جلن سی ہوتی ہے

اس میدان میں وہ اختر انصاری کی فلسفہ طرازیوں سے ہٹ کر نریش کمارشاد کی بے تکلفی کے قریب ہیں۔
'زمزمے' کی غزلیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے قدیم انداز بیان اور کلاسیکی پیرایۂ اظہار کے باوصف ان میں بیشتر اشعار جگر اسکول کے غزل گویوں کی مانند تازگی اور شگفتگی کے حامل ہیں اور فرسودہ مضامین میں طبع آزمائی کے باوجود حقی حزیں نے ندرت طرز ادا سے کام لیا ہے۔ مثلاً کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے:

چھیڑتا ہے کوئی مضراب نگاہ ناز سے
زمزمے اٹھتے ہیں میری زندگی کے ساز سے

مائل ذوق طلب جس نے کیا تھا مجھ کو
اب مری منزل مقصود میں حائل ہے وہی

کون ہے جو توڑ سکتا ہے مشیت کے اصول
دل کے بہلانے کو مصروف دعا ہو جایئے

یوں نگاہ ناز کے مضراب سے ساز زندگی کا زمزمہ آشنا ہونا، ذوق طلب کو مہمیز کرنے والے کا ہی منزل مقصود میں حائل ہوجانا اور اس حقیقت کا اظہار کہ لاکھ دعاؤں کے بعد بھی مشیت کے اصول تبدیل نہیں ہوسکتے، عام قافیہ پیا شاعروں کے تئیں ایسے معنی خیز اشعار نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔
بڑی بات یہ ہے کہ حقی حزیں کے ہاں صرف معنی آفرینی کا اظہار ہی نہیں ہے وہ حسیاتی تلازموں کے وسیلے سے اپنی غزلوں میں احساسی لرزشوں اور شدت احساس کے وفور کا احساس بھی دلاتے ہیں مثلاً:

تجھے اے آرزوئے دید اس کا بھی خیال آیا
کہ جب وہ سامنے ہوں گے تو اٹھے گی نظر کیوں کر

حزیں ہر بار ہو جاتا ہے وعدے کا یقیں مجھ کو
مرے سر کی قسم اس سادگی سے کھائی جاتی ہے

حالت اتنی تو غیر ہو جاتی
تم بھی میرے لیے دعا کرتے

ہاں نہ دے یوں تسلیاں کہ مجھے
اور بھی اضطراب ہوتا ہے

یہ اشعار اتنے صاف اور عام فہم ہیں کہ ان کے تجزیے کی ضرورت نہیں ہے۔ کون ہے جو ان اشعار کو خلوص دل سے پڑھے اور اس کے دل کے تاروں میں ارتعاش نہ پیدا ہو۔
حقی حزیں کا زمانہ وہ تھا جب چھپنے چھپانے سے زیادہ مشاعروں کو اہمیت دی جاتی تھی اور مشاعرہ ابھی

نعت، مرثیے، سلام ومنقبت وغیرہ میں رسول اکرمؐ کی ذات مقدس سے والہانہ عشق وعقیدت اوردیگرمذہبی نظموں میں اہل بیت سے محبت کا وفورنظرآتاھے اورتعزیتی نوعیت کی نگارشات میں اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ ان کی بے لوث محبت اوریگانگت جھلکتی ھے تونظموں میں بیشتر اس ھستی سے عشق واپنائیت کا تخلیقی اظہار ملتاھے جس کی نگاہ کی جنبشوں نے بقول شاعر اس کے نغموں کے تاروپودکی بنیاد رکھی(انتساب)۔

پیسے کمانے والے کاروباری شاعروں کی آماجگاہ نہیں بنا تھا۔ مجھے نہیں معلوم حقی مرحوم مشاعروں میں شرکت کرتے تھے یا نہیں، لیکن ان کی غزلوں میں ایسے شعروں کی بہتات ہے جو مشاعروں کے سامعین کے دل میں اپنی فوری ترسیل اور شوخ رنگینی کا نقش مرتسم کرتے ہیں کچھ مثالیں دیکھیں:

دنیا کو ہے مجھ پر ترا دھوکا نہ مجھے دیکھ
میں بھی ہوں ترے حسن کا پروانہ مجھے دیکھ

میں کہاں اور کہاں بادہ و ساغر سے گریز
تجھ سے اک چھیڑ ہے ساقی مری توبہ کیا ہے

حزیں منت کش جام وسبو ہونے سے کیا حاصل
کسی کی مست نظروں کا تقاضا اور ہی کچھ ہے

اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ غزلیات حقی حزیں اکثر وبیشتر پامال زمینوں اور فرسودہ مضامین پر مشتمل ہیں لیکن یہ کوئی شرمانے یا متاسف ہونے کی بات نہیں ہے۔ فراق جیسے بڑے شاعر کے ہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اول تو یہ غزلیں فراق کی طرح پچیس تیس اشعار میں پھیلی ہوئی نہیں ہیں اور ان ڈھائی تین سو غزلوں کے گھنے تاریک جنگل میں جگہ جگہ خوبصورت اظہار اور ندرت خیال کے حامل شعر بھی جگنوؤں کی مانند جھلملاتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے:

تونے اے نالۂ دل اپنا اثر دیکھ لیا
آخر ان نرگسی آنکھوں کو بھی تر دیکھ لیا

تجھ سے مخفی اے اسیر غم ابھی یہ راز ہے
وسعت امکاں بقدر قوت پرواز ہے

ترک الفت کے یوں ارادے ہیں
جیسے یہ بات اختیاری ہے

رنج وراحت کے ہر اسلوب کو دیکھا میں نے
آپ کی بزم سے دور آپ کی محفل سے قریب

جب ان کا ذکر ہو جو تری انجمن میں ہیں
اس کو بھی یاد کر جو تری انجمن میں تھا

ہم تو شائستۂ آلام جہاں بھی نہ رہے
اے غم عشق ترے ناز اٹھائیں کیونکر

بے شک اس معیار کے معتد بہ اشعار حقی حزیں کی غزلوں میں دبے ہوئے ہیں اور ان کی موجودگی شاعری ادبی نجات کے لیے کافی ہے۔ سنتے ہیں کسی تخلیق کار کے پانچ دس اچھے شعر اس کی ادبی زیست کو بڑھاتے ہیں 'زمزمے' میں ان کی تعداد کم از کم درجنوں میں ہے۔
زیر بحث شاعری کے منظر نامے میں حقی حزیں مجموعی اعتبار سے محبت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ نعت، مرثیے، سلام ومنقبت وغیرہ میں رسول اکرمؐ کی ذات مقدس سے والہانہ عشق وعقیدت اور دیگر مذہبی نظموں میں اہل بیت سے محبت کا وفور نظر آتا ہے اور تعزیتی نوعیت کی نگارشات میں اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ ان کی بے لوث محبت اور یگانگت جھلکتی ہے تو نظموں میں بیشتر اس ہستی سے عشق واپنائیت کا تخلیقی اظہار ملتا ہے جس کی نگاہ کی جنبشوں نے بقول شاعر اس کے نغموں کے تاروپود کی بنیاد رکھی (انتساب)۔
غزل کے لیے تو مشہور ہی ہے کہ اس صنف میں شاعر اپنے محبوب سے گفتگو کرتا ہے خصوصاً کلاسیکی شاعری کے دلدادگان پر یہ قول خوب صادق آتا ہے۔ حقی حزیں کی غزل کا بنیادی ڈھانچہ بھی اپنے محبوب سے متعلق احساسات اور جذبات کے اظہار پر ہی کھڑا ہے۔ اس اعتبار سے حقی حزیں کو محبت کا پیامبر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔

■

Prof. Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

یکتائے زمانہ تھا وہ اور نام تھا
سہگل

کرشن بھاوک

ہندوستانی سنیما میں بطور گلوکار اور ایکٹر کندن لال سہگل کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، کلاسیکل گلوکاروں کی تاریخ میں فقط 'سہگل' کہنے سے ہی ان کا نام سرفہرست آجاتا ہے۔ انھوں نے مختلف نغمہ نگاروں کی غزلوں، نغموں، بھجنوں کو اپنی آواز عطا کی۔

موسیقار جناب استاد فیاض خاں نے فلمی موسیقی کی اہمیت وافادیت کی زبردست پذیرائی کرتے ہوئے سہگل صاحب کو 'ایک مکمل گلوکار' کہا تھا۔ اسی طرح بلند پایہ و مایہ ناز فلمی موسیقار نوشاد نے مرحوم سہگل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جو رباعی تخلیق کی تھی، اس کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا ہے:

ایسا کوئی فنکار مکمل نہیں آیا، نغموں کا برستا ہوا بادل نہیں آیا
سنگیت کے ماہر تو بہت آئے ہیں لیکن، دنیا میں کوئی دوسرا سہگل نہیں آیا

اس لازوال ولاجواب گلوکار کی پیدائش جموں توی کے قصبہ نواشہر میں 4 اپریل سنہ 1904 میں ہوئی تھی۔ ان کے قصبے میں 'سہگل چوک' نام کا ایک چوراہا بھی تا حال ان کی عظمت کا شاہد ہے۔ کہیں کہیں ان کی پیدائش 11 اپریل بھی بتائی جاتی ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے۔ ان کے والد ماجد جناب امر چند سہگل جموں ریاست میں ایک تحصیل دار تھے۔ ان کے تین فرزندوں کے نام ترتیب وار رام لال، کندن لال اور مہندر تھے۔ اس طرح یہ متوسط فرزند تھے۔ ان کی والدہ کیسر کور کو بھجن گانے کا از حد شوق تھا۔ موسیقی کی اولیں تعلیم کندن لال کو انھیں سے ملی تھی۔

معروف موسیقی دانوں کا تعاون، اشتراک اور اعلیٰ تربیت:

جب ان کی والدہ اپنے نوزائیدہ طفل سہگل کو اپنے ایک معزز پیر کے پاس لے گئیں تو انھوں نے پیشین گوئی کی تھی: ''یہ طفل بڑا ہو کر بہت نام کمائے گا''

سہگل نے متعدد برس توی ندی کے ساحل پر موسیقی وگلوکاری کے ریاض میں گزارے تھے۔ ان کے والد نے نوکری سے سبک دوش ہونے کے بعد پنجاب کے جالندھر شہر آکر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

جالندھر کے بعد مراد آباد جاکر ریلوے میں ٹائم کیپر (Time-keeper) کی ایک معمولی سی ہی نوکری پر اکتفا کرنے لگے۔ اسی سے ان کی انکساری کا ایک مستحکم ثبوت ملتا ہے۔

پونہ شہر کے ادیب دیوداس بسمل نے اپنی کتاب اے کاتب تقدیر میں درج کیا ہے کہ وہیں ایک دن وہ ایک تقریب میں استاد کریم خاں کی ٹھمری گا رہے تھے، انھوں نے سہگل کی از حد تعریف کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک دوسری تقریب میں ایک کلاسیکل موسیقار، خصوصاً سارنگی کے مقبول استاد جناب امتیاز علی خاں نے ان کا گانا سنا اور ان کی بہت تعریف کی۔ جالندھر کے ایک موسیقار ہریش چندر بالی انھیں اپنے ہمراہ کولکاتہ (تب قدیم نام 'کلکتہ') لے گئے۔ وہاں کی 'نیو تھیٹرز، کلکتہ' موسومہ فلمی کمپنی کے موسیقار سے انھوں نے ان کا تعارف کرایا۔ ('اے کاتب تقدیر...'، ایضاً، ص 3)

اپنے دور میں مشہور فلمی اداکارہ نمی کی والدہ حیدن بائی آگرے والی ایک مشہور مغنیہ اور رقاصہ تھیں، ٹھیک اسی طرح نرگس کی والدہ جدّن بائی بھی کلکتے والی کے نام سے کافی مقبول تھیں۔ ان کا بھی خاندانی پیشہ مغنیہ بیگم اختر کی مانند رقص ونغمہ ہی تھا۔ بھوپال کے رشید انجم صاحب

فلم 'یہودی کی لڑکی' میں سہگل کی لاجواب اداکاری سے متاثر ہو کر سنہ 1934 میں ہدایت کار نتن بوس اور موسیقار رائے چند بورال کے تعاون سے 'چنڈی داس' فلم بنی تھی۔اس میں سہگل کے نغموں نے مقبولیت کے آسمان چھو لیے تھے۔ اسی سال کی فلم 'روپ لیکھا' میں سہگل کا گایا ہوا شانت رس سے مملو بھجن نما ایک نغمہ 'سب دن ہوت نہ ایک سمان' بہت مقبول ہوا تھا۔

نے اپنے تحقیقی مقالے زیرِ عنوان بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرو مند آواز'' میں درج کیا ہے کہ ''جدن بائی اس پائے کی مغنیہ تھیں کہ انھوں نے ہی کندن لال سہگل کو غالب کی غزل 'نکتہ چیں ہے غمِ دل، اس کو سنائے نہ بنے' کا انداز سکھایا تھا اور یہ بھی ان کے ذہن نشین کیا تھا کہ غزل گائیکی میں تلفظ اور الفاظ کی صحیح اور بروقت ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ جو لفظ گائیک ادا کر رہا ہو، اس کے معنی سے بھی اس کا واقف ہونا لازمی ہے، تبھی آواز میں حسن لطافت پیدا ہوتا ہے۔''

(رشید انجم، مضمون: بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرو مند آواز)

سنہ 1931 میں متکلم فلموں کا آغاز ہوا تھا۔موسیقار رائے چند بورال کی سفارش سے ہی سہگل کو نیو تھیٹرز، کلکتہ میں گائیکی کا کام ملا تھا۔ مالک دیوکی کمار بوس کو اور ہدایت کار نتن بوس کو تو ابتدا میں سہگل کی صورت تک ناپسند تھی، بعدازاں دوسروں کی مانند وہ بھی ان کے مرید ہو گئے تھے۔

سنہ 1932 میں بننے والی 'محبت کے آنسو' وہ اول فلم تھی، جس میں سہگل کی آواز نے جادو جگایا۔ اس فلم کی ہیروئن اختری بائی فیض آبادی تھیں، جو بعد میں بیگم اختر کے نام سے مشہور ہوئیں۔

(ایضاً، جلد اول، ص 376)

اس سال ان کی دو اور فلمیں ظہور پذیر ہوئی تھیں 'صبح کا ستارا' اور 'زندہ لاش' ان تینوں فلموں میں سہگل صاحب نے فقط ایکٹنگ کی تھی کوئی نغمہ نہیں گایا تھا۔

سہگل نے ترنم کی ملکہ، ازحد حسین اداکارہ ثریا کے ساتھ بھی کام کیا تھا اور جن تین فلموں کے نغموں کو اپنی آواز عطا کی تھی، ان کے نام تھے: تدبیر، عمر خیام اور پروانہ۔

فروری سنہ 1933 میں 'ہندوستان ریکارڈنگ کمپنی' نے سہگل صاحب کے ایک غیر فلمی نغمے کا ریکارڈ بنایا تھا۔اس کے موسیقار آرسی بورال ہی تھے۔اس نغمے کے بول تھے۔''جھلنا جھلا و وری، امبا کی ڈاری پہ کوئل بولے۔'' اسی ریکارڈ کی پشت پر اسی موسیقار کے درج نام کے ساتھ سہگل کا دوسرا نغمہ بھی رکھا گیا تھا۔''ہوری ہو برج راج دلارے''۔

اسی دوران سہگل نے بطور ایک سیلزمین ریمنگٹن ٹائپ رائٹر کی کمپنی میں بھی نوکری کی تھی۔ اس وقت یہ پرتھوی راج کپور، اور جگدیش سیٹھی کے ہمراہ 80، راس بہاری ایوے نیو (Avenue) میں رہا کرتے تھے۔

سنہ 1933 میں ہدایت کار دیوکی کمار بوس نے 'پورن بھگت' نام کی فلم بنائی تھی، جس میں ہیرو کمار تھے اور اُما ششی ہیروئن۔موسیقار آرسی بورال نے سہگل کو قدیم دور کے ایک مشہور جوگی گورکھ ناتھ کے ایک نابینا شاگرد کا رول دلوا کر ان سے ایک نغمہ بھی گوایا تھا۔ ان دونوں کی اسی برس ایک اور فلم 'راج رانی' میرا' بھی پیش ہوئی تھی، جس میں ہیرو پرتھوی راج کپور تھے اور ہیروئن تھیں درگا کھوٹے۔اس میں روپ گوسوامی کا ایک معمولی سا رول کرتے ہوئے سہگل نے فقط ایک ہی بھجن گایا تھا، جس کے بول تھے۔'' آؤ، آؤ ہے بند ھو نادان''۔

اسی سال بنی فلم 'یہودی کی لڑکی' کے ہدایت کار پریما انکر آرتھی تھے اور موسیقار تھے پنکج کمار ملک۔ یہ فلم مقبول ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈراما پر مبنی تھی۔

فلم 'یہودی کی لڑکی' میں سہگل کی لاجواب اداکاری سے متاثر ہو کر سنہ 1934 میں ہدایت کار نتن بوس اور موسیقار رائے چند بورال کے تعاون سے 'چنڈی داس' فلم بنی تھی۔اس میں سہگل کے نغموں نے مقبولیت کے آسمان چھو لیے تھے۔اسی سال کی فلم 'روپ لیکھا' میں سہگل کا گایا ہوا شانت رس سے مملو بھجن نما ایک نغمہ 'سب دن ہوت نہ ایک سمان' بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ گیت اصلاً کرشن بھگت کوی سورداس کا بنایا ہوا تھا۔ سنہ 1935 میں بنی فلم 'کاروانِ حیات' میں سہگل نے پہلی بار مرزا غالب کی دو غزلوں کو اپنی آواز عطا کی تھی۔ان دونوں غزلوں کے مطلع یہ تھے:

حیرتِ نظارہ آخر بن گئی رعنائیاں
خاک کے ذروں میں آتی ہیں نظر گلکاریاں
دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی

مشہور زمانہ گلوکار مناڈے نے نابینا چچا جان کا کردار ادا کیا تھا اور کرشن چندر ڈے کے کہنے پر اگرچہ دو نغمے بذاتِ خود گائے تھے، تاہم یہ نغمے بھی سہگل کی ہی آواز میں ریکارڈ کروائے گئے تھے۔

سنہ 1935 میں فلم 'دیوداس' نے حقیقت پر مبنی فلموں کی بنیاد ڈال دی تھی۔اس فلم کے ہدایت کار تھے پرمتھیش چندر بروا اور موسیقار تھے تمر برن، جو کلاسیکی موسیقار بابا علاء الدین خاں کے شاگرد تھے۔اس فلم میں کیدار شرما نے پہلی بار دو نغمے اور مکالمے تحریر کیے تھے جو سہگل کی آواز میں تھے۔ نغمے کے بول تھے'' بالم آؤ بسو میرے من میں'' اور'' دکھ کے دن اب بیتت ناہیں''۔

علاوہ ازیں اسی فلم میں مشہور ٹھمری 'پیا بن آوت ناہیں چین' کا ایک ٹکڑا بھی شامل تھا۔ بقول نغمہ نگار کیدار شرما ان دونوں نغمات کی دھنیں سہگل صاحب کی ہی ترتیب کردہ تھیں۔ بعدازاں موسیقار کھیم چند پرکاش نے سہگل سے جن فلموں کے نغمے گوائے تھے اور جن سے سہگل کی مقبولیت کو چار چاند لگتے چلے گئے تھے۔ یہ فلمیں تھیں: تان سین بھنورا، بھرتھری، شہنشاہ، سندور، ضدی اور محل۔ سنہ 1935 میں 'دیوداس' کی تکمیل کے وقت 'دیوداس' کے بنگلہ زبان کے نامور ادیب شرت چندر چٹرجی بہ قیدِ حیات تھے۔ اس فلم کو پی سی بروا نے بنگلہ، ہندی اور آسامی زبانوں میں بنایا تھا۔ بعدازاں اسی ناول پر تاحال دس کے قریب فلمیں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔ بالخصوص سنہ 1955 میں بنی 'دیوداس' فلم سب سے زیادہ مشہور و معروف ثابت ہوئی تھی۔ یہ فلم اسی ناول پر مبنی تمام فلموں سے سبقت لے گئی تھی۔اس میں بطور ہیرو دلیپ کمار کے ہمراہ وجینتی مالا، سچترا سین، موتی لال اور نظیر حسین بھی کام کر رہے تھے۔ موسیقار سچن دیو برمن تھے اور نغمہ نگار تھے ساحر لدھیانوی۔

سنہ 1936 میں سہگل کی فلم 'ملینئیر' یعنی 'کروڑ پتی' آئی تھی۔اس میں سہگل کی گائی غزل 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے' ازحد مقبول ہوئی تھی۔اسی سال موسیقار تمر برن کی موسیقی سے مزین فلم 'پجارن' بھی منظرِ عام پر آئی تھی۔اس میں بھی سہگل کی گائی غزل ''جو بیت چکی سو بیت چکی، اب اس کی یاد ستائے کیوں' بے حد مشہور ہوئی تھی۔

اسی برس 'منزل' نام سے نیو تھیٹرز کی فلم میں پنکج ملک کا گایا نغمہ 'سندر ناری، پریتم پیاری، پیاری چھب دکھلائے' خاصا مقبول رہا تھا۔اس فلم کا ایک ریکارڈ سہگل کی آواز میں بنایا گیا تھا۔

سنہ 1938 میں بنی فلم 'پریزی ڈنٹ' یعنی 'بڑی بہن' کے یہ دو نغمے بہت پسند کیے گئے تھے''اک بنگلہ بنے نیارا، رہے کنبہ جس میں سارا۔'' اور بچوں کی کہانی پر مبنی نغمہ ''ایک راجے کا بیٹا لے کر اڑنے والا گھوڑا۔'' بھی شامل تھا۔

اسی سال فلم 'دھرتی ماتا' میں سہگل کا موسیقار پنکج ملک اور اُما ششی کے ساتھ یہ نغمہ بھی از حد مقبول ہوا تھا۔ ''دنیا رنگ رنگیلی بابا، دنیا رنگ رنگیلی'۔ مگر اس سال کی فلم 'اسٹریٹ سنگر' سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس میں سہگل کے گائے یہ دو نغمے از حد مقبول ہوئے تھے: بابل مورا نیہر چھوٹو ہی جائے اور جیون بین مدھر نہ باجے، جھوٹے پڑ گئے تار

اسی فلم میں اکیلے گائے ہوئے اور گلوکارہ کانن دیوی کے ہمراہ گائے ہوئے دوگانے بھی از حد مشہور ہوئے تھے۔

سنہ 1939 میں ریلیز ہوئی فلم 'دشمن' میں یہ گانے شامل تھے:

'کروں کیا آس نراس بھئی، اور پریت میں ہے جیون جوکھوں۔ سنہ 1940 میں بنی فلم 'زندگی' کے یہ دو نغمے بھی عوام الناس نے بہت پسند کیے تھے' سو جا راج کماری، سو جا' اور 'میں کیا جانوں جادو ہے، ان دو متوالے نینوں میں جادو ہے'۔ ان نغمات کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

سنہ 1942 میں سہگل ممبئی آ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے 'رنجیت مووی ٹون' کی فلم 'بھگت سورداس' میں کام کیا تھا۔ اس میں موسیقی گیان دت کی تھی۔ اس فلم میں سہگل نے تقریباً بارہ نغموں کو اپنی آواز عطا کی تھی۔

سنہ 1943 میں سہگل نے کھیم چندر پرکاش کی موسیقی سے آراستہ فلم 'تان سین' میں ہیروئن خورشید کے ساتھ کئی یادگار نغمے گائے تھے۔ سنہ 1944 میں کھیم چندر پرکاش کی موسیقی سے مزین فلم 'بھنورا' کے نغموں نے بھی سہگل کو مقبولیت دلائی تھی۔

سنہ 1944 میں سہگل نے کولکاتا آ کر پنکج ملک کی موسیقی سے آراستہ فلم 'میری بہن' (عرف مائی سسٹر My Sister) میں کئی نغمے گائے تھے۔ چند نغموں کے بول اس طرح تھے: 'دو نیناں متوارے تمہارے، ہم پر ظلم کریں' 'اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے۔ کیا میں نے کیا ہے' 'چھپو نا، چھپو نا، او پیاری سجنیا'، 'ہائے کس کی محبت میں گرفتار ہوئے'

سنہ 1945 میں سہگل نے کولکاتا میں 'یونٹی پروڈکشن' کی 'کوروکشیتر' نام کی فلم میں نغمے گائے تھے۔ اس میں پنڈت گنپت راو کی موسیقی تھی۔ اس میں دو غزلوں کو سہگل نے اپنی آواز عطا کی تھی۔ اول نغمے کے بول ہیں:

'محبت کے گل ہائے تر گوندھتا ہوں' اور 'کدھر ہے تو اے میری تمنا، چراغ دل کا میرے جلا جا!'

اسی سال سہگل نے لال محمد کی موسیقی سے مزین فلم 'تدبیر' کو اپنی آواز سے نوازا تھا۔ اس فلم میں ثریا ہیروئن تھیں۔ سنہ 1946 میں سہگل نے فلم 'عمر خیام' میں لال محمد کی موسیقی پر نغمے گائے تھے۔

فلم 'شاہجہاں': چند لوگوں کے نزدیک سہگل کی آخری فلم ہے حالانکہ ان کی آخری فلم 'پروانہ' تھی۔ اس سے قبل 'شاہجہاں' ریلیز ہو گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار عبدالرشید کاردار تھے اور موسیقی نوشاد کی تھی۔ نغمہ نگار مجروح سلطانپوری کی یہ اول فلم تھی، اور ان کے علیل ہو جانے کے سبب خمار بارہ بنکوی سے چند نغمات تخلیق کروائے گئے تھے۔ ان کے تمام یادگار نغمات میں: 'چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا' قابل ذکر ہے۔

'میرے سپنوں کی رانی روحی' کو رس نما نغمے کی آخری ایک لائن محمد رفیع کی آواز میں ریکارڈ ہے جس میں سہگل اور رفیع اکٹھے ہوئے تھے۔

'چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا' متنازع گیت کو دیوداس بسمل نے اپنی کتاب 'اے کاتب تقدیر...' میں خمار بارہ بنکوی کے ساتھ مجروح سلطان پوری کا نام بھی درج کیا ہے۔

'اے دل بے قرار'، 'غم دیے مستقل' اور 'جب دل ہی ٹوٹ گیا...'' سہگل کی آخری تمنا کے مطابق نغمہ بجایا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ محمد رفیع کے جنازے کے وقت ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے بھی انھیں کا گایا نغمہ 'اے دنیا کے رکھوالے' بجایا گیا تھا۔ متذکرہ بالا فلم 'شاہجہاں' کے تمام نغمے ایک سے ایک مانے گئے تھے۔ 'رتن' فلم کے بعد موسیقار کی یہ دوسری یادگار فلم ثابت ہوئی تھی۔

آخری فلم 'پروانہ' میں موسیقی خورشید انور نے دی تھی اور نغمہ نگاری دینا ناتھ مدھوک کی تھی۔ اس میں بھی سہگل کے گائے چار نغمات کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے مکھڑے یہ تھے: 'محبت میں کبھی ایسی بھی حالت پائی جاتی ہے...'، 'اس مست نظر پہ پڑی جو نظر...'، 'ٹوٹ گئے سب سپنے میرے یہ دو نینا' اور 'اے پھول، ہنس کے باغ میں کلیاں کھلائے جا!'

سہگل نے 29 ہندی فلموں، 7 بنگلہ فلموں اور 3 تمل فلموں کو اپنے نغمات سے آراستہ کیا تھا۔ انھوں نے ہندی، پنجابی، فارسی، پشتو اور تمل زبانوں میں نغمے گائے تھے۔ اس کے بعد ہی رابندرناتھ ٹیگور نے اپنی یہ شرط ترک کر دی تھی کہ وہ کسی غیر بنگالی گلوکار سے کوئی نغمہ نہیں گوائیں گے۔ عوام الناس میں یہ غلط فہمی بھی رہی ہے کہ انھوں نے فقط غالب اور آرزو لکھنوی کی ہی غزلوں کو اپنی آواز سے نوازا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سیماب اکبرآبادی، بیدم شاہ، ذوق، حسرت جے پوری، اختر اور امیر مینائی کی غزلوں کو بھی گایا ہے۔ ان کی گائی غزلیں فلمی نغمات سے بہتر قرار دی گئی ہیں۔

چند دیگر نغمات کی مقبول عام اولیں سطور

اس سے قبل سہگل کے چند نغمات کے نمونے دیے گئے ہیں۔ انھوں نے تقریباً 117 نغموں و غزلوں کو اپنی شیریں آواز دی ہے۔ اتنا ہی نہیں تقریباً 40 غیر فلمی غزلیات و نغمات کا ہدیہ اس جہانِ فانی کو عطا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

1. رادھا رانی دے ڈاروتہ، فلم: پورن بھگت، 1933
2. نس دن برست نین ہمارے، فلم: بھگت سورداس، 1942
3. مدھوکر شیام ہمارے، فلم: بھگت سورداس، 1942
4. دیا جلاؤ، دیا جلاؤ، فلم: تان سین، 1943
5. سپت سر، تین تال، فلم: تان سین، 1943
6. اے دل بیقرار کیوں، فلم: شاہجہاں، 1946
7. غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل، فلم: شاہجہاں، 1946
8. انسان! کیوں روتا ہے انسان، فلم: عمر خیام، 1946

فقط 42 سال کی عمر جی کر سہگل موسیقی و نغمہ کی تاریخ میں دائم مقام حاصل کر گئے۔ 1946 میں 24 دسمبر کے دن وہ وفات پا گئے۔ ان کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نغمات والی کوئی بھی فلم کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ یقین حقیقت ہے۔ اصل میں سہگل صاحب نے اپنی حیات میں اپنے نغمے گانے کے مقصد سے فلموں میں ایکٹنگ کی تھی۔ اُس دور کے ہدایت کاروں کی جانب سے اداکاروں کے لیے معیاری گلوکار ہونا ایک لازمی شرط تھی۔ دیوان شر کا ایک شعر اس نایاب گلوکار کے لیے پیش ہے:

سہگل کا گیت فلم کا اک انقلاب تھا
سہگل کے بعد بزم کی مستی چلی گئی

اس کے علاوہ سہگل صاحب کی یاد میں کئی برس پیشتر پنجاب کے جالندھر شہر میں منعقد ایک تقریب میں موسیقار نوشاد نے یہ برمحل قطعہ کہا تھا:

یہ کس نے کیا دیش میں نغموں سے اجالا
یہ کس نے ہر اک شعر کو آواز میں ڈھالا
دنیا اسے کہتی تھی کلاکار مکمل
یکتائے زمانہ تھا وہ، نام تھا سہگل

■

Krishan Bhavuk, 201-A, Guru Nanak Nagar, Gali No.: 18-K, Patiala - 147003 (Punjab)

مہرین قادر حسین

رسائل اور خواتین کی خدمات

اردو میں صحافت کی عمر کوئی دو سو برس کے عرصے پر محیط ہے۔ مگر جہاں تک خاتون صحافی یا خاتون کی صحافت کا تعلق ہے تو آزادیِ ہند تک اس میدان میں چند ہی ایسے رسالے شائع ہوتے تھے جن میں خواتین قلم کاروں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ دراصل اس کی وجہ اس زمانے کی سماجی اور مذہبی بندشیں تھیں۔ اس زمانے کا ایک رسالہ 'معلم نسواں' تھا۔ اس رسالے کو محب حسین نے 1892 میں جاری کیا۔ اس رسالے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں عورتوں اور لڑکیوں کی تربیت کی مناسبت سے مضامین شامل کیے جاتے تھے۔ اس رسالے میں عورتوں کی تعلیم، ان کے پردہ، لباس اور اسلام میں عورتوں کا مقام و مرتبہ کے حوالے سے مضامین شائع ہوتے تھے، حالانکہ اس رسالے میں شائع مواد میں اعتدال کی کمی محسوس کی جاتی ہے باوجود اس کے اپنے عہد کا یہ ایک اہم رسالہ تھا۔

آزادی سے قبل جو چند رسالے شائع ہوا کرتے تھے ان میں رسالہ عصمت کا نام سرفہرست ہے۔ اس رسالے کو مصورِ غم علامہ راشد الخیری نے 1908 میں جاری کیا۔ مولانا نے اس رسالے کی ادارت بھی کی۔ خواتین کو علم کی رغبت دلانے، ان کی تربیت کرنے اور ان کے اندر علمی و ادبی صلاحیتیں پیدا کرنے کی غرض سے علامہ راشد الخیری نے خواتین کے فرضی نام سے اس رسالے میں مضامین تحریر کیے۔ اس رسالے میں مدیر کی ذمے داری مولانا رازق الخیری نے سنبھالی اور اس نے اس رسالے کے معیار کو بلند کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ بعد میں مولانا کی بیگم اور معروف ادیبہ آمنہ نازلی نے بھی ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ 1980 تک یہ رسالہ پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا مگر اس کے بعد اس رسالے کا سراغ نہیں ملتا۔

رسالہ 'النساء' کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ رسالہ النساء کا پہلا شمارہ 1919 میں محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ خواتین کا رسالہ تھا جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس رسالے کی مدیرہ ایک اصلاحی اور انقلابی مزاج کی خاتون تھیں۔ مدیرہ نے ایسے مضامین شائع کیے جن میں عورتوں کی تعلیم، ان کی تربیت پر زور دیا گیا ہو۔

رسالہ 'عکس' محمودہ یاسمین کی ادارت میں گوشہ محل سے 1952 میں میں شائع ہوا۔ اس رسالے کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ مدیرہ چونکہ ایک اچھی افسانہ نگار تھیں لہٰذا انھوں نے اس رسالے کو افسانے کے لیے وقف کر دیا۔ اس زمانے کی افسانہ نگار خواتین کی تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

ان رسالوں کے علاوہ بھی خواتین کی تحریریں دوسرے رسالوں میں شائع ہوا کرتی تھیں بالخصوص ان کی تخلیقات۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آزادی سے قبل خواتین کی تحریریں کم شائع ہوئیں۔ مگر آزادی کے بعد حالات بالکل بدل گئے اور دوسری تمام اصناف اور میدان کی طرح ہندوستانی خواتین نے صحافت میں بھی اپنی موجودگی درج کرائی۔ ایسے کئی رسالے ہیں جن میں خواتین کی تحریروں کو ترجیح کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا مگر تمام رسالوں پر گفتگو کا یہ موقعہ نہیں اس لیے میں نے اپنے مطالعہ کے لیے تین رسالوں 'خاتون دکن'، 'روشنی'، اور 'روشی' کا انتخاب کیا ہے۔

''جو زبان ہندوستان کی تہذیب کی آئینہ دار ہے جس زبان نے اپنے اور پرائے کے احساس کو مٹایا، جس زبان میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں، جس زبان نے اندھیروں میں روشنی کا پیغام دیا۔ آج اس زبان کو تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جارہا ہے۔اردو زبان کی بے بسی پر صرف اظہار ہمدردی کرنا اردو کے حق میں سخت نا انصافی ہے۔ جس زبان میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں وہ زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان حالات کی بے راہ روی کے باوجود اپنا احساس دلاتی رہے گی۔''

رسالہ 'خاتون دکن' کا پہلا شمارہ نومبر 1962 میں منظر عام پر آیا، اس اہم رسالے کی مدیر اعلیٰ محترمہ صالحہ الطاف تھیں، جو خود ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ یہ رسالہ ترقی پسند مزاج کا حامل رسالہ تھا باوجود اس کے اس نے کلاسیکی سرمایے سے نظریں نہیں چرائیں بلکہ اس رسالے میں خواتین کے ساتھ ساتھ مرد قلمکار کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھی۔ معین احسن جذبی، یوسف حسین خان، سید حرمت الاکرام، سیدہ جعفر، خدیجہ مستور اور فضا ابن فیضی جیسے اہم لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔

رسالہ خاتون دکن میں 'نقش اول' کے عنوان سے اداریے شائع ہوا کرتے تھے جن میں اردو زبان و ادب کے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ایک اداریہ ملاحظہ ہو:

''جو زبان ہندوستان کی تہذیب کی آئینہ دار ہے جس زبان نے اپنے اور پرائے کے احساس کو مٹایا، جس زبان میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں، جس زبان نے اندھیروں میں روشنی کا پیغام دیا۔ آج اس زبان کو تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جارہا ہے۔ اردو زبان کی بے بسی پر صرف اظہار ہمدردی کرنا اردو کے حق میں سخت نا انصافی ہے۔ جس زبان میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں وہ زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان حالات کی بے راہ روی کے باوجود اپنا احساس دلاتی رہے گی۔''

خاتون دکن کی مدیرہ کے نزدیک اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانا ایک اہم مسئلہ ضرور تھا مگر انھوں نے اس کے لیے سیاسی اور سماجی مسائل سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ انھوں نے جشن جمہوریہ کے موقعے پر جو اداریہ تحریر کیا وہ بے حد اہم ہے۔ اس اداریے میں انھوں نے یوم جمہوریہ کو 'خواب کی عملی تعبیر' کے دن سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے جنگ آزادی میں جان و مال کی قربانی دینے والے عظیم وطن پرستوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

رسالہ 'خاتون دکن' میں خدیجہ مستور کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان 'بیٹی' تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہونے والے فرق کو سماج کے لیے نقصاندہ بتایا ہے، ان کا خیال ہے کہ بیٹا ہو یا بیٹی والدین کو چاہیے کہ دونوں کی تعلیم و تربیت کا یکساں طور پر خیال رکھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سماج میں بیٹا اور بیٹی میں فرق کیا جاتا ہے والدین بیٹی کو تعلیم دلانے کے بجائے ان کو امور خانہ داری میں لگا دیتے ہیں۔ والدین کے اس رویے سے لڑکیوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جس سے کئی طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

رسالہ خاتون میں سنجیدہ موضوعات پر تو مضامین ملتے ہی ہیں ساتھ ہی انشائیے اور طنز و مزاح بھی اس رسالے کی زینت بنتے رہے۔ خود مدیرہ صالحہ الطاف طنز و مزاح کے گرتے معیار سے پریشان تھیں اور ان اس کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اس رسالے میں طنز و مزاح پر کئی اچھے مضامین شائع ہوئے۔ مجتبیٰ حسین، سرور جمال، احسن علی مرزا اور پروین سرور وغیرہ کی تحریروں نے بھی طنز و مزاح کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔

رسالہ 'خاتون دکن' میں افسانے اور ڈرامے بھی کثرت سے شائع ہوا کرتے تھے۔ جن افسانہ نگاروں کی کہانیاں اس رسالے میں شائع ہوئیں ان میں علی عباس حسینی، کیدار شرما، زین العابدین، سلمیٰ شاکر اور طاہرہ صدیقی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناولٹ 'کارمن' بھی اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو رسالہ 'خاتون دکن' میں نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات شائع ہوا کرتی تھی۔ شعری تخلیقات کے حوالے سے اس رسالے کو اس زمانے کے شعرا کا پورا تعاون حاصل تھا۔ شاذ تمکنت، شہریار، مظفر حنفی، قیس رام پوری، غلام مرتضیٰ راہی، اور حسرت جے پوری کی شعری تخلیقات اس رسالے میں شامل ہوئیں۔

خاتون دکن کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اس رسالے میں شائع ہونے والے مواد کو صنف کے اعتبار سے الگ الگ نام دیا جاتا تھا، مثلاً اداریے کے لیے جہاں 'نقش اول' کا عنوان تھا وہیں تخلیقات کے لیے 'سوز و ساز'، تبصروں کے لیے 'سرگزشت دل' مستقل کالم کے لیے 'عکس جمیل' اور قارئین کے خطوط اور ان کی آرا کے لیے 'آواز جرس' کا عنوان ملتا ہے۔

رسالہ 'خاتون دکن' بنیادی طور پر خواتین کا رسالہ تھا جو خواتین کے لیے وقف تھا اس میں شائع ہونے والی تحریروں کی اہم خوبی یہ تھی کہ اس میں خواتین کی ترجیحات اور دلچسپیوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔

رسالہ 'قلم کار' احمدی بیگم کی ادارت میں نکلنے والا ایک اہم رسالہ تھا۔ یہ رسالہ مغل اکادمی حیدر آباد سے شائع ہوتا تھا بلکہ یہ رسالہ اکادمی کا ترجمان تھا۔ اس رسالے کی مجلس مشاورت میں ابوظفر، عبدالواحد، رفیعہ سلطانہ، جہاں بانو نقوی اور سید مہدی حسین وغیرہ شامل تھے۔ رسالہ 'قلم کار' کا اداریہ 'سوجھ بوجھ' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک کلاسیکی اقدار کے ساتھ ساتھ ترقی پسند فکر کا ترجمان رسالہ تھا۔ کسی بھی رسالے کا مزاج اس

''اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان اردو ہے اپنی زبان سے اغماض برت رہے ہیں بعض ارباب نظر کے اندازے کے مطابق اردو زبان جاننے والوں کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے کیونکہ نئی نسل کی تعلیم انگریزی، ہندی یا تیلگو زبانوں میں ہورہی ہے۔ یہ واقعی ایک حزنیہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اردو زبان میں تعلیم دلانے پر راغب کرنے کی مہم چلائی جائے۔''

کے اداریے سے پتہ چلتا ہے۔ اس رسالے کے اداریے کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالے کا ایک مقصد ترقی پسند تحریک کی صحت مند ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی صورت حال کو مزید بہتر بنانے اور استحکام بخشنے کی کوشش کرنا تھا۔ ایک اداریہ ملاحظہ کریں:

''اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان اردو ہے اپنی زبان سے اغماض برت رہے ہیں بعض ارباب نظر کے اندازے کے مطابق اردو زبان جاننے والوں کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے کیونکہ نئی نسل کی تعلیم انگریزی، ہندی یا تیلگو زبانوں میں ہورہی

ہے، یہ واقعی ایک حزنیہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اردو زبان میں تعلیم دلانے پر راغب کرنے کی مہم چلائی جائے۔"

احمدی بیگم نے جس جانب اشارہ کیا ہے صورت حال آج بھی ویسی ہی بنی ہوئی ہے۔ کسی بھی زبان کے زوال کی وجہ اس کے قارئین کا فقدان ہے۔ اور قاری کی تعداد بڑھانے کے لیے سب سے اہم ہے اسکول میں اردو کی تعلیم دی جائے، جب تک بچے اس زبان کو نہیں سیکھتے تب تک اس زبان کو کیا کسی بھی زبان کو وقار نہیں مل سکتا۔ اس لیے اردو زبان کی موجودہ صورت حال کو بدلنے کے لیے بچوں کو ابتدائی تعلیم میں دوسرے مضامین کے ساتھ اردو کی تعلیم کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ رسالہ 'قلم کار' نے ہمیشہ ایسے موضوعات کو اپنے رسالے میں جگہ دی جن سے صحت مند ادب کو فروغ ملے۔ اس رسالے پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے دو خصوصی نمبرات کا ذکر کیے بغیر گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس رسالے نے اکتوبر، نومبر 1964 میں شخصیت اور فن طنز و مزاح و انشائیہ نقد و نظر شائع کیا جب کہ دسمبر، جنوری 1966 'افسانہ نمبر' شائع ہوا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے قابل ذکر قلم کاروں میں کوثر چاند پوری، خواجہ احمد فاروقی، راجہ مہدی علی خاں، مغنی تبسم، طالب رزاقی، اکرام جاوید، فضا ابن فیضی، نیاز فتح پوری، سید مہدی حسین وغیرہ اہم ہیں۔ اس رسالے میں گرچہ خواتین کے مسائل کو ترجیح کے ساتھ شائع نہیں کیا گیا مگر جیسا میں نے پہلے عرض کیا میرے پیش نظر وہ رسائل تھے جن میں خواتین کے مسئلے یا ان کی تحریروں کو ترجیح دی جاتی تھی ساتھ ہی میرے پیش نظر وہ رسالے بھی ہیں جن کی ادارت خاتون نے کی تھی اس حوالے سے رسالہ قلم کار اہم ہے۔

خواتین کی نمائندگی کرنے والا ایک اہم رسالہ 'روشنی' تھا۔ یہ رسالہ ہاجرہ بیگم کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے سرورق پر 'انجمن خواتین ہند کا ماہنامہ رسالہ' درج ہوتا تھا۔ اس جملے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس رسالے کا اصل اور بنیادی مقصد عورتوں کے اندر حقوق کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور ان کو با اختیار بنانے کا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ اس رسالے میں شامل بیشتر تحریروں کا تعلق خواتین کے مسائل سے ہوتا تھا۔ ہاجرہ بیگم نے اپنے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ خواتین کو سیاست میں عملی حصہ لینا چاہیے کیونکہ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ رسالہ روشنی نے عورتوں کے اندر سماجی اور معاشرتی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کو

ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کی فضا بالکل بدل گئی. یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو اپنے سیاسی مفاد کے لیے مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے کا کام کیا. جس سے ملک و قوم کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی. آج بھی صورت حال جوں کی توں بنی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت و افادیت کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے کلچر کو محبت کی نظر سے دیکھیں انہیں اپنائیں. رسالہ روشنی کے ذمے داران نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر ادبی اور خواتین کے مسائل کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی پر بھی زور دیا ہے۔

بھی وقت کی اہم ضرورت سمجھا۔ اور اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لیے ایسے مضامین شائع کیے جن میں مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہوئے سماجی، سیاسی اور معاشرتی فرق کو مٹایا جاسکے اسے کم کیا جاسکے۔ اس رسالے نے عالمی پیمانے پر خواتین کے مسائل کو اپنے رسالے میں جگہ دی یہی وجہ ہے انڈونیشیا کی خواتین تحریک بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہو رہی تحریکوں کے متعلق مضامین کو اپنے صفحات پر جگہ دی۔

بیسویں صدی میں شائع ہونے والا ایک اہم رسالہ 'روشی' تھا۔ اس رسالے کی ادارت رونق جہاں زیدی کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ ایک ادبی نوعیت کا رسالہ تھا، جس میں ادبی مضامین کے علاوہ تمام اصناف ادب اور شاعری کو جگہ دی جاتی تھی مگر رسالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیرہ کے پیش نظر افسانے کی ترویج و اشاعت اہم مسئلہ تھا، یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ہی شمارے میں 7 سے 8 افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔

رسالہ 'روشی' کی نوعیت گرچہ ایک ادبی رسالے کی تھی مگر اس رسالے نے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو بھی اپنے صفحات پر خصوصیت کے ساتھ شائع کیا۔ مارچ 1973 کا ایک اداریہ ملاحظہ کریں:

"اگر ہمیں ملک سے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا قلع قمع کرنا ہے تو ہمیں عقلی سطح پر نیچے اتر کر دلوں اور جذبات کے ذریعے کام کرنا ہوگا۔ اور ہندو مسلمانوں میں باہمی میل ملاپ کی فضا استوار کرنے کے لیے کلچر اور زبان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ کلچر کا ہتھیار ایسا قومی ہتھیار ہے جس نے دنیا کی قوموں کی تقدیریں بدل دیں اور جس کا توڑ آج تک نہیں پیدا ہوسکا۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتحاد کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ جس قوم یا ملک میں اتحاد نہ ہو وہ برباد اور نیست و نابود ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کی فضا بالکل بدل گئی، یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو اپنے سیاسی مفاد کے لیے مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے کا کام کیا، جس سے ملک و قوم کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ آج بھی صورت حال جوں کی توں بنی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت و افادیت کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے کلچر کو محبت کی نظر سے دیکھیں انھیں اپنائیں۔ رسالہ روشی کے ذمے داران نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر ادبی اور خواتین کے مسائل کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی پر بھی زور دیا ہے۔ رسالہ روشی کا ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر قابل ذکر ہے۔ یہ شمارہ مئی تا جون 1973 میں شائع ہوا۔ اس شمارے میں رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، آل احمد سرور، ڈاکٹر سلامت اللہ اور عابد رضا بیدار جیسی علمی شخصیات کے مضامین شامل تھے۔ اس کے علاوہ غلام ربانی تاباں، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، شہریار اور نازش پرتاپ گڑھی جیسے شعرائے کرام کی نظمیں شائع ہوئیں جس میں شعرا نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

مجموعی طور پر خواتین کے مسائل پر بیسویں صدی میں کئی اہم رسالے منظر عام پر آئے، ظاہر ہے تمام رسالوں پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ میں نے چند رسالوں کے حوالے سے اردو صحافت میں خواتین کی شمولیت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالے دراصل حقوق نسواں میں کافی معاون ثابت ہوئے۔ تانیثیت کی ابتدائی شکل بھی کہیں نہ کہیں ان رسالوں میں نظر آتی ہے۔ معاصر عہد میں بھی کئی خواتین اپنی تحریروں سے صحافتی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

■

Mehreen Caderhoossen (Part Time lecturer, Urdu Dept. Mahatma Gandhi Institute, Moka, Mauritius),
PostalAddress: Kallychurn Lane, Saint Paul Phoenix, Mauritius
Ph.:0023059318023
Email.: angeltash00@gmail.com

خراج عقیدت

شمس کمال انجم

ہندوستانی جمالیات کا استعارہ

عابد سہیل، زبیر رضوی، ملک زادہ منظور احمد اور جوگندر پال کے بعد بچوں کے بابا سائیں بھی چل بسے۔ بابا سائیں یعنی پروفیسر شکیل الرحمٰن، تین تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، سابق مرکزی وزیر، جمالیات کے امام، بے شمار کتابوں کے مؤلف، مصنف اور کہانی کار۔

میں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کا نام سب سے پہلے ماہنامہ شاعر میں دیکھا۔ جولائی 2010 کے شمارے میں افتخار امام صدیقی نے ان کا گوشہ شائع کیا تھا۔ اس شمارے کو پڑھ کر شکیل الرحمٰن کے علم وفن سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ جمالیاتی تھیوری اور اس کے اسرار ورموز کے حوالے سے پروفیسر شکیل الرحمٰن کی بنیادی خدمات سے واقفیت تو ہوئی، مگر تشنگی برقرار رہی۔ ان کی مزید تالیفات وتصنیفات کو حاصل کرنے کی خواہش ہوئی۔ کشمیر سے شائع شدہ ان کی کتاب مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات دہلی کے ایک کتب خانے میں ملی تو اسے ایک ہزار روپے میں خرید کر لایا اور مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی اور بھی کتابیں پڑھیں اور جمالیات کے اسرار ورموز کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شکیل الرحمٰن نے جمالیات کا کچھ اس طرح تعارف کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قدیم یونانی کہانی کے 'نارکی سس' کو سبھی جانتے ہیں۔ خوب صورت نوجوان، ہر صبح تالاب میں اپنا چہرہ دیکھتا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے خود پر عاشق ہوگیا۔ ایک صبح ایسا ہوا کہ تالاب میں اپنے چہرے کے حسن کو دیکھتے دیکھتے اور بھی پاس آ گیا۔ گرا اور تالاب میں ڈوب گیا۔ اسی مقام پر ایک خوب صورت پھول پیدا ہوگیا۔ ہم اسی پھول کو نرگس یا نارکی سس کہتے ہیں۔ آسکر وائلڈ نے اس اساطیری کہانی کے اختتام کا ایک دوسرا ہی رخ پیدا کردیا ہے جس سے کہانی اور معنی خیز بن گئی ہے۔ وہ کہتا ہے جب 'نارکی سس' مرگیا تو جنگلوں کی پریاں اس مقام پر آئیں پانی چکھا، تالاب کا میٹھا پانی نمکین آنسوؤں میں تبدیل ہوگیا تھا۔ پریوں نے تالاب کے پانی سے پوچھا ''تم کیوں رو رہے ہو؟'' تالاب کے پانی نے جواب دیا ''میں نارکی سس کے لیے رو رہا ہوں'' پریوں نے کہا ''واقعی تمھارے لیے یہ بہت المناک حادثہ ہے۔ بہت بڑا المیہ آنسوؤں کا اس طرح بہنا فطری ہے۔ تمھیں بہت دکھ پہنچا ہے۔ ہم تو نارکی سس کے پیچھے صرف جنگلوں میں دوڑتے رہتے تھے۔ تم تو روز ہی اس کے حسن کو اپنے قریب سے دیکھتے تھے۔ واقعی بہت حسین تھا وہ۔'' کیا واقعی نارکی سس بہت حسین تھا؟ تالاب کے پانی نے حیرت سے دریافت کیا۔ پریوں نے کہا '' بھلا تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ وہ بہت خوب صورت نوجوان تھا'' پانی نے چند لمحے سوچا پھر کہا ''میں یقیناً نارکی سس کے لیے رو رہا ہوں لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھا''۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ جب بھی صبح سویرے میرے پاس بیٹھتا اور مجھ میں جھانکتا تو میں خود اپنا حسن اس کی آنکھوں میں دیکھا کرتا تھا۔''

شکیل الرحمٰن اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ ہے جمالیات کہ جس میں ٹریجڈی کی جمالیات بھی جذب ہے۔ یہ انسان کی نفسیات کی باریکی ہے۔ بڑے تخلیقی فنکار کے لیے تالاب معاشرہ ہے۔ وہ اپنے شعور اور لاشعور کے ساتھ اس تالاب کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ اپنے حسن اور اپنے جمال کے ساتھ اس کے المیے کو بھی دیکھتا ہے۔ اس حد تک کہ تالاب یا معاشرہ اور تخلیق کار ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن جاتے ہیں۔ تخلیقی فنکار اپنے 'نارکی سس' میں جو تالاب یا معاشرے کی سائیکی کے اندر بڑی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں زندگی کا جلال وجمال اور افراد اور معاشرے کی ٹریجڈی صاف جھلکنے لگتی ہے۔ فنکار کی جمالیاتی حسیات جہاں 'نارکی سس' کی خوب صورت آنکھوں سے انبساط حاصل کرتی ہیں وہاں تالاب کے آنسوؤں سے بھرے نمکین پانی کو چکھ کر زندگی کی ٹریجڈی کا عرفان حاصل کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہی ان کے جمالیاتی تجربوں کا ڈرامہ شروع ہوتا ہے۔ (دیکھیے ماہنامہ شاعر جولائی 2010)

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے جمالیاتی تھیوری تک پہنچنے کے لیے بڑی کدوکاوش کی۔ شیکسپیئر، بلیک، روسو، گوئٹے، دوستو وسکی، برگساں، ولیم جمس، مارسل پروست ایڈلر، فرائڈ، یونگ، رومی، سعدی، حافظ شیرازی، غالب، پریم چند، منٹو، بھٹ نائک، بھٹ لوٹ اور ابھینو گپتا ایسے بہت سارے کلاسیکی ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کو

پڑھا، انھیں جذب کرکے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کسی شہ پارے کی جمالیات کیا ہوتی ہے۔ قاری کا احساس جمال ان شہ پاروں کی جمالیات سے کس طرح انبساط حاصل کرتا ہے۔ انھوں نے لکھنا شروع کیا اور بس لکھتے رہے۔ اساطیر کی جمالیات، مولانا رومی کی جمالیات، جمالیات حافظ شیرازی، امیر خسرو کی جمالیات، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، نظیرا کبرآبادی کی جمالیات، کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، غالب کی جمالیات، ہندوستان کا نظام جمال، بدھ جمالیات سے جمالیات غالب تک (تین جلدیں) ہندوستانی جمالیات، ہند اسلامی جمالیات، قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ، محمد اقبال کی جمالیات، فراق کی جمالیات، فیض احمد فیض کی جمالیات، اختر الایمان جمالیاتی لیجنڈ، مجتبی حسین کا فن، جمالیاتی مظاہر، ادب اور جمالیات، بارہ ماسے کی جمالیات پر ان کی بہت وقیع کتابیں منظر عام پر آئیں۔ (شکیل الرحمٰن ڈاٹ کام)

انھوں نے نہ صرف ادبیات کی جمالیات کو کھنگالا اور ان میں غوطہ زنی کی بلکہ فنون لطیفہ پر بھی انھوں نے برسوں کدوکاوش کرکے ہندوستانی جمالیات کے مناظر کو اس طرح دیکھا کہ وہ خود ہندوستانی جمالیات کا نادر استعارہ بن گئے۔ بدھ جمالیات سے لے کر غالب جمالیات، فن تعمیر، فن موسیقی، فن مصوری، فن رقص، رگ وید، اپنشدوں، لوک کہانیوں، اسلامی اور ہند اسلامی جمالیات پر ایسا کام کیا جو بقول شکیل الرحمٰن کئی آسیبوں کا کام ہے۔ شکیل الرحمٰن نے بدھ جمالیات، کبیر کی جمالیات، اساطیر کی جمالیات، ہندوستانی جمالیات، شاعروں اور ادیبوں کی جمالیات کو موضوع بنایا تو قرآن کریم کو انھوں نے جمالیات کا عظیم تر سرچشمہ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''قرآن کریم میں جمالیات بکھری ہوئی ہے۔ رنگ ونور کی بڑی حیرت انگیز دل میں اتر جانے والی تصویریں ہیں۔ جمال زندگی کے جانے کتنے نقوش دکھائے گئے ہیں۔ اللہ ظلمات سے نکال کر نور کی جانب لے جاتا ہے۔ وسیع رحمت والا ہے۔ کائنات اور اس کا جلال وجمال رحمت الٰہی ہے۔ زندگی حسن، خوشبو، نغمہ، آہنگ سب اللہ کی رحمتوں کی دین ہیں آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اس رحمت کے دائرے میں ہے''۔

اساطیر کی جمالیات میں لکھتے ہیں کہ ''اساطیر تخلیقی ذہن کی ہمہ گیر روایت ہے۔ یہ انسان کی بہت بڑی وراثت ہے کہ جس میں قدم قدم پر جبلتوں، آرزوؤں، تمناؤں، حسرتوں، محبتوں، نفرتوں اور قدروں کی شکست وریخت اور ان کی نئی تخلیق کی پہچان ہوتی ہے۔ انسان کے جذبوں کا آزادانہ اظہار ہوا ہے۔ یہ معنی خیز تہہ دار اور جہت دار روایت بڑی خاموشی سے سفر کرتے ہوئے فنون ادبیات میں جذب ہوئی ہے۔ اس کا سفر بہت پراسرار رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم لوگوں کا لاشعور اساطیر کی گہرائیوں میں کتنا ڈوبا ہوا ہے۔ اچھے فنکار اپنے آرٹ میں غیر شعوری طور پر اساطیر کی روشنی حاصل کرتے ہیں''۔

میں نے شکیل الرحمٰن کو بغور پڑھا۔ میری خواہش ہے کہ عربی ادبیات کے بحر ناپیدا کنار میں بکھرے ہوئے جمالیاتی موتیوں کو تلاش کرکے اردو قارئین تک پہنچایا جائے۔ جاہلی شاعری کی جمالیات، امرؤ القیس کی جمالیات شعر کہ اس میں اسی طرح کی جنسی حسیات کی جمالیات پوشیدہ ہے جیسی کہ شکیل الرحمٰن نے قلی قطب شاہ کی شاعری میں دریافت کی ہے۔ خانماں برباد شاعروں کی جمالیات، جریر، فرزدق، اخطل ایسے شعری معرکوں سے اموی دور کی چادر ادب پر گلکاری کرنے والے لڑاکو شاعروں کی جمالیات، متنبی، بحتری، ابونواس، عمر بن ابی ربیعہ، ابن زیدون، ابن ہانی ایسے بے شمار شعراء کی جمالیاتی حسیات کو اجاگر کیا جائے۔ بابا سائیں نے ہند مغل جمالیات میں مشرقی شعریات کی جمالیات کی طرف بھی اختصار سے اشارہ کیا ہے۔ میں نے انھیں پڑھ کر انھیں خط لکھا جس کا ایک اقتباس یوں ہے:

''آپ کا گوشہ شاعر کے جولائی کے شمارے میں نظر نواز ہوا اور آپ نے فکر وفن کی جمالیات کے بے شمار تہہ در تہہ اسرار ورموز کو سارے عالم کے لیے وا کردیا۔ بہت سارے لوگ حسن وجمال اور جمالیات کا لفظ استعمال کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ جمالیات کی صحیح قدر، جمالیات کا صحیح استعمال، جمالیات کا صحیح انکشاف آپ سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ ہر چند کہ ابھی تشنگی باقی ہے مگر جمالیات کے اسرار تو بہر صورت روشن ہوگئے۔ آپ کے گوشے کے مطالعے کے بعد مجھے آپ کی کتابوں کو پڑھنے کا بے انتہا شوق دامن گیر ہوا۔ تلاش بسیار کے بعد مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات ایک کتب خانے میں ملی تو اسے فوراً میں نے خرید لیا تاکہ جمالیات کے مزید اسرار ورموز سے آشنا ہوسکوں۔ مولانا رومی کی جمالیات، امیر خسرو کی جمالیات، کبیر، نظیر اکبرآبادی کی جمالیات، قلی قطب شاہ کی جمالیات اور فراق کی جمالیات وغیرہ کتابیں دیکھنے کا شوق ہے۔ آپ کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ عربی ادبیات کی جمالیات پر بھی اسی انداز کا کام کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات میں عربی ادبیات کے حوالے سے بھی مختصر سی گفتگو کی ہے۔ البتہ جن ادبا اور شعرا کے نام اس میں وارد ہوئے ہیں ان سب میں پروف کی خامی ہے۔ آپ کے کام اور آپ کی شخصیت کو دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان میں آپ جمالیات کے امام کہے جانے کے مستحق ہیں''۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کے علم وفن پر کئی رسالوں نے گوشے شائع کیے۔ جن میں ماہنامہ شاعر بمبئی، ماہنامہ انشاء کلکتہ، مجلہ روشنائی کراچی قابل ذکر ہیں۔ کئی معتبر نقادوں نے کتابیں لکھ کر شکیل الرحمٰن کے جمالیاتی اسرار کو عالم آشنا کرانے کی کوشش کی۔ جن میں شکیل الرحمٰن کا جمالیاتی وجدان، حقانی القاسمی۔ شکیل الرحمٰن ایک لیجنڈ، شعیب شمس۔ شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی جمالیات، محمد صدیق نقوی۔ شکیل الرحمٰن تنقیدی دبستان کا ایک منفرد دبستان، اقبال انصاری۔ شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی، مسعود ہاشمی۔ شکیل الرحمٰن اردو تنقید کا نیا وژن، محمد صدیق نقوی کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی حس پر اتنا سب کچھ لکھے جانے کے باوجود بقول شیخ عقیل ان کی ''تنقیدی جمالیات کو کما حقہ ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا ہے۔ شاید کم ظرف صوفیوں کی طرح ان کے نقاد بھی راہ مقام میں بھٹک جاتے ہیں'' (ادب اور جمالیات)

پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نام اور کام کو دیکھ کر قاری حیرت واستعجاب کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔ جس قدر وقیع ان کا علمی کارنامہ ہے اسی قدر ان کی ایڈمنسٹریٹو لائف بھی بڑی قابل رشک رہی ہے۔ بہار کی دھرتی سے نکل کر وادی گل پوش میں قدم رکھا تو آخری دم تک دانش گاہ کشمیر کو سجاتے سنوارتے رہے۔ اردو شعبے میں لیکچرر بنے۔ ریڈر پروفیسر ہوئے۔ صدر شعبہ بنے۔ آرٹس فیکلٹی اور فیکلٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈین ہوئے۔ سنٹر آف سینٹرل ایشین اسٹڈیز کے بھی قائم مقام ڈین بنے۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ لوک سبھا کے ممبر ہوئے۔ مرکزی وزارت کا عہدہ سنبھالا۔ سنٹرل حج کمیٹی کے ممبر بنے۔ شاعر کے معاون مدیر رہے۔ غرضیکہ شکیل الرحمٰن نے جس میدان میں قدم رکھا وہاں اپنا جلوہ دکھایا۔ اپنے عشق کے جذبے سے اسے اوج کمال تک پہنچا کر دم لیا۔

■

Dr. Shams Kamal Anjum Dept. of Arabic Baba Ghulam Shah Badshah University, Rajori - 185234 (J&K)

خراجِ عقیدت

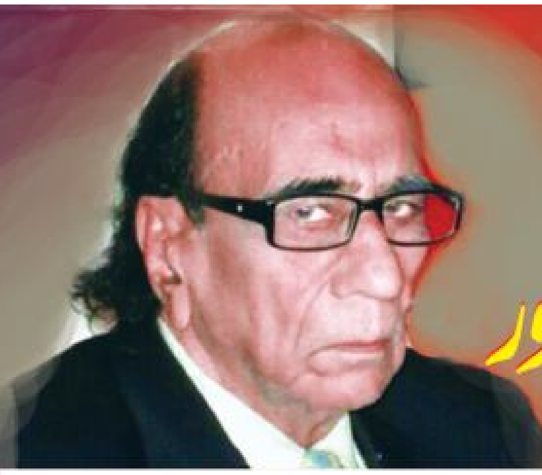

کون ہے جس کو کہیں آپ کے جیسا منظور

نجمے مصر اشوق

چراغ ہمیشہ سے زندگی کا استعارہ رہا ہے، وہ اسی قدر اور اتنا ہی روشن رہتا ہے جتنا کہ اس میں تیل ہوتا ہے۔ تیل کی مقدار پر ہی چراغ کی روشنی، اس کی زندگی اور تب وتاب کا انحصار ہے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی زندگی بھی روشن چراغ کے مانند تھی۔ ان کی زندگی کا چراغ جب تک روشن رہا بلاتفریق روشنی کی سوغات بانٹتا رہا۔ نہ ہندو نہ مسلم، نہ سکھ نہ عیسائی، نہ شیعہ نہ سنی... بس روشنی بانٹنا ہی ان کا مقصد حیات رہا... وہ اسٹیج پر ہوں یا کسی عالمی دانش گاہ میں، پروفیسروں کے درمیان ہوں یا دنیا کے بڑے ادیبوں، دانشوروں کے ہجوم میں، نظامت کریں یا فرائض صدارت انجام دیں۔ ان کے اخلاقی رویوں نے ہمیشہ متاثر کیا۔ کبر ونخوت جیسی کوئی شے کبھی ان کے قریب نہ پھٹک سکی بلکہ ان کے مخلصانہ اور مشفقانہ رویوں نے ان کے ہمعصر پروفیسروں کو ہمیشہ آزمائش میں مبتلا کیا کہ وہ اپنے سے بہت چھوٹے اور کم علم لوگوں میں ایسے گھل مل جایا کرتے تھے جیسے وہ ان کے ہم عمر یا معاصر ہوں۔ درحقیقت ان کے انھیں پرخلوص رویوں نے انھیں خواص کے محدود دائرے سے نکال کر لامحدود کر دیا تھا۔ مشاعرے کا اسٹیج انھیں زندگی فراہم کرتا تھا۔ عوام کو اُن میں اور انھیں عوام میں دلچسپی تھی۔

عموماً دولت وشہرت کا نشہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔ اور وہ دوسروں کو حقیر وکمتر سمجھنے لگتا ہے لیکن پروفیسر ملک زادہ منظور احمد شہرت و ناموری کی انتہا پر پہنچ کر بھی منکسر المزاج و نرم خو رہے۔ وہ ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ علالت اور کبرسنی کے باوجود انھیں دوسروں کی ضرورت کا خیال رہتا۔ معالجین لاکھ منع کریں مگر کوئی گھر پر آجائے، اصرار کرے تو وہ خود کو روک نہ پاتے اور صحت کا خیال کیے بغیر چلے جاتے۔ چھوٹے چھوٹے شاعروں کی کتابوں پر پھوٹی کوڑی لیے بغیر رائے قلمبند کر دینا، علاقائی محافل میں اپنے خرچ سے پہنچنا، آخر تک تقریب کا حصہ رہنا، اجرائی تقریب ہو تو کتاب کی کم از کم 5 جلدیں خرید کر دوسرے متمول حضرات کو کتاب خرید کر پڑھنے کی ترغیب دینا، وہ خصوصیات ہیں جواب دور تک نظر نہیں آتیں۔

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جنھیں کوئی نام دینا مشکل ہوتا ہے۔ میرا اُن کا رشتہ بھی اسی طرح کا ہے۔ وہ بیک وقت میرے سرپرست، مخلص بزرگ اور دوست تھے۔ خلوت وجلوت دونوں میں ساتھ رہے، شہر کے دور دراز علاقوں میں بھی گئے اور شہر سے باہر بھی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ انھوں نے میری گاڑی میں پٹرول نہ ڈالا ہو۔ مشاعروں میں مائک اُن کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ بڑی حوصلہ افزائی فرماتے اور ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے کہ اپنے وجود پر فخر ہونے لگتا۔

وہ میرے اُس دور سے بھی واقف تھے جبکہ میں طفل مکتب تھا۔ سر پر گھنے بال تھے اور شاعری کی ابتدا ہوئی تھی، تب پروفیسر صاحب پوری طرح توانا، چاق و چوبند اور متحرک تھے... ہمارے تعلقات میں استحکام کی وجہ استاد محترم نسیم اختر صدیقی کی ذات والا صفات بھی ہے جو کہ پروفیسر صاحب کے اچھے دوستوں میں تھے۔ خوب یاد ہے وہ میرے ہمراہ کئی مرتبہ میرے استاد کے دولت کدے پر گئے اور گھنٹوں شعری وفنی نکات پر گفتگو رہی۔ صد افسوس کہ اب استاد بھی ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ 6 جولائی 2008 کو انھوں نے رخت سفر باندھا تو ان کی یاد میں راقم الحروف نے نسیم اختر صدیقی اکادمی قائم کی۔ اکادمی کے تمام پروگراموں میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے ایک سرپرست کی حیثیت سے شرکت کی۔ مفید مشوروں سے نوازہ اور مسرت کا اظہار کیا۔

گذشتہ برس میں نے 'جوش وجنوں' نامی شعری مجموعے کے خالق مسعود حساس کی لکھنؤ آمد پر گفتگو کی میز سجائی تھی... نسیم اختر صدیقی اکادمی کے زیر اہتمام پریس کلب میں منعقدہ اس تقریب میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے لفظ 'جھاڑ' کے بے تکے استعمال پر مسعود کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اور دوران تقریر فرمایا تھا۔ غزل چھوئی موئی کی طرح نرم ونازک صنف ہے جو اس طرح کے الفاظ کی متحمل نہیں۔ لیکن بعد میں انھیں احساس ہوا کہ ان کی صاف گوئی سے حوصلہ افزائی کے بجائے دل شکنی کی فضا قائم ہو گئی۔ دوسرے دن وہ بضد تھے کہ اس جواں سال شاعر کو میرے پاس لے آؤ۔ میں اپنی تلخ گفتگو کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔

یہ تھے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کہ جنھیں اپنی عظمت سے کہیں زیادہ دوسروں کی فکر تھی کہ ان کے کسی لفظ سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ مجھے وہ ہمیشہ مشورہ دیتے اور کہتے تجھے اپنی الگ پہچان بناؤ، رباعی کے میدان میں نام پیدا کرو، اس صنف میں ملکہ رکھنے والے کم ہیں، لہٰذا اس صنف پر عبور حاصل کرو۔ اُن کا کہنا تھا دنیا کی زبانوں سے آنکھ ملانا ہے تو اُن زبانوں کے ادب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، نیز عالمی ادب سے باخبری کے بغیر آپ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔

اس طرح وہ اپنے چھوٹوں کی تربیت کرتے، علم کی چاہ بڑھاتے اور ہمیشہ کچھ نیا، کچھ اچھوتا کرنے پر آمادہ کرتے، 3 دہائی کے تعلق میں متعدد چھوٹے بڑے سفر میں نے ان کے ہمراہ کیے۔ ان کی علمی آنکھ اس قدر تیز تھی کہ وہ ایک نظر میں ہی بھانپ لیتے تھے کہ سامنے والے کی علمی سطح کیا ہے۔ لہٰذا وہ اسی معیار کی گفتگو کرتے، اُن کی پرلطف گفتگو، قصہ گوئی کے انداز اور لطیفے سنانے کے فن سے سبھی محظوظ ہوتے، کیا اپنے کیا پرائے سبھی اُن میں دلچسپی لیتے۔ اُن کی شخصیت ہی ایسی جاذب نظر اور متاثر کن تھی کہ سامنے والا متاثر یا مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتا... کبھی کبھی وہ ایسی جامع تقریر فرما دیتے کہ مذہب کا خصوصی علم رکھنے والے بھی حیران رہ جاتے۔ میں نے انھیں ایک ایسی محفل میں بھی سرخرو پایا جہاں چند اشخاص کے علاوہ سبھی باریش تھے، مخصوص اقسام کی کلاہ پہنے، سفید لباس زیب تن کیے بارونق چہرے، ایسا پاکیزہ ماحول کہ جیسے فرشتوں کی جماعت زمین پر اتر آئی ہو... اس موقعے پر ملک زادہ منظور صاحب نے ایسی تقریر فرمائی کہ آنکھیں چھلک اٹھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا اور ہر کوئی ان کا گرویدہ نظر آیا۔ پھر کیا تھا قطار در قطار شرکائے محفل مصافحے اور معانقے کے لیے آمادہ۔ میری آنکھوں نے ایسی

قدر و منزلت بہت کم اصحاب علم کی دیکھی ہے۔

شہر نگاراں میں انھوں نے صرف درس و تدریس کا فریضہ ہی انجام نہ دیا بلکہ ایک ماہنامہ 'امکان' کے نام سے جاری کیا۔ اس پرچے کی ترتیب و تدوین اور ادارت سے قبل بھی وہ کئی ادبی پرچوں سے وابستہ رہے۔ ادبی کتب پر تقریظات و مقدمات لکھتے رہے۔ مختلف موضوعات پر قلم برداشتہ سیکڑوں مضامین تحریر کیے۔ اخبارات و رسائل میں توقیر کے ساتھ شائع ہوئے۔

1929 میں بھدڑ، کچھوچھہ شریف ضلع امبیڈکر نگر کے ایک معزز خانوادے میں تولد ہونے والے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھلے ہی اپنی ظاہری وضع قطع سے خالصتاً دنیادار لگتے ہوں مگر ان کے درون میں اجداد کی صفات و کمالات اور اسلامی قدروں کا دریا رواں تھا اور کیوں نہ ہو جبکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے حقیقی پھوپھا تھے۔ جنگ آزادی اور دار العلوم دیوبند کے حوالے سے اُن کا نام اور کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ ایران کی مشہور ریاست سمنان کے بادشاہ کے فرزند مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ اپنے وقت کے مشہور صوفی بزرگ ہیں جو کچھوچھہ کے پاس بھدڑ میں آئے تو پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب کے بزرگوں نے بصد خلوص انھیں قیام کی جگہ دی۔ ملِک کا لقب بھی انھیں بزرگ کا دیا ہوا ہے جو تا عمر ان کے نام کا جز رہا اور جس کے اثرات ان کی شخصیت پر بہت نمایاں تھے... تمام تر صلاحیتوں اور ہر طرح کے مواقع کے باوجود وہ بہت کاروباری نہ ہو سکے۔

ناول، افسانہ، تحقیق، تنقید، نظامت، شاعری۔ کون سا میدان ہے جس میں ان کا جادو نہ چلا ہو مگر اردو کی ترقی و بقاء کے لیے انھیں مشاعرے کا اسٹیج زیادہ بہتر لگا۔ کیونکہ یہاں عوام کا ازدہام ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب عوام کو اردو سے روشناس کرانے اور ایوان بالا تک اپنی بات پہنچانے کی غرض سے ہی اسٹیج سے جڑے رہے۔ جبکہ ان کی صلاحیتوں اور منصب کا تقاضا کچھ اور ہی تھا۔ اس طرح ممکن ہے تحقیق و تنقید کے دشوار کام کو وہ اُس سنجیدگی سے نہ کر سکے ہوں جیسا کہ ان کاموں کا حق ہے مگر بھاگ دوڑ کے اس ماحول میں بھی وہ جو گرانقدر، مفید اور پراز معلومات کام کر گئے غور کیجیے اور بتائیے کہ ان کے معاصرین میں کتنوں نے سنجیدہ رہ کر، بند کمروں میں بیٹھ کر اُس درجے کا کام کیا۔

1994 میں انھوں نے ناول 'کالج گرل' لکھ کر چونکایا۔ 1957 میں 'اردو کا مسئلہ' 1961 میں شعری مجموعہ 'شہر ستم' آیا۔ اور 1964 میں 'مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن' کے عنوان سے ان کے نوک قلم سے ایسے سوالات ابھرے جو اس سے قبل کسی محقق کے قلم سے نہ نکلے تھے۔ علم و تحقیق اور جرأت و جسارت کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ بعد میں 'غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ' 'ابو الکلام آزاد۔ الہلال والبلاغ کی روشنی میں' جیسی نادر کتب بھی منظر عام پر آئیں... 'رقص شرر' ان کی خودنوشت ہے جو عام سوانحی کتابوں سے بہت مختلف ہے۔ کیونکہ مصنف نے خاندانی عظمت اور لن ترانیوں سے کہیں زیادہ اردو دنیا کے حالات، حکمران وقت کے مجہول رویّوں، ممالک غیر میں بسی اردو کی بستیاں، شاعروں ادیبوں کے ہمراہ گذارے شب و روز، مشاعروں کی روداد اور بہت سے ناقابل فراموش واقعات اس انداز میں رقم کیے کہ پڑھنے والا ہر صفحے کے بعد دوسرے اور تیسرے صفحے کے مطالعے پر از خود آمادہ نظر آتا ہے۔ پروفیسر صاحب کی زبان آزادی سے قبل کی زبان ہے۔ اُن کی نثر پر مولانا آزاد کی تحریر کے اثرات نمایاں ہیں۔ مگر یہ نثر کہیں کہیں شاعری جیسا مزہ دیتی ہے۔ شاعری کی دنیا میں بھی ان کا رنگ جدا ہے، ان کی شاعری عام شاعری نہیں ہے، کہ ہر کسی کی سمجھ میں آ جائے، ہر شعر میں ایک جہان، ایک کائنات آباد ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ان کی ایک نظم میں ہوا ہے:

ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچۂ قاتل
صلیب و دار پہ غزلیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی لہو لہان ہے دل
ہر ایک لفظ پریشاں ہر ایک مصرع اداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پشیماں ہیں
خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے حکایاتِ رفتگاں لکھے
نہ کوئی پھر سے علاماتِ خوں چکاں لکھے
فصیل دار، سروں کے چراغ، رقصِ جنوں
سراب، تشنہ لبی، خار، آبلہ پائی
دریدہ پیرہنی، چاک دامنی، وحشت
سموم، آتشِ گل، برق اور صیاد
روایتیں یہ مرے عہد کی علامت ہیں
علامتیں یہ مرے شعر کا مقدر ہیں
خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں

ان کی غزلوں کا مطالعہ آپ کو ماضی، حال اور مستقبل کی سچی تصویروں سے ملائے گا۔ تبھی آپ کو احساس ہوگا کہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی شاعری میں ہر عمر اور ہر عہد کے افراد کی ترجمانی ہے:

الجھن، گھٹن، ہراس، تپش، کرب، انتشار
وہ بھیڑ ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے

وقت شاہد ہے کہ ہر دور میں عیسیٰ کی طرح
ہم صلیبوں پہ لیے اپنی صداقت آئے

میں ایک جام ہوں کس کس کے ہونٹ تک پہنچوں
غضب کی پیاس لیے ہر بشر لگے ہے مجھے

بے چہرگی کی بھیڑ میں گم ہے مرا وجود
میں خود کو ڈھونڈتا ہوں مجھے خد و خال دے

وہی قاتل، وہی منصف، عدالت اُس کی، وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرفداری بھی ہوتی ہے

اس شہر ستم میں پہلے تو منظور بہت سے قاتل تھے
اب قاتل خود ہی مسیحا ہے یہ ذکر برابر ہوتا ہے

انھوں نے جہاں غزل کے حسن، اُس کے روایتی موضوعات اور عوامل پر بھرپور انداز میں گفتگو کی ہے وہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ آج کی غزل کے تقاضے کیا ہیں۔ یہی واقفیت اور عصری حسیت اُن سے یہ شعر کہلواتی ہے:

دورِ عشرت نے سنوارے ہیں غزل کے گیسو
فکر کے پہلو مگر غم کی بدولت اس کے

اور کہیں وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

سب نے سنی ہے جس میں عصر رواں کی دھڑکن
منظور ہم نے ایسا سازِ غزل دیا ہے

شاعر کا پیغام ہے

جو بات کہی جائے وہ تیور سے کہی جائے
جو شعر کہا جائے حریفانہ کہا جائے

بے شک علم و حکمت کے موتیوں سے ان کی شاعری لبریز ہے۔ غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج ان کی شاعری کو دوآتشہ بناتا ہے، احساس کے جگنوؤں سے بیاضِ دل جگمگا اٹھتی ہے تو خیالات میں عجیب سی ندرت و کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی غزل کے ساز میں عصر رواں کی دھڑکنوں کو سننے سمجھنے کے لیے فکر و فہم کو آسمان کی بلندی پہ لے جانا ہوگا۔

بلا مبالغہ وہ ایک ایسے شجر سایہ دار تھے کہ جن کی موجودگی میں عجیب سی فرحت و قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس لیے ان کی غیر موجودگی کا احساس شدت سے کھلے گا، آنکھیں ڈھونڈیں گی اور تدارک کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر ہم ان کی مثالی ادبی خدمات کے اعتراف پر مجبور ہوں گے۔

■

Sanjay Misra Shauque, 238 Kha/231, Dr. Deen Dyal Nagar (Khadra), Seetapur Road, Lucknow -226020

ابھینو گپت
کشمیر میں سنسکرت کی دنیا کا گوہر نایاب

غلام نبی خیال

ہندوستان کی سب سے بڑی اور قدیم کلاسیکی زبان سنسکرت کو اس لحاظ سے ایک خاص فوقیت حاصل ہے کہ اس زبان کے ذریعے ہندو دھرم کے بھی مذہبی اور عقیدتی صحیفے عوام تک پہنچے جن میں وید، اپنشد، مہابھارت، رامائن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسے آکاش وانی یعنی آوازِ فلک بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دیوی دیوتاؤں کی بھی زبان رہی ہے۔

کشمیر کے خطہ ارضی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی مٹی نے سنسکرت کے عدیم المثال شاعروں، ادیبوں، ماہرین لسانیات و جمالیات، مورخوں، محققوں، موسیقاروں، ڈراما نویسوں، طبیبوں، قانون سازوں، مذہبی علما اور سیاست دانوں کو جنم دیا جن کے علمی تجربے نے دور و نزدیک پہنچ کر ان میں سے ہر ایک کو عالمی سطح پر نابغہ روزگار کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔

کشمیر میں بالخصوص بودھوں اور ہندوؤں کے ادوارِ حکومت میں سنسکرت کے جن ممتاز فلسفیوں، تاریخ نویسوں، تحقیق کے ماہرین اور علمائے دہر نے اپنے علم و فن کے جوہر دکھائے اُن میں آنند وردھن (820-890)، کھیمیندر (990-1070)، جونہ راج (1411-1463)، کلہن اور سوم دیو (بارھویں صدی) اور سوم آنند، بلہن اور ناگ ارجن شامل ہیں جن کے جزوی حالات زندگی بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں سے علم بلاغت، منطق، فلسفہ اور دیگر مختلف علوم کی تحقیق و توضیع کا آغاز ہوا۔ کالیداس کے بارے میں بھی چند موزخوں کا خیال ہے کہ وہ بھی کشمیر نژاد تھا۔ اس دعویٰ کی تصدیق میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کے چند ڈراموں میں کشمیر کے زعفران اور کئی ایسے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو صرف کشمیر ہی میں پائے جاتے ہیں، لیکن دستاویزی حوالوں کی بنا پر یہ دعویٰ مدلل طریقے پر ثابت نہیں ہوسکا ہے۔

کشمیر میں تحریر کردہ سنسکرت کے قدیم ترین صحیفے 'نیلہ مت پوران' کے مطابق سرزمین کشمیر پہلے پہل ستی سر نام کی ایک جھیل تھی جس میں جلد بھو نامی راکھشس رہتا تھا۔ وہ ہر صبح کنارے پر آکر مقامی آبادی میں سے کئی انسانوں کو پانی کے اندر گھسیٹ کر انھیں نگل جاتا تھا۔ اس عذاب سے نجات پانے کی خاطر انھوں نے ایک خدا دوست ریشی کشیپ سے فریاد کی کہ وہ انھیں اس بلا سے آزاد کرے۔ کشیپ ایک ہزار سال تک عبادت کرتا رہا۔ پھر اسے آسمانی آواز کے ذریعے ہدایت ملی کہ وہ وادی کے شمال میں بارہ مولہ قصبے کے پاس پہاڑ میں اپنے آہنی ترشول سے سرنگ نکال کر وہیں سے پانی کے نکاس کو ممکن بنائے۔ کشیپ کے اس اقدام سے جھیل کا سارا پانی شمال مغرب کے میدانی علاقوں کی جانب بہہ نکلا اور جلد بھو سطح آب پر نمودار ہوا لیکن جب اسے کشیپ نے قتل کرنا چاہا تو وہ بھاگتا ہوا دور ایک جگہ پہنچا اور وہیں پر زیر زمین چھپ گیا۔ دریں اثنا کشیپ کی حامی ایک دیوی نے مینا کا روپ دھار کر اپنی چونچ میں ایک کنکر لے کر جلد بھو پر پھینک دیا جس سے یہ دیو زمین میں دھنس کر ہلاک ہوگیا۔ اس کنکر کی جگہ ایک پہاڑی نمودار ہوئی جسے ہاری پربت یعنی مینا کا پربت کہتے ہیں۔ یہاں کشمیری پنڈتوں کا ایک مقدس مندر ہے جہاں آج بھی ہر روز علی الصباح کشمیری ہندو پوجا کی خاطر کئی سیڑھیاں چڑھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اسے مقامی طور پر شاریکا دیوی مندر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کشیپ ریشی کے نام پر ہی اس خطے کا نام کشمیر پڑ گیا۔

اس دیومالائی حکایت کو یہاں اس مقصد سے بیان

کیا گیا تا کہ یہ بات ذہن نشین ہو سکے کہ کشمیر کے علم و آگہی کے ان اساتذہ نے بھی سنسکرت کو ایک دیومالائی زبان کی حیثیت میں اپنایا کہ ان کی تخلیقات کو بھی صحیفوں کی طرح مخصوص عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا اور پرکھا جائے۔ ورنہ وہ مروجہ زبانوں پالی اور پراکرت کو ہی ترجیح دیتے۔

کشمیر کی سرزمین ایک مرکز علم وادب بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان بھر سے یہاں اہالیان فن اور اصحاب دانش جوق در جوق آئے کیونکہ انھوں نے اس خطے کی قدرتی خوبصورتی کے قصے ذوق وشوق سے سنے تھے جن کی رو سے کشمیر عبادت الٰہی کے لیے نہایت ہی پرسکون اور اطمینان بخش جگہ تھی جہاں فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں اور دلکش باغوں اور بوستانوں کے آس پاس بقول علامہ اقبال: ''من خدا را دیدم آں جا بے حجاب''۔ ملک کے تپتے صحراؤں اور حدت بھرے میدانی علاقوں کے بر عکس انھیں کشمیر کی شاداب اور شگفتہ وادی میں روحانی طمانیت نصیب ہوئی جس کی بدولت انھوں نے اپنے فکری استدلال کے سہارے ادب لطیف کی وہ انمول قندیلیں روشن کیں جن کے نور سے ہند بھر کے دانشوروں اور طالبانِ علم کے اذہان منور ہو گئے۔

جب اشوکِ اعظم (304-232 BC) کے دور میں بدھ مت کشمیر میں وارد ہوا تو اس دھرم کے پیروکاروں نے جو تصانیف تخلیق کیں وہ پالی زبان کے بر عکس سنسکرت ہی میں تحریر کی گئیں حالانکہ ہندوستان بھر میں پالی ہی بودھوں کی مسلمہ زبان کی حیثیت میں عوام الناس میں رائج تھی۔ اس زبان میں اگر کچھ کتابیں لکھی گئی ہوں تو اب نہ ان کے آثار ملتے ہیں اور نہ ہی ان کا تذکرہ، لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ بدھ مت کے اصلی صحائف کے ساتھ پالی یہاں نہ پہنچی ہو۔1

کشمیر چودھویں صدی عیسوی تک سنسکرت کے علما و فضلا کا مخصوص علاقہ رہا ہے۔ جارج گریرسن کہتا ہے کہ: ''تقریباً دو ہزار سال تک کشمیر سنسکرت کے علوم کا مرکزِ فیضان رہا جہاں تاریخ، شاعری، حکایات اور فلسفے کی جولانیاں اہل فکر کی رہبری کرتی رہیں''۔ روایت ہے کہ اس دوران کشمیری خواتین بھی عام طور پر سنسکرت اور ایک اور قدیم زبان پراکرت ہی میں ایک دوسرے سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ سنسکرت ان دنوں سارے کشمیر میں اتنی عام فہم تھی کہ اسلام کے کشمیر میں آنے کے بعد بھی قبرستانوں میں سنگ ہائے مزار پر کتبے اسی زبان میں کندہ کیے گئے۔ ممتاز دینی رہنما سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدوم نے اپنا وصیت نامہ سنسکرت زبان ہی میں قلم بند کروایا۔

اس طرح سے ہندوستان کی ملی جلی ثقافت اور تاریخی میراث میں کشمیر ہی کے سنسکرت عالموں نے اپنی فکر انگیز تخلیقات سے ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے علمی تبحر کا چرچا نہ صرف ہند بلکہ وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا تک پہنچا۔ اشوک اور کنشک کے ادوار حکومت میں مہایان بودھ فلسفے کی تعلیمات مقامی راہبوں، لاماؤں اور رضاکاروں کے ہزاروں میل کے سفر کی بدولت چین، کوریا، جاپان اور تبت تک پھیل گئیں۔

کشمیر کے سنسکرت قلم کاروں نے بالخصوص شاعری کے میدان میں اپنا کمال دکھایا کیونکہ کشمیر کے فطری حسن نے انھیں اس نازک صنفِ فن کی طرف راغب کیا۔ کشمیر کے حیات بخش سبزہ زار، گنگناتے ہوئے روپہلے آبشار، مخملیں چراگاہیں، صاف وشفاف جھیلیں ان کی سخن گوئی کو جلا بخشتی رہیں مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کی ثقافتی دنیا کو ڈراما، رزمیہ، نغمہ، انشائیہ، افسانہ اور تدوین و ترتیب کے حوالے سے بھی شاندار ادبی سرمائے سے مالا مال کیا۔ اسی تناظر میں گیارھویں صدی کے شاعر بلہن نے کہا کہ: ''کشمیر میں شاعری ایک دل نشین مہک کے ساتھ یہاں کے زعفران کی طرح اگتی ہے''۔ کشمیر کے سنسکرت سرمائے سے ہندوستان کے شاہی درباروں میں حکمرانوں اور شہزادوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اس میں کالیداس کے ڈراموں پر مبسوط تجزیہ نگاری اور کیرالا کے واسدیو بھٹاتری پر کشمیر کے رام کنٹھ کا خاص تبصرہ شامل ہیں۔

ابھینو گپت (950-1020 A) کشمیر میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس نے کئی علما، صوفی اور ماہرین جمالیات پیدا کیے تھے۔ ابھینو گپت نے پندرہ اساتذہ سے فلسفہ اور فن میں خاطر خواہ تربیت حاصل کی۔ اس نے اپنی ستر سالہ زندگی میں پینتیس تصانیف تخلیق کیں جن میں سب سے ضخیم اور سب سے مشہور 'تانترلوک' ہے جسے تمام فلسفیانہ علوم کی انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اس میں بالخصوص کشمیر کے شیو فلسفے کی توضیح وتشریح بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ اس بے بہا تصنیف کا صرف اطالوی زبان میں ایک ترجمہ موجود ہے جسے رانیرو نولی (Raniero Gnoli) نے کیا تھا اور جس کا دوسرا ایڈیشن 1999 میں شائع ہوا۔ اسی کتاب کے انتیسویں باب کو جان آر ڈوپوچے (Dupuche) نے انگریزی میں منتقل کیا۔ تانترلوک کا اگرچہ کوئی انگریزی ترجمہ دستیاب نہیں لیکن شیومت کے ایک سرکردہ کشمیری عالم سوامی لکشمن جو نے اس کی تلخیص کی جسے اس نے اپنی انگریزی تخلیق Kashmir Shaivism- The Secret Supreme میں شامل کیا۔

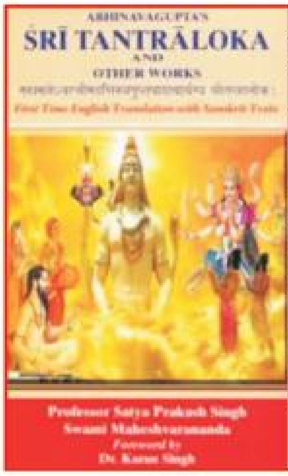

ابھینو گپت نے پندرہ اساتذہ سے فلسفہ اور فن میں خاطر خواہ تربیت حاصل کی۔ اس نے اپنی ستر سالہ زندگی میں پینتیس تصانیف تخلیق کیں جن میں سب سے ضخیم اور سب سے مشہور 'تانترلوک' ہے جسے تمام فلسفیانہ علوم کی انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اس میں بالخصوص کشمیر کے شیو فلسفے کی توضیح و تشریح بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

ابھینو گپت ساری عمر بودھ مت سے متاثر رہا۔ ابھینو گپت اُس کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ یہ لقب اسے اپنے ایک گمنام استاد نے دیا تھا جسے اس کی شخصیت میں صلاحیت اور قوت کے جوہر نظر آئے تھے۔ کشمیری مورخ پریم ناتھ بزاز کی رائے میں ''ابھینو گپت شیو فلسفے کا عظیم ترین مبلغ اور سربرآوردہ ادبی نقاد تھا جس کی مشہور عالم تصنیف تانترلوک کو بجا طور پر وحدت الوجود کی بہترین تشریح کہا جاسکتا ہے۔ اس یادگاری تخلیق میں 5,800 بند تھے اور اسے سینتیس ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔2

ابھینو گپت کی ماں ایک یوگنی تھی اور اس کے بیٹے کے بارے میں خدادوست اہل دل نے پیشین گوئی کی تھی کہ اسے رحم مادر ہی میں بھگوان شیو کی شکل وصورت عطا کی گئی تھی۔ ابھینو گپت کی والدہ ویملا کا اس وقت انتقال ہوا جب وہ صرف دو سال کا تھا۔ چونکہ اسے ماں کے ساتھ بے حد جذباتی وابستگی تھی لہٰذا اس نے اس صدمے کے بعد دنیوی معاملات کو تیاگ کر روحانیت کی دنیا میں اپنے آپ کو مستغرق کیا۔ والد نرسم گپت نے بھی شریک حیات

ابھینو گپت کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی. وہ ان سے اکثر کہتا: ''تم شہد کی مکھیوں کی طرح کام کروجو کئی پھولوں سے رس حاصل کرکے اس سے اپنا شہد تیار کرلیتی ہیں.اور یہ کہ صرف عظیم اساتذہ سے ہی تربیت حاصل کروپھر جو کچھ تم نے سیکھا ہو اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ''

کی جدائی کے بعد ایک سادھو کی زندگی کا رنگ اختیار کیا۔ابھینو گپت اپنے باپ ہی کو اپنا پہلا گورو مانتا ہے جس کی بدولت اسے گرامر، دلیل اور ادب کے شعبوں میں ابتدائی تربیت حاصل ہوئی۔ابھینو گپت تمام عمر غیر شادہ شدہ رہا۔اس کے بقول اسے روحانی نجات اس کے سب سے زیادہ چہیتے استاد شمبھو ناتھ کی نگہداشت میں ہی نصیب ہو سکی۔

اسے مذہبی علوم، جمالیات، فلسفہ اور تنقید کی اصناف پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جمالیات کے موضوع پر اس کی تصانیف 'ابھینو بھارتی' اور 'لوچنا' خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔خود ابھینو گپت نے بنارس میں اپنی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے ایک شاگرد ممٹا چاری نے بھی اپنے فن سے جمالیات اور شعریات میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ابھینو گپت کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی۔وہ ان سے اکثر کہتا: ''تم شہد کی مکھیوں کی طرح کام کرو جو کئی پھولوں سے رس حاصل کر کے اس سے اپنا شہد تیار کر لیتی ہیں۔اور یہ کہ صرف عظیم اساتذہ سے ہی تربیت حاصل کرو پھر جو کچھ تم نے سیکھا ہو اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ''3

ابھینو گپت کے حلیہ، رہن سہن، روزمرہ اور دیگر مصروفیات کے بارے میں جنوبی ہند کے دکن دیس سے آئے ہوئے ایک طالبِ آگہی کرشن بھوا نے اپنی ایک کتاب میں، جواب ناپید ہے، گپت کی زندگی کے دلچسپ واقعات پیش کیے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ: ''ابھینو گپت جی انگور کے باغ میں منڈپ پر، جس کا فرش سنگِ بلور کا تھا اور جس کے ارد گرد مختلف پھولوں کی کیاریاں دھوپ اور دیپ کی خوشبو سے مہک رہی تھیں، قیمتی موتیوں کے جھالر سے سجے ہوئے شامیانے کے نیچے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ اس جگہ چندن کی خوشبو چاروں اور پھیل رہی تھی۔ بھوا مزید کہتا ہے کہ: ''محفلِ ادب جمی ہوئی تھی۔ ساز و آہنگ کا سلسلہ جاری تھا۔اُن کے سامنے ان کے مشہور شاگرد کھیم راج وغیرہ زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے تھے۔ابھینو اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے جاتے تھے اور شاگرد اِن ارشادات کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ابھینو گپت جی کے دونوں طرف دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک عورت کے ایک ہاتھ میں شیورس کا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں کنول کا پھول تھا۔ دوسری عورت کے ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں انار کا پھل تھا۔کہا جاتا ہے کہ ابھینو گپت کی آنکھیں خمار اور مستی سے سرشار تھیں۔ان کے ماتھے پر بھسم کا تلک اور کانوں میں رُودر کے دانے آویزاں ہوتے تھے۔ان کی لمبی داڑھی سینے پر لٹک رہی تھی۔ سر لمبی جٹاؤں سے بھرا تھا۔رنگ گورا تھا۔یکھش دھوپ یعنی ایک قسم کی بوٹی کا رس گلے پر ملنے سے ان کا کنٹھ نیلے رنگ کا ہو گیا تھا۔وہ جنیو یعنی زنار بھی ڈالے تھے۔سفید ریشم کا فقیری چولا پہنے تھے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں مالا یعنی تسبیح لٹک رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے سریلی تان میں ستار بجایا کرتے تھے۔''4 ابھینو گپت کے اس روزمرہ سے قطع نظر ان کی عالمانہ خدمات اور فلسفے کی عمیق دنیا میں غوطہ خوری نے انھیں کشمیر کے ممتاز سنسکرت عالموں اور فاضلوں میں ایک ارفع مقام عطا کیا ہے۔

ابھینو گپت کی وفات کے بارے میں دینا ناتھ شاستری ہی کا کہنا ہے کہ: ''وہ ایک دن اپنے بارہ سو شاگردوں سمیت ذاتِ عالی پرم شیو کی صفات گاتے گاتے وسطی کشمیر کے دیہات من گام کے نزدیک بھیرو غار کے دہانے تک پہنچے اور نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو کر ذاتِ حق سے واصل ہوئے۔5

ابھینو گپت شاعری، موسیقی دینیات، درس و تدریس، تنقید، فلسفہ اور مذہبیات کا نابغہ روزگار عالم و فاضل تھا۔ اگر چہ اس نے تین درجن کے قریب تصانیف قلم بند کی ہیں لیکن آج یہ بیش بہا سرمایہ کہیں موجود نہیں ہے۔اس کے پسندیدہ موضوعات میں مذہبی رسومات، عقیدتی منظومات، فلسفیانہ نکتے اور فلسفۂ جمالیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شیو مت کی رو سے بھگوان شیو اور پاروتی میں جسمانی اور روحانی قوت (شکتی) مکمل طور پر موجود ہے۔ اسی شکتی کو اگر کوئی بھی بندۂ خدا اپنی روحانی صلاحیتوں سے بروئے کار لا سکے تو وہ روحانیت کی اُس منزل کو پا لیتا ہے جہاں اسے اپنے اندر ہی یہ شکتی بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ بھگوان کو اپنے من میں واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔ ابھینو گپت کا عقیدہ ہے کہ رحمتِ الٰہی سے سرشار عابدوں کو کئی چیزوں یعنی پتھر، لوہا، سونا وغیرہ سے بنائی گئی مورتیوں کی پوجا ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ دنیا کی لذت پا کر بھی انسان نجات حاصل کرنے کے اہل ہو سکتا ہے جس کی خاطر اسے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا اختیار کرنے یا دنیاداری سے کنارہ کش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہ ابھینو گپت نے انسان کو نیکی کی راہ پر چلتے ہوئے دین کے ساتھ دنیا کو بھی اپنانے کا درس دیا ہے۔ اُس کے فلسفۂ حیات کا لبِ لباب یہی کچھ ہے۔

ابھینو گپت کاعقیدہ ہے کہ رحمت الٰہی سے سرشار عابدوں کو کئی چیزوں یعنی پتھر، لوہا، سونا وغیرہ سے بنائی گئی مورتیوں کی پوجا ہرگز نہیں کرنی چاہیے. البتہ دنیا کی لذت پاکر بھی انسان نجات حاصل کرنے کے اہل ہوسکتا ہے جس کی خاطر اسے گوشہ نشینی اور ترک دنیا اختیار کرنے یا دنیا داری سے کنارہ کش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں.

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مفکروں، منطقیوں اور فلسفہ دانوں کے لیے جو مقام اصحابِ دانش و بینش کی نظروں میں طے پایا ہے اُس میں ابھینو گپت کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کا ہم پلہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے دنیا کے اس عظیم مفکر پر سارے ہندوستان اور خاص کر کشمیر کو فخر حاصل ہے۔

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو، پہلا حصہ، عبدالقادر سروری، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1981، ص 104-105
(2) سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر، کشمیر پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی، 1954، ص 29
(3) تانتر اور کشمیر کے ابھینو گپت کی تعلیمات: فلسفہ اور روحانیت۔ لنڈا جانسن، یوگا انٹرنیشنل، جنوری 2004
(4) ابھینو گپت، پنڈت دینا ناتھ شاستری، مشاہیر نمبر، ہمارا ادب، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1976، ص 136-137
(5) ایضاً، ص 137

■

Ghulam Nabi Khayal
15-Rawalpora Housing Colony
SRINAGAR-190005, Kashmir, India
Email: gulkhayal@gmail.com
Cell: 0-9419005909

دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری

سید یحییٰ نشیط

علم البشریات کے نقطۂ نظر سے بنی نوع انسان نے جتنے بھی معتقدانہ تصورات کی تشکیل کی ہے، ان میں سب سے زیادہ ہمہ گیر تصور 'مذہب' ہی کا رہا۔ چنانچہ دورِ عتیق سے لے کر آج تک تمام انسانیت مذہب ہی سے جڑی رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ مذہب انسان کا فطری داعیہ ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں انسان کے اندرون میں ضرور نمو پاتا ہے۔ یہ عقیدت کا ایسا منبع ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ اور اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں کو فیض یاب کرتا چلا جاتا ہے۔ مذہب ایسا عقیدہ ہے جو دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتا ہے۔ اس کی شاہ راہ پر دونوں کا سفر سریع اور سہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب ہر زمانے میں ادب کے لیے سرچشمۂ الہام رہا۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب نے اسی کے زیر سایہ اپنی قوت نمو کو آزمایا ہے۔ مذہب و ادب کے اس رشتے کی تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ مذہب کو جاذب توجہ اسلوب میں سمجھانے کی کوشش ادب ہی سے ممکن ہوئی ہے اور مذہب سے تحریک پاکر ایسا ادب کلاسیکی ادب کے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہے۔ چاہے وہ 'رامائن'، 'مہابھارت' ہوں یا 'ٹروزن وار'، 'پیراڈائیز لاسٹ' ہو یا 'مثنوی مولانا روم' انھیں، ان میں موجود مذہبی فکر نے ہی کلاسیک کا درجہ عطا کیا ہے۔

جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے تو اس کی نشو و نما ہی مذہبی فضا میں ہوئی۔ صوفی، سنتوں کے مذہبی افکار نے ان کی آبیاری کی اور یہ پودا پروان چڑھتا رہا۔ اس کی سرشت میں مذہبی عنصر کی فراوانی تھی، اس کی وجہ سے مذہبی رواداری اور جذباتی ہم آہنگی کو اردو ادب نے فروغ بخشا اور قومی یکجہتی کو استحکام نصیب ہوا۔ چنانچہ صوفیانہ تحریک کے بعد بھی اردو ادب برسوں مذہب سے جڑا رہا اور آج بھی اردو ادب مذہب کو فراموش نہیں کر رہا ہے۔

انیسویں صدی میں اگرچہ مذہبی رجحان میں کمی واقع ہوگئی تھی اور مادیت اور لذت پرستی کو فروغ حاصل تھا۔ ہندی میں 'بھکتی کال' ختم ہو گیا تھا اور 'شرنگارک ساہتیہ'' لکھا جانے لگا تھا۔ 'کام بھاؤ کتا' اور 'ولاس سادھنا' کو ہندی ادب میں ترجیح دی جانے لگی تھی۔ اردو شاعری کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایہام پسندی کے ذریعے ذو معنی الفاظ کے استعمال کو روا رکھا جا رہا تھا۔ سماج میں تعیش پسندی کے نا آسودہ حالات میں ذہنی آسودگی کے لیے ایہام گوئی شاعری میں مقبول تھی مگر مذہبی ادب پھر بھی لکھا جا رہا تھا۔ توریت اور بائبل کے اردو، ہندی ترجمے ہو رہے تھے، قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں لکھی جا رہی تھیں۔ رامائن اور مہابھارت کے قصوں کو ہندی اور اردو میں منظوم کیا جا رہا تھا۔ تمل، کنڑ اور بنگالی ادب کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ بھارتیندو ہرش چندر جہاں ہندو دھرم اور ہندو افکار کی ترویج کے لیے اپنی زبان و قلم کا استعمال کر رہے تھے وہاں اپنے رسائل میں قرآن اور بائبل کے ترجمے بھی شائع کر رہے تھے۔ ادھر سرسید اور ان کے رفقا قرآن مجید کے تراجم کر رہے تھے۔ سرسید تحریک سے ہٹ کر فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام مرزا کاظم علی جواں نے شکنتلا ناٹک لکھا تھا اور مولوی امانت اللہ شیدا' قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ہندی میں 'نیج دھرم، کرم' کی باتیں حب الوطنی کا عنصر لیے ہوئے تھیں تو اردو میں مذہبی عنصر تعیش پسندی کی نذر ہوتا جا رہا تھا۔ روحانیت اور مادیت کی ایسی کشاکش کے ماحول میں دوارکا پرشاد افق 13 جولائی 1864 کو لکھنؤ کے محلہ 'نوبستہ' میں پیدا ہوئے۔ گھر کا سارا ماحول شعر و ادب کا تھا اس لیے 'افق' کی طبیعت کو یہ ماحول راس آگیا اور بچپن ہی سے انھوں نے اردو شاعری سے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔ افق کا سارا خاندان مذہبی تھا۔ ان ہی افکار نے افق کی تقدیسی شاعری کو جلا بخشی اور انھوں نے ایک دو نہیں، مذہبی عقیدت کی حامل دس دس کتابیں تصنیف کر لیں اور بعض کتابوں کے منظوم و منثور تراجم بھی کر ڈالے۔ 'رامائن یک قافیہ'، 'رامائن مسدس'، 'شری رام ناٹک'، 'کرشن سداما ناٹک'، 'سناتن دھرم پرکاش' اور 'سوانح عمری گرو گووند سنگھ' ان کی تصانیف ہیں جبکہ 'رامائن بالمیکی'، 'مہابھارت'، 'شری مد بھگوت گیتا'، 'بھاگوت گیتا'، 'شری درگا درشن' وغیرہ ان کے اردو تراجم ہیں۔

بالعموم کہا جاتا ہے کہ عقیدت کی شاعری شعریت سے عاری ہوتی ہے۔ اس میں حسنِ شعری کو تلاش کرنا عبث ہے۔ یہ خیال کسی کمزور معتقدانہ شعری تصنیف پر ہو سکتا ہے کہ صادق آجائے مگر یہ ہر تقدیسی شاعری پر بطور کلیہ لازماً تھوپا نہیں جا سکتا۔ دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری پر بھی یہ کلیہ اپنے مثبت نقوش مرتسم نہیں کر سکتا۔ ہم بطور مثال ان کی تخلیق کردہ 'شری رام ناٹک' کو لے سکتے ہیں۔ ناٹک اردو ڈرامے کی ابتدائی صورت ہے۔ سماج

میں مذہبی شعور پیدا کرنے کا یہ ادبی وسیلہ افق کے زمانے میں نیا نیا تو تھا مگر نہایت مقبول رہا۔ امانت کی 'اندر سبھا' اور قیصر باغ اسٹیج پر کھیلے جانے والے ''رہس'' اس زمانے میں کافی مقبول تھے۔ ممبئی کے گرانٹ روڈ پر انگریزوں اور پارسیوں نے اپنے تھیٹر قائم کر لیے تھے، جہاں مذہبی رجحان کو بڑھاوا دینے کے ساتھ عوام کی دلچسپی اور ان کی تفریح کے لیے ڈرامے اور ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں بہرام جی فریدوں جی کا ڈرامہ 'خورشید' اور 'راجہ گوپی چند' کافی مقبول رہے۔ ڈرامے کی تکنیک کے نقطۂ نظر سے 'خورشید' اردو کا اولین ڈرامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس وقت ہندی میں بھارتیندو ہرش چندر کے مذہبی اور تاریخی ڈرامے بھی کافی پسند کیے جا رہے تھے۔ تفنن طبع کے لیے اپنائے جانے والے ناٹک کے فن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دوارکا پرشاد افق نے بھی ایک ڈرامہ 'شری رام ناٹک' کے عنوان سے لکھا تھا مگر تضیع اوقات اور تخریب اخلاق اس کا مقصد ہرگز نہیں تھا۔ ناٹک کے مزاج کے مطابق افق نے اس میں روایتی انداز میں منظومات اور منظوم مکالمے (ڈائیلاگ) بھی شامل کیے۔ ان منظومات میں واردات ڈرامہ کے مطابق خیال و معنی آفرینی پر فنکارانہ انداز میں توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً راون کا سیتا کو اغوا کر لینا اور کٹیا میں رام و لکشمن کا سیتا کو نہ پا کر بے چین ہو جانا۔ اس بے چینی کی حالت کو افق نثر میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اے جنگل کے برکھشو! تم نے جنک بنس کی کلپ لتا کہیں دیکھی؟ آہ! جس برکھش پر میرے من کا پنچھی بسیرا لیتا تھا، وہ آج یہاں سے اکھڑ گیا۔ میری زندگی کی جڑ کٹ رہی۔ تمھیں اپنے پھولوں اور پھلوں کی سوگند، پتا تو بتا دو۔ اے بن کے ہرنو، ہرنوں کی پیاری ہرنیو! تم میں سے کسی کو سیتا ہرن کی خبر ہو تو بتا دو...وغیرہ''

رام کی اس بے تابی سے لکشمن بھی بے چین ہو جاتے ہیں اور پس منظر میں یہ گیت سنائی دیتا ہے:

گئیں سیتا نہیں معلوم کہاں رو رو کر
پیچھے دشمن کے پڑا ہاتھ نہ کوئی دھو کر
نوک مژگاں کا نہ جنبہ ہوا خارستاں میں
روکا جھاڑی نے بھی ظالم کو نہ کانٹے بو کر
الجھی سنبل بھی نہ زلفوں کی طرفداری میں
سرو نے بھی پئے قامت نہ لگائی ٹھوکر
عوض ان آنکھوں کے اٹھا نہ ہرن بھی کوئی
نہ لڑے دیدۂ نرگس بھی مقابل ہو کر
بولی سوسن بھی دہن کی نہ ہوا خواہی میں
نہر کی لہروں نے بھی غم نہ کیا رو رو کر

اے افق ہوش میں دشمن کو اسے لانا تھا
کی بڑی سبزۂ خوابیدہ نے غفلت سو کر

اسٹیج پر پیش کردہ 'سیتا ہرن' کے منظر کی مناسبت سے یہ نظم، واقعہ کی ساری جزئیات کو شعری پیکر میں پیش کرتی ہے۔ بحیثیت شاعر افق نے منظرکشی میں محاکاتی روح سمو دی ہے۔ شاعر کے اس وتیرے سے 'شری رام ناٹک' کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔

سیتا، رام اور لکشمن اجودھیا سے جنگل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ باپ کے حکم کی پاسداری میں ان کا شوق بڑا دیدنی ہے۔ افق نے اس واقعہ کی منظرکشی میں اخلاقی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے:

برائے دشت گردی بخت کے چکر سے جاتے ہیں
رہو تم شاد اے اہل وطن ہم گھر سے جاتے ہیں
ملال دشت گردی کیا، غم صحرا نوردی کیا
کہ ارشاد پدر سے، مرضی مادر سے جاتے ہیں
نوید اے خار صحرا، مژدہ اے دشواری منزل
کہ ہم راہ وفاداری میں چشم و سر سے جاتے ہیں

'شری رام ناٹک' کی یہ دونوں نظمیں ڈرامہ نگار افق کی شاعرانہ شخصیت کو ان کے پورے خد و خال کے ساتھ متعارف کراتی ہیں۔

'رامائن' کو ناٹک، 'رہس' یا ڈرامے میں پیش کرنے کی اس ادبی روش کے علاوہ افق کے عہد میں رامائن کے اردو تراجم بھی ہونے لگے تھے۔ چنانچہ پرمیشر دیال شرما کا ترجمہ رامائن بالمیکی، دوارکا پرشاد افق کا 'مکمل رامائن بالمیکی'، منشی شنکر دیال فرحت کا 'رامائن منظوم'، بانکے بہاری لال کا 'رامائن بہار'، منشی سورج نرائن مہر کا 'رامائن مہر'، منشی جگن ناتھ خوشتر کا 'رامائن خوشتر' وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں افق نے البتہ ایک ہی رامائن کو تین طرح سے ترجمے میں ڈھالا ہے۔ 'شری رام ناٹک'، 'مکمل رامائن والمیکی' اور 'رامائن یک قافیہ'۔ رامائن یک قافیہ ترجمہ نہیں افق کی اپنی تخلیق ہے اور گیارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اتنی طویل نظم کو ایک ہی قافیے اور ایک ہی بحر و وزن میں پیش کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ یہ طویل نظم ان کی تبحر علمی اور فن پر مکمل گرفت کی دلیل ہے۔ رامائن کے سارے قصے کو انھوں نے اپنے اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے معاصر شعرا کے یہاں رامائن پر اس قسم کی کوشش کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس پر طرفہ یہ کہ سادہ اور سپاٹ زبان کی بہ نسبت انھوں نے لکھنؤ کی فصیح زبان کو ترجیح دی اور محاوروں کا جا بہ جا استعمال کیا۔ 'رامائن یک قافیہ' کو افق نے 1886 میں مکمل کیا تھا۔ ''رام رگھ کل، کبت رگھوکل، بھان رگھ کل چندرماں' سے تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔ شاعر اس نظم میں شری رام چندر جی کا سراپا یوں بیان کرتے ہیں:

دل کو خواہش ہے کہ رگھ بر کا سراپا ہو بیاں
کھینچتا ہے رام کی تصویر یوں کلکِ رواں
نور کی تصویر سر سے پاؤں تک ہیں رام چندر
سانولی صورت پہ سب کو مردمک کا ہے گماں
کان میں کنڈل مکٹ سر پر تلک زیبِ جبیں
مال وَے جنتی گلے میں ہاتھ میں تیر و کماں
وہ جبیں جس سے ہے چندن کے تلک کی آبرو
وہ جبیں جس نے بڑھائی خور کی توقیر و شاں
وہ بھویں جنکے اشارے سے لکھن نے دشت میں
سُپ نکھا کی ناک کاٹی لے کے شمشیرِ رواں
وہ پلک جو جانکی کے واسطے رہتی ہیں فرش
مردمک وہ جس سے ہم آغوش رہتی ہیں رماں
آنکھ وہ جس نے شری سیتا کو دیکھا باغ میں
جانکی کے ہجر میں جس سے رہے آنسو رواں

اس سراپا کے ہر شعر میں شاعر نے عضوِ بدن کے وصف کو رام چندر جی کے کسی نہ کسی واقعہ سے جوڑنے کی سعی فرمائی ہے، جس کی وجہ سے یہ سراپا محض خیال آرائی نہ رہ کر تاریخی حقائق کا منظرنامہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں صنعتوں کے استعمال نے شعری حسن میں اضافہ کیا

رامائن یک قافیہ ترجمہ نہیں افق کی اپنی تخلیق ہے اور گیارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اتنی طویل نظم کو ایک ہی قافیے اور ایک ہی بحر و وزن میں پیش کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ یہ طویل نظم ان کی تبحر علمی اور فن پر مکمل گرفت کی دلیل ہے۔ رامائن کے سارے قصے کو انھوں نے اپنے اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے معاصر شعرا کے یہاں رامائن پر اس قسم کی کوشش کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس پر طرفہ یہ کہ سادہ اور سپاٹ زبان کی بہ نسبت انھوں نے لکھنؤ کی فصیح زبان کو ترجیح دی اور محاوروں کا جابہ جا استعمال کیا۔ 'رامائن یک قافیہ' کو افق نے 1886 میں مکمل کیا تھا۔

ہے تشبیہات و استعارات اور مناسبات لفظی نے اشعار میں جان ڈال دی ہے۔ رامائن کے تہذیبی پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے افق نے اس طویل نظم میں بعض جگہ دانستہ طور پر ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ ان کی مجبوری یا اردو کی تہی دامانی نہیں بلکہ معنی آفرینی اور رامائن کی تہذیبی روح کو بطور خاص سمجھنے کے لیے شاعر نے اس وتیرے کو روا رکھا اور اسے صحیح سمجھا۔

رامائن یک قافیہ میں افق نے فطرت کی منظرکشی بھی انوکھے انداز میں کی ہے۔ ایسی منظر کشی میں ہندوستانی سماج کی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً صبح کی منظرکشی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نور کا تڑکا ہوا جب بولی مرغ نغمہ خواں
نور قدرت کی تجلی دیکھ اے چشم جہاں
وقت آپہنچا طلوع آفتاب شرق کا
جانکی بطنِ سبو سے ہونے والی ہے عیاں
پھولنے کو ہے کنول کا پھول ناف بشن سے
ہونے والے ہیں کنول کے پھول سے برھما عیاں
ہے کرن ہونے کو روشن چہرۂ خورشید پر
باندھنے والے ہیں سہرا رام رگھوکل چندرماں
برگ اشجارِ گلستاں نے بجائے جھانجھ دف
کھول کر پڑھنے لگے بھونرے کنول کی پوتھیاں
شنکھ بجتا تھا چٹکتی تھی جو سربستہ کلی
تھا سرِ قطرات شبنم سے قدم بوس آسماں

صبح کے اس سہانے وقت میں جانکی (سیتا) باغ کی سیر کو آتی ہیں۔ نسیم نے اپنی مثنوی 'گلزار نسیم' اور میر حسن نے 'مثنوی سحر البیان' کے علاوہ دکن کے بعض مثنوی نگاروں نے شہزادیوں کی سیر گلشن کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے مگر افق کے یہاں جانکی کی سیرِ چمن کا انداز کچھ اور ہی تیور دکھاتا ہے:

جانکی جی بھی اسی مطلب سے آئیں باغ میں
پاک دامانی جلو میں تھی، حیا تھی ہم عناں
یاسمیں رخ یاسمن بر سنبلیں مو سرو قد
نرگسیں دیدہ سمن لب گل بدن غنچہ دہاں
وصف سوسن کے سخن بنتی تھی دانتوں کی مسی
کلمۂ تعریف گل بنتے تھے لب کو رنگ پاں
عطرِ گل سونگھا، نظر کی، پوشش طاؤس پر
پائی گلشن کی ضیا، دیکھے لب طوطی کے پاس

سرمہ، چشمِ غنچۂ نرگس کا، سوسن کی مسی طوق قمری، غازۂ برگِ نہال بوستاں سیرِ چمن کی اس پوری روداد میں شاعر نے جانکی کی خوب صورتی کو بیان کرنے کے لیے اجزائے چمن ہی سے تشبیہات و استعارات چنے ہیں۔ اس سے حسن سراپائے جانکی کو ایک نیا زاویۂ نگاہ ملا ہے۔ افق نے 'رامائن یک قافیہ' 1886 میں مکمل کی تھی۔ یہ زمانہ شاعر کے عنفوانِ شباب کا تھا۔ اس لیے حسن وعشق کے بیان میں ان کے یہاں ذہن وشعور کی بہ نسبت لطیف جذبات کی نازک ضربوں سے کام لیا گیا ہے۔

دوارکا پرشاد افق رامائن کے قصوں کو بیان کرتے وقت نثر سے زیادہ نظم کو موثر سمجھتے ہیں۔ اپنے اس عندیہ کو 'رامائن والمیکی' کی سطور میں وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''نارد جی نے اس موقع پر جس عذب البیانی، شیریں زبانی سے کام لیا ہم اس کو پھیکی نثر میں دکھانا نہیں چاہتے۔ ناظرین کی طبیعت کو تھکانا نہیں چاہتے اس لیے ان کے مطلب کو قالب نظم پہنانے کے لیے خون جگر سے کام لے کر ناظرین کی ضیافتِ طبع کرتے ہیں۔''

(افق: رامائن بالمیکی [بال کانڈ حصہ اول] لکھنؤ ص 15)

پھر نارد جی کے خیالات کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

رام کے نام سے رام کی صورت دیکھی
آنکھ سے عزت و اکرام کی صورت دیکھی
دیدۂ دل نے جو اس نام کی صورت دیکھی
چشمِ باطن نے شری رام کی صورت دیکھی
دفع ہو رنج اگر لب پہ آکار آجائے
مکتی مل جائے زباں پر جو مکار آجائے

جو بشر کرتا ہے سیتا کا لقب وردِ زباں
زخم دل سیتا ہے مٹ جاتی ہے ایذائے نہاں
منہ سے نکلا جو رماں پورے ہوئے سب ارماں
دستِ رحمت سے سیا نے سیا چاکِ داماں
جانکی جی کا جہاں نام زباں پر آیا
جان کی خیر ہوئی مقصودِ دل بر آیا

پاپ ان ناموں کے رٹ لینے سے کٹ جاتا ہے
پاٹھ سے پاٹ یم راج کا گھٹ جاتا ہے
ٹاٹ افلاک و فلاکت کا الٹ جاتا ہے
آکے یم راج سرھانے سے پلٹ جاتا ہے
غمِ دنیا، غمِ فردا، غمِ عصیاں نہ رہا
دیوتا ہوگیا انساں سے وہ انساں نہ رہا

افق کے درج بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نثر پر نظم کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کا ایک اور ثبوت ان کا 'نظم اخبار' ہے جو مکمل طور پر نظم میں شائع ہوتا تھا۔ شاید اس نوع کا وہ اردو کی صحافتی تاریخ کا یگانہ اخبار ہے جس میں اداریے سے لے کر خبریں اور اشتہارات بھی منظوم نقل کیے جاتے تھے۔ افق خود اس اخبار کا بیشتر حصہ اپنے ہاتھوں سے لکھا کرتے تھے۔ ان کی نثری تخلیقات میں بھی اکثر جگہ نظمیں شامل کر لی جاتیں اور ان میں شعری خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا۔ جیسا کہ گزشتہ نظم میں رام۔ نام، رام۔ اکرام، آکار۔ مکار، سیتا (سینے کا عمل)۔ سیتا (جانکی)، جانکی۔ 'جان کی'، 'دلبر آیا'۔ 'دل بر آیا' (دل محفوظ ہوگیا، ہندی ترکیب) وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ لفظی صنعت کی یہ مثالیں ہیں۔ رامائن والمیکی کی یہ نظم مسدس میں ہے اور افق مسدس لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ حالی کے بعد اس صنف میں سب سے زیادہ تخلیقات دوارکا پرشاد افق ہی کی ہیں۔

افق کا 'دش اوتار درشن' بھی منظوم رسالہ ہے اور مسدس میں لکھا گیا۔ اس میں ہندوؤں کے وشنو بھگوان کے دس اوتاروں کا ذکر ہے۔ یہ مسدس رسالہ 'بھارت پرتاپ' کے اکتوبر 1901 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ہندوؤں میں بھگوان کا ایک تصور تثلیث یا تری مورتی کا رہا ہے۔ عمل کے اعتبار سے یہ بھگوان کے تین روپ، برہما، وشنو اور مہیش ہیں۔ برہما تخلیق کا دیوتا ہے اور اپنا کام پورا کر چکا ہے۔ اب کائنات کو چلانے اور ذی روح کو پالنے کی ذمے داری وشنو کی ہے۔ اور کائنات میں موجود ذی روح کا خاتمہ مہیش کے ذمے ہے۔ اس تثلیث میں سب سے زیادہ وشنو کے ساتھ عقیدت رکھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کو اچھے ڈھنگ سے چلانے کے لیے وشنو نے دس اوتار لیے ہیں۔ ان دس اوتاروں کا ذکر افق نے اس مسدس میں بیان کیا ہے۔ یہ اوتار درج ذیل ہیں۔

(1) متسیہ اوتار (مچھلی) (2) کتسیہ اوتار (کچھوا) (3) وراہا اوتار (خنجیر) (4) نرسنگھ اوتار (آدمی اور شیر کا جڑواں) (5) وامن اوتار (بونا) (6) پرشورام اوتار (7) رام اوتار (8) کرشن اوتار (9) بدھ اوتار اور آنے والا اوتار (10) کالکی اوتار ہوگا جو چار لاکھ دو سو پچاس ہزار برس بعد آئے گا۔

افق نے اس مسدس میں رام، کرشن کے اوتار کی تفصیل اور ان کے مناقب بیان کر دیے ہیں۔ باقی تمام کے لیے ایک ایک دو دو بند سے زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ کلکی اوتار کے آثار بیان کرتے وقت فی زمانہ گرتی ہوئی اخلاقیاتی سطح، تہذیبی گراوٹ، سماجی بدعملی اور قدروں کی پامالی پر آج کے تناظر میں موثر انداز میں قلم کو رواں کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے کرشن اور رادھا سے مفلس و لاچار اور بے بس و بے کسوں پر مہربانی کرنے کی درخواست کی ہے۔ 'دس اوتار درشن' میں مسدس کے تمام شعری اصولوں اور عروضی قوانین کو برتا گیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب

اورتراکیب کے استعمال پر خاص توجہ دی گئی ہے جس سے مسدس کا ہر مصرع رواں ہو گیا ہے۔ اس مسدس میں صنعتوں کا بھی وافر استعمال دکھائی دیتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

ایسی جب چشمِ تصور نے دکھائی جھانکی
موہنی ڈال گئیں دل پہ ادائیں بانکی
اک طرف ابر میں ضو برقِ شرر افشاں کی
اک طرف چاند میں سرخی سحرِ خنداں کی
رادھکا جی میں نہ کچھ فرق نہ کچھ شیام میں فرق
ایک دونوں میں فقط نام کو ہے نام میں فرق

یاد رہے کہ رادھا کرشن کے حسن کا تجزیہ رنگوں کے سہارے کرنے کی مثال ہندی کے شاعر سورداس کے یہاں سے پائی جاتی ہے۔ رنگوں کے سہارے ان شعرانے ان دونوں دیوتاؤں کے اوصاف بتائے ہیں۔ سورداس کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ اندھے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے خلاق تخیل سے رادھا کرشن کے رنگوں کا تجزیہ ایک دوہے میں اس طرح کیا ہے کہ شیام رنگ کرشن اور ہلدی رنگ رادھا ایک دوجے سے ملے تو سارا سنسار ہرا بھرا ہو گیا۔ نیلا اور پیلا رنگ ایک دوسرے میں جذب ہو کر ہرے رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ رنگوں کی تبدیلی کی اس کیمیائی کیفیت کو ایک اندھے شاعر کا بیان کر دینا ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ افق شیام رنگ کو بادل اور رادھا کے رنگ کو بجلی کے نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بھی رنگوں کا ایک قسم کا تجزیہ ہی ہے۔ نظم کے آخری بند میں وہ یوں ملتجی ہیں:

لکشمی ناتھ ہو اب مجھ پہ ترحم کی نظر
جانکی ناتھ ہو چشمِ کرم و لطف ادھر
رادھکا ناتھ افق آپ کا ہے دستِ نگر
دوارکا ناتھ مٹا دیجیے تکلیف و خطر
میں ہوں دین اور لقب دین دیال آپ کا ہے
نذر ہے خونِ جگر لیجیے مال آپ کا ہے

شری کرشن کی ایک صفت 'دین دیال' بھی ہے۔ مگر یہاں بقول منور لکھنوی شاعر کا اشارہ ان کے محسن پنڈت دین دیال شرما کی طرف ہے۔

(افق: دش اوتار درشن [بحوالہ: بھارت پرتاپ، اکتوبر 1901 ص 64)

دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری صرف ہندو دھرم تک ہی محدود نہیں بلکہ انھوں نے خالص اسلامی فکر کے حمدیہ اور نعتیہ اشعار بھی قلم بند کیے ہیں۔ شاعر کی مذہبی عقیدت اور رواداری کی غمازی کرتے ہیں۔ مثنوی 'سوانح عمری گرو گووند سنگھ' کی ابتدا وہ مثنوی کی فنی روایت کے مطابق حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں:

قلم کر استتی پرماتما کی
صفت لکھ خالقِ ارض و سماں کی
کیا ظلمت کو آخر نور جس نے
بنایا ابر سے کافور جس نے
مٹایا شب کا اندھیارا سحر سے
نصیبِ شام چمکایا قمر سے
سوادِ دل کو نورانی عطا کی
سیاہی کھوئی بجلی سے گھٹا کی
جہاں تاریکی چشمِ خواب کو دی
تجلی، کرمکِ شب تاب کو دی

(بحوالہ: ڈاکٹر کول بھٹنا گر 'ملک الشعرا افق لکھنؤ 2007 ص 260)

مجھے اپنی کوتاہ فہمی کا اقرار ہے پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس حمد میں سورۃ القلم اور سورۃ النور سے استفادے کا گمان ہو رہا ہے۔ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں بادلوں میں بجلی کا چمکنا، بادلوں کا برسنا، رات کے پردے سے دن کا نکلنا، اور دن کے پیٹ سے رات کا نکلنا نیز مختلف جانداروں کا پیدا ہونا وغیرہ کا ذکر ہے۔ افق کے شعور کی رو کا قرآن کی طرف پلٹنا ان کی مذہبی رواداری کا مظہر ہے۔ گرو گووند سنگھ کی سوانحی تاریخ گویا افتراقِ مذاہب کی تاریخ بنا دی گئی ہے۔ میرے دوست (مرحوم قیس جالندھری) نے بھی گرو گووند سنگھ کی تاریخ کو 'لاوا' کے عنوان سے مثنوی میں قلم بند کیا تھا۔ مگر بعض عصبیتی عناصر در آنے کی وجہ سے میرے تحقیقی مقالے میں اس کے حوالوں کو شامل کرنے سے مجھے منع کر دیا تھا۔ ایسے حساس موضوع کو بیان کرتے وقت حمدیہ اشعار نے افق کی مثنوی کی تلخی کو کم کر دیا ہے۔

اپنی طویل مثنوی 'اوتار' میں دوارکا پرشاد افق نے ہندوؤں کے اوتار کے نظریے کی فلسفیانہ تشریح کی ہے۔ انھوں نے حضرت محمدؐ اور عیسیٰ و موسیٰ علیہم السلام کو بھی اوتار کے دائرے میں لیا ہے۔ اس مثنوی میں وہ حضرت محمدؐ کی توصیف بیانی میں رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں:

محمدؐ جو عرب میں پیشوا تھے
بشر کی شکل میں نورِ خدا تھے
مسیحِ خوش بیاں گوہر فشاں ہے
محمدؐ کی صفت میں تر زباں ہے
رسول اندر حقیقت جز خدا نیست
بدیں پیغامِ جبریل آشنا نیست
محمدؐ نیست جز آئینۂ پیش
تو در وے می نمائی جلوۂ خویش
براں جلوہ بجاں خاطر نہادی
بدادِ حسن خود انصاف دادی
بہ بیں آئینہ و برخویش می ناز
جہاں فرما ازیں ہم بیش می ناز

اسی نظم میں شاعر نے حضرت علیؓ کی منقبت میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان تخلیقات کے علاوہ محرم کے عنوان سے لکھے گئے مسدس میں مرثیے کا انداز نمایاں ہے۔ افق نے شہدائے کربلا کے غم کے اظہار کے ساتھ ان کی منقبت بھی بیان کی ہے۔ اگرچہ یہ مسدس صرف ایک تہوار پر لکھا گیا ہے مگر شاعر نے اس کے پس منظر کے کوائف بھی بڑی عقیدت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ہولی اور بسنت رتو پر لکھی گئی منظومات بھی افق کے یہاں تقدیسی عنصر لیے ہوئے ہیں۔ افق کی غزلوں اور رباعیوں میں بھی تقدیسی رجحان پایا جاتا ہے۔ 'غزل یک قافیہ' تو ساری کی ساری حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔ شاعر نے اس غزل میں 'نادِ علیؓ'، 'ذوالفقارِ علیؓ'، 'تیغِ علیؓ'، 'ابن علیؓ'، 'سنگِ اسود کعبہ' وغیرہ تراکیب استعمال کی ہیں۔ ان تراکیب کے پسِ پشت حضرت علیؓ سے منسوب کوئی نہ کوئی واقعہ رہا ہے جسے اسلامی تاریخ میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس غزل کے درج ذیل شعر معنوی لحاظ سے بھی اہم ہیں:

ہے کافرانِ عشق کے سر پہ چلی ہوئی
ابروئے یار کیا ہوئی تیغِ علیؓ ہوئی
تھا وار ذوالفقارِ علیؓ کا غضب کا وار
شکلِ حسین شر کو نادِ علیؓ ہوئی
خط دیکھتے ہی ہو گیا آسیب اشک دور
مہرِ لفافہ آنکھ کو نادِ علیؓ ہوئی

ان غزلیہ اشعار میں اگرچہ سروکار کوائفِ عشقیہ سے ہے مگر افق نے تقدیسی عناصر کو ان سے جوڑ کر غزل کو محترم بنانے کی سعی کی ہے۔

مجموعی طور پر افق کی شاعری کی فضا تقدس مآب اور مذہبی جذبات کی امین ہے۔ ان کی فکر و نظر کی دروں بینی انسانیت کے مذہبی گوشوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے، اس لیے مذہب کی مقدس فضا ان کی شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہتی ہے۔ ان کی تقدیسی شاعری شعریت سے عاری نہیں ہے اور نہ اس میں صنعتوں کی کمی ہے۔ انھوں نے گنگا جمنا میں ڈھلی زبان استعمال کی ہے۔ زبان کے اس تقدس نے ان کی شاعری کو مقدس بنا دیا اور مذہبی عناصر نے اسے پاکیزگی عطا کی۔

■

Dr. Syed Yahya Naset
24, Kashana Kalgaon 445203
Yavatmal (MS)

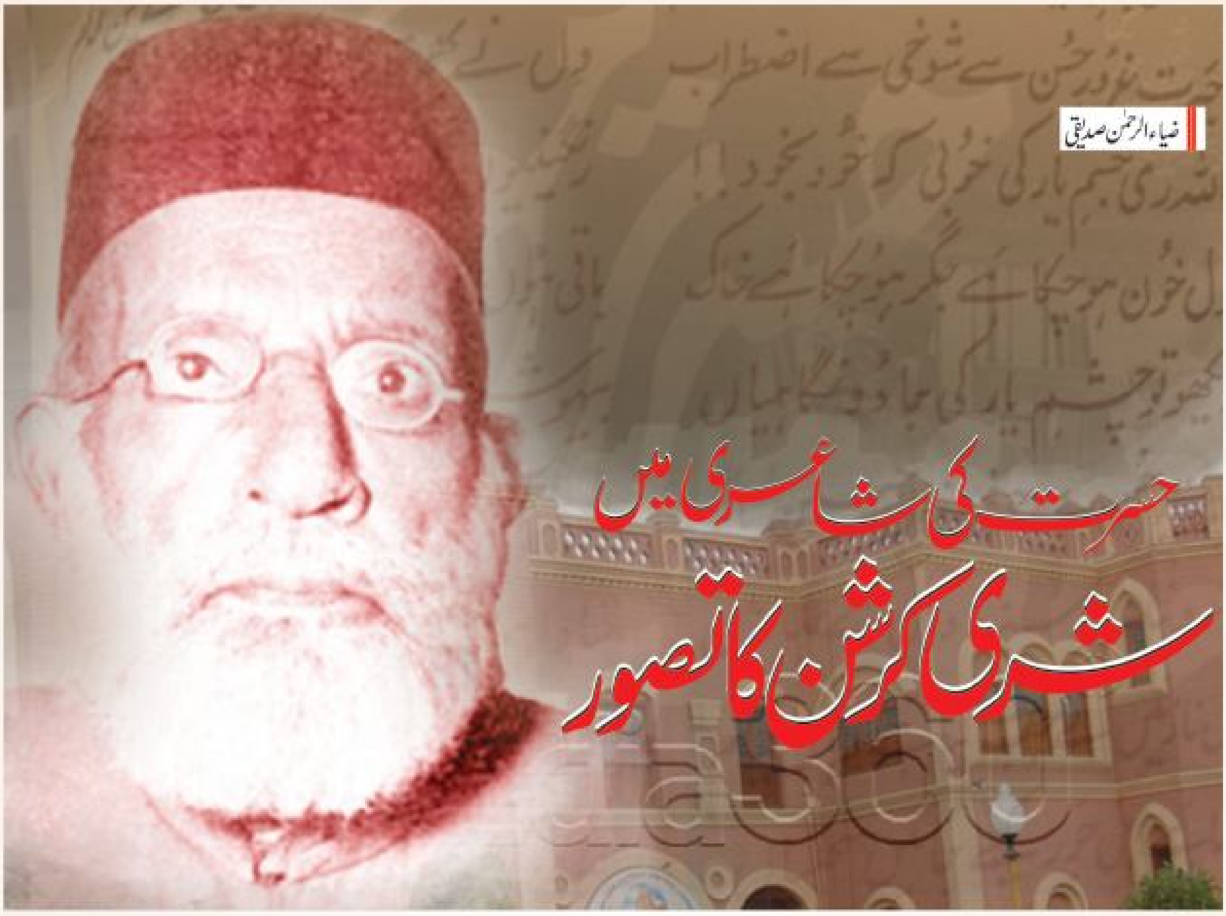

ضیاء الرحمٰن صدیقی

حسرت کی شاعری میں شری کرشن کا تصور

حسرت ایک کھلی آنکھ کا شاعر ہے جس نے غزل کو سچ بولنا سکھایا اور اردو شاعری میں پہلی بار اپنے دیوان کے عنوانات قائم کیے۔ اساطیری علامات کے ذریعے اپنا پیغام دیا۔ عروض و آہنگ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ تہذیبی سطح پر یہاں کی اساطیری اور قدیم زندگی کو نئی جہت اور نئے پہناؤں سے روشناس کرایا۔

اگرچہ عشق ایک عمومی موضوع ہے جو اردو کے کم و بیش ہر شاعر کے یہاں موجود ہے لیکن حسرت کے یہاں سنجیدگی، ملائمیت، عشق کا احترام اور زیرلبی کی کیفیت کا نہایت ہی خوب صورت اور لسیاتی تصور ملتا ہے جو نغمگی اور غنائیت سے تعبیر ہے لہجے کی نرمی اور لطافت قاری کو یقیناً متاثر کرتی ہے۔

حسرت کی شاعری میں ان کی آپ بیتی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے:

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت کے یہاں تین موضوع بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

عشق، سیاست اور تصوف، حسرت کی زندگی اور ان کے مشاغل کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی باقاعدہ صوفی نہیں تھے لیکن انھیں صوفیا اور بزرگوں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی اور وہ صوفیا کے مقامات مثلاً اجمیر شریف، کلیر شریف، بہرائچ اور فرنگی محل وغیرہ پر پابندی سے حاضری دیا کرتے تھے اور عرس میں بھی شریک ہوتے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ وجدان کا رہین منت ہے:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حسرت اپنے دیوانِ ہفتم کے طبع اوّل کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے۔''

حسرت اکثر و بیشتر اپنے پیر و مرشد کی درگاہ پر حاضری کے لیے جایا کرتے تھے۔ بانسہ ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے۔ ردولی بارہ بنکی کا ایک مشہور قصبہ ہے جو ہندی کے بلند پایہ شاعر عبدالقدوس گنگوہی کا وطن ہے۔ ہندی مثنوی دریاؤ نفس جواہر کے خالق قاسم شاہ کا مسکن ہے۔ پریم چنگاری کے مصنف شاہ نجف علی سلونی بھی بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ کاکوری میں مقیم شاہ محمد قاسم قلندر جنھوں نے شانت رس کی تخلیق کی قادریہ سلسلے کے جید بزرگ تھے ان کے فرزند شاہ تراب علی قلندر صوفی بزرگ اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان تمام صوفی شعرا کو کرشن سے عقیدت تھی ان صوفی ہندی شعرا نے مختلف انداز میں کرشن کی داستان عشق کو اپنے اشعار میں جگہ دی ہے کیونکہ حسرت ان بزرگ صوفیا کے مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ انھوں نے ان کلام کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لیے حسرت کی طبیعت پر ان صوفیا کی تعلیمات کے اثرات مرتب ہونا یقینی تھا۔ حسرت سلسلہ قادریہ کی ایک شاخ سے بھی منسلک تھے اور قادریہ سلسلے کی ہر شاخ کے بزرگ کے یہاں شری کرشن سے عقیدت ملتی ہے۔

ان بزرگوں نے کرشن بھگتی کی شاعری کی اصطلاحات کو مختلف پہلوؤں سے استعمال کیا ہے اور علامتوں کے ذریعے متصوفانہ معنویت سے روشناس کرایا ہے۔

صوفیا سے عقیدت اور ان کے کلام کے اثرات حسرت نے بھی قبول کیے۔ انھوں نے گیتا کا بھی مطالعہ کیا اور تلک کی لکھی ہوئی گیتا کی تفسیر بھی پڑھی جس کا ثبوت ان کے اشعار میں ملتا ہے:

ہر ہندو کا مضبوط ہے جی
گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی
پھر آئیں گے مہراج تلک

'زمانہ' کانپور کے اکتوبر کے شمارے میں حسرت کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس میں پہلی بار شری کرشن کا ذکر حسرت کی متھرا میں حاضری کے حوالے سے ملتا ہے، یہ ایک طویل غزل ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں:

آنکھوں میں نور جلوۂ بے کیف وکم ہے خاص
جب سے نظر یہ ان کی نگاہ کرم ہے خاص
کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرت کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیرقدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمھارا کرم ہے خاص

کرشن کے یہاں عشق کا تصور اسلامی تصوف سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں ایسی ماورائیت شامل ہے جو عشق کے حدود کو وسیع تر کرتی ہے جو نہ خالص دنیاوی ہے اور نہ ماورائی۔ یعنی ان کے یہاں لمسیت بھی ہے اور ماورائیت بھی۔ انسانی جسم کا تقاضا بھی عشق ہے اور وجدان کا تقاضا بھی عشق ہے۔ البتہ وجدان کا تقاضا ماورائیت کی طرف مائل کرتا ہے۔

'Sister Navedita' نے اپنی کتاب 'The Hindus & The Bhudist Mythology' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور بعض اہم نکات کی طرف واضح طور پر اشارے کیے ہیں۔

تلک نے گیتا کی تفسیر لکھتے وقت کرم مارگ پر زیادہ زور دیا ہے اور کرم مارگ حسرت کے ذہن کو اپیل کرتا ہے۔ کلیات حسرت کے مرتب کا خیال ہے کہ:

''ان کا خیال تھا کہ گیتا میں وراگ اور تیاگ پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ شری کرشن عملی یعنی کرم یوگ کے فلسفے کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک گیتا اور اسلام کی تعلیمات میں قدرے یکسانیت پائی جاتی ہے۔''

غالباً یہی تصور تھا جس نے حسرت کو کرشن کا گرویدہ بنادیا۔

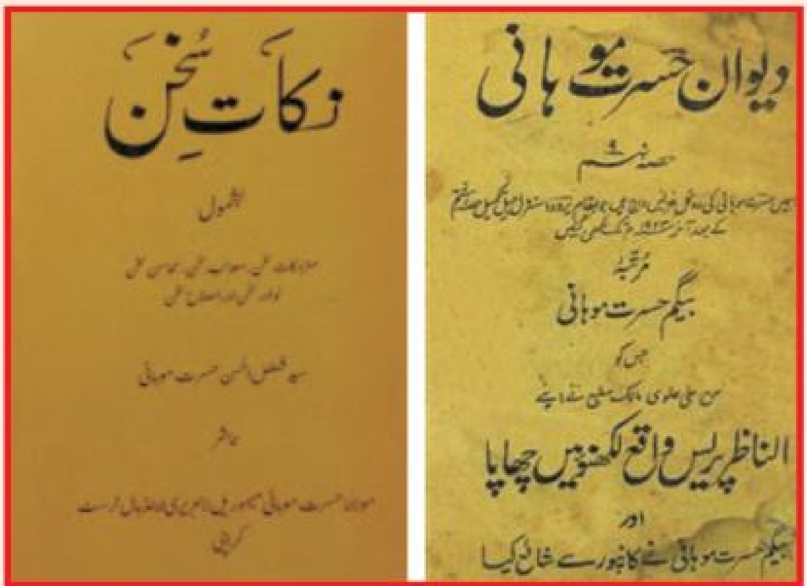

صوفیا کرشن کو نہ تو وشنو کا اوتار مانتے ہیں اور نہ ہی مجسم خدا، بلکہ صوفیا کائنات کو ایک تکوینی اکائی تصور کرتے ہیں جو حسن، عشق، اور ہجر سے تشکیل پاتی ہے اور بقول گیسو دراز عشق، عاشق اور معشوق تینوں کسی ایک مقام پر ایک ہوجاتے ہیں۔ شری کرشن کے اسی تصور پر صوفی بزرگ شیدا نظر آتے ہیں۔ حضرت کنہیا کائنات کا وہ مرکز ہیں جہاں حسن و عشق اور ہجر تحلیل ہوکر رہ جاتے ہیں اور ان کی حسیت کے لیے کرشن اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں لیکن یہ تمام تر اظہار علامتی ہیں۔

(بحوالہ آج کل، مئی 1985، ص 33)

انھیں علامتوں کی روشنی میں ہمیں حسرت کے کلام کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ حسرت کے یہاں کرشن کے لیے مترادف الفاظ، کنہائی، بنواری، مراری، گردھاری، بہاری، شام، برج، نندلال، وغیرہ کا استعمال بڑی کثرت سے ملتا ہے۔

حسرت نے کنہیا کا لفظ معشوق کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے جو ان کی اپنی ندرت ہے:

پارا تار پیا سے ملاؤ
رزاق پیا، بانسے نگریا کے بسیا
بانسے نگر کے فرنگی محل کے
ایکی نام کے دوئی کنھیا
رزاق وہاب پیا بن حسرت
ہمری تھا کا ہے کون سنیا

حسرت کے اشعار میں متھرا، گوکل، بندرابن، برسانہ اور نندگام جیسے مقامات کا ذکر آیا ہے:

متھرا نگر ہے عاشقی کا
دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
ہر ذرہ سرزمین گوکل
دارا ہے جمال دلبری کا
برسانہ و نند گاؤں میں بھی
دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغام حیات جاوداں تھا
ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نور سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغ آگہی کا

حقائق ہندی کے مصنف کے مطابق بانسری اس کے مترادف اس بات کی علامت ہے کہ یہ ساری کائنات اسی وجود مطلق کی موسیقی کی آواز ہے۔ یہ 'کن' کا بھی مترادف ہے۔ حسرت نے کرشن کی بانسری کو انھیں معنی میں استعمال کیا ہے کہ کرشن کی بانسری حیات جاوداں کا نغمہ سناتی ہے۔

صوفیا کی اصطلاح میں دیوالی یا ہولی کے ذکر سے عشق کا لطف و انبساط مراد ہے۔ حسرت کی ہولی میں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے:

شیام بھرے پچکاری
تھرتھر کانپت لاجن حسرت
دیکھت ہیں نرناری

(12 مارچ 1924)

حسرت کی متصوفانہ شاعری مختلف کیفیتوں، علامتوں، اشاروں اور اصطلاحوں کے ذریعے احوالِ عشقِ حقیقی اور مقامات معرفت کی جانب نشاندہی کرتی ہے۔

Dr. Ziaurrahman Siddiqui
Asso. Prof. Principal Urdu Teaching & Research Centre (Hukoomate Hind)
Saproon,Solan-173211(HP)

قندیل نظر

محمد یحییٰ جمیل

اردو شاعری میں گوتم بدھ

چھٹی صدی قبل مسیح دو وجوہ کی بنا پر اہم ہے کہ یہیں سے بھارت کی معتبر تاریخ کے دروازے کھلتے ہیں اور اسی صدی سے توہمات اور ضرر رساں روایات کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔ اسے بھارت میں فکری اور روحانی انتشار کی صدی کہنا چاہیے کہ اس صدی میں سخت ریاضت کرنے والے راہبوں کے ساتھ عالموں اور فلسفیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو کمزوروں کے پرتشدد مذہبی استحصال سے نالاں تھے۔ ان میں گوتم بدھ (483 تا 563 ق م) کو خصوصیت حاصل ہے۔ گوتم بدھ کو دنیا کے بڑے حصے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کے پیش نظر وہ بھارت کی سب سے عظیم شخصیت بن کر ابھرے ہیں۔ پچھلے ڈھائی ہزار سالوں میں گوتم بدھ کی زندگی اور ان کی تعلیمات پر بے شمار خیالی اور فرضی روایات کی تہیں جم گئیں۔ اس کے باوجود ان کی تعلیمات میں پنہاں سچائی کے نور نے انسانی خیالات پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ اردو ادب اس سے بے گانہ بہر حال نہیں رہا لیکن حق یہ ہے کہ یہ بدھی فلسفے کو خاطر خواہ جذب نہیں کر سکا۔ بدھ پر لکھی گئی مخصوص نظموں اور مذہبی کتابوں کے تراجم کے علاوہ جہاں گوتم بدھ کا نام آتا ہے اسے خانہ پری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

حیرت ہے کہ اردو ادب میں استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے والی اس شخصیت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جس وقت اردو پروان چڑھی اس وقت بھارت میں بدھ مذہب کا تقریباً زوال ہو چکا تھا اور گوتم بدھ کو وشنو کے نویں اوتار کا درجہ دے کر اسے ہندو مذہب میں ضم کرلیا گیا تھا۔ گوتم بدھ کی اپنی شخصیت پر، ان کے انقلابی خیالات کے باوجود، عقیدت اور اساطیر کے دبیز پردے پڑ گئے تھے۔

بہرکیف اردو شاعری میں بدھیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل بدھ کے خیالات اور افکار کا بیان۔ دوم بدھ مذہب کی مقدس کتابوں کے تراجم اور سوم بدھ سے متعلق سوانحی اور منقبتی نظمیں۔ لیکن اول الذکر کی نوبت کم ہی آئی۔ جن شعرا نے گوتم بدھ کے پیغام کو سمجھا ان میں علامہ اقبال شاید پہلے شاعر ہیں۔ وہ اپنی نظم نانک گوتم بدھ سے شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ گرو نانک ظلم اور استحصال کے خلاف اٹھنے والی اسی آواز کے تسلسل کا نام ہے جو بدھ نے بلند کی تھی۔

اقبال کو دکھ ہے کہ بھارت نے اپنے ہیرے کی قدر نہ کی جس طرح درخت اپنے پھل کی مٹھاس سے بے خبر ہوتا ہے اسی طرح ہندستانی عوام بدھ کے اصل پیغام سے بے خبر رہے۔ گوتم بدھ نے زندگی کی حقیقت کو سمجھایا:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بدقسمت رہے آوازہ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا

(اقبال، کلیات اقبال، بانگ درا، دہلی، ص 180)

ایک عرصے بعد ڈاکٹر امبیڈکر نے گوتم بدھ کی بازیافت کی اور ظلم و استحصال کے خلاف اپنی جدوجہد میں بدھ کے فلسفے کو اپنایا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر کی تحریک کا وافر لٹریچر اردو میں بھی ہے۔ ان کا اخبار 'بھیم پتریکا' اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ ان کے پیرو نانک چند رتو، بھگوان داس، اے آر بالی وغیرہ اردو کے اچھے ادیب تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کی تعریف میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اردو ادب کا یہ پہلو پردۂ خفا میں ہے اور تحقیق کا منتظر ہے۔ امبیڈکری تحریک کے تحت جو احتجاجی ادب اردو میں وجود میں آیا اسے بدھ کے افکار کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔ جدید اردو شعرا میں جینت پرمار کی نظمیں اس کی اچھی مثال ہے۔

نظموں میں بیان ہونے والے بدھی فلسفے کے پیش نظر راج نارائن راز بھی قابل ذکر شاعر ہیں۔ ان کی ایک نظم میں گوتم بدھ دوبارہ دنیا میں آکر دکھیوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ انھیں دکھ ہے کہ اس دنیا میں میری پرستش ہوتی ہے لیکن میرے فلسفے کو سمجھا نہیں جاتا۔ کچھ شعر دیکھیے:

لیکن یہ انساں کیسے ہیں   اپنے آپ میں گم رہتے ہیں
ان کو پتا کب اس کا ہے کچھ   جس جا ہیں میری تصویریں
سجے سجائے ہیں بت میرے   اور کتابیں جن میں لکھی ہے
باتیں میری میری گاتھا   میری ذات کی ایک کرن بھی
ان میں نہیں ہے ان میں نہیں ہے

(ہندوستان ہمارا، جلد 1، ص: 392، بحوالہ ڈاکٹر اقبال احمد خاں، اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر، امراؤتی، 1997، ص: 108)

اب کچھ تراجم پر نظر ڈالیں۔ بدھ مذہب کی مقدس کتابوں کے تحت جو نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ ہے منور لکھنوی۔ واضح رہے کہ بدھ مذہب کی خاص کتابیں ترِی پٹک، جاتک، للت وستار اور بدھ چرتر ہیں۔ اوّل الذکر دونوں کتابیں پالی میں ہیں اور مؤخر الذکر سنسکرت میں۔ ترِی پٹک کے تین حصے ہیں، سُت (وعظ) پٹک، ونے (کردار) پٹک اور ابھی دھم (نفسیات) پٹک۔ سُت پٹک کے پانچ حصوں میں سے ایک ہے دھم پد۔ مضامین کے لحاظ سے اس میں فلسفہ، مذہب، اخلاق اور سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

(اے ایل باشم (ترجمہ ایس غلام سمنانی) ہندوستان کا شاندار ماضی، دہلی 1998، ص: 369)

دھم پد کی اہمیت کے پیش نظر بشیشور پرساد منور لکھنوی نے اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دھم پد کے ترجمے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''پالی زبان کے ایک شلوک کا پانچ اشعار میں ترجمہ کیا گیا ہے تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح ہوجائے......

......اس کے تمام ابواب میں بحر کی یکسانیت اختیار نہیں کی گئی اور ایسا دانستہ کیا گیا ہے تاکہ یکسانیت سے

طبیعت نہ گھبرائے۔''

(منور لکھنوی، دھم پد، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1954، ص 165)

ان کے ترجمہ کا نمونہ دیکھیے:

جتنے مسلک ہیں وہ پہلے ہوتے ہیں آئینۂ دل سے
دل کی بے شک بات بڑی ہے ہر مسلک کی تہہ میں یہی ہے
جب گفتار کی نیت بد ہو جب کردار کی نیت بد ہو
ہوتی ہے انساں کو ایذا کرتا ہے دکھ اس کا پیچھا
جیسے بیل کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں گاڑی کے پہیے

(عرش ملسیانی، ہم ایک ہیں، دہلی، 1976، ص: 159)

گوتم بدھ کے حالات زندگی یا ان کی زندگی کے اہم واقعات کو بیان کرنے والی کئی نظمیں موجود ہیں۔ ان نظموں میں عموماً ان کے گھر چھوڑ کر جانے کے قصے کو نظم کرنے میں خصوصی دلچسپی لی گئی ہے۔ کچھ شعرا کا کلام ملاحظہ ہو۔ فضل الرحمٰن گوتم بدھ کے گھر چھوڑنے کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

رہرو کو اٹھانا تھا قدم راہ طلب میں
منزل کے نشاں چمکے جس امید کی شب میں
نکلا وہ کئی بار پلٹ آیا کئی بار
بازی میں دل و دین کبھی جیت کبھی ہار
پھر دل میں کہا بھاگ کا لکھا نہیں ٹلتا
انسان کے ماتھے کا نوشتہ نہیں ٹلتا
ودیا کا طلب گار اہنسا کا پجاری
بن بن میں خود آگاہ پھرا بن کے بھکاری

(فضل الرحمٰن، گوتم بدھ، انجمن ترقی اردو، حیدرآباد، ص: 22، بحوالہ ڈاکٹر یحییٰ نشیط، اسطوری فکر و فلسفہ (اردو شاعری میں)، پونہ، 2008، ص: 97)

'کائنات دل' منور لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں 'تصویر حقیقت' کے نام سے گوتم بدھ پر جو نظم ہے اس کے کچھ اشعار دیکھیے:

رلایا ایک مرد زار نے برسوں لہو کس کا
عجب تاثیر تھی بے کس کی بیماری کے منظر میں
تڑپ اٹھا مصیبت دیکھ کر یہ کون پیری کی
بھری تھی مثل شعلہ آگ کس کے قلب مضطر میں
جنازہ دیکھنا کس کے لیے اک درس عبرت تھا
تأمل زندگی سے درد پیدا ہوگیا سر میں

(ہندوستان ہمارا، جلد اول: 391، بحوالہ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر، ص: 107)

تلوک چند محروم 'گنج معانی' میں گوتم بدھ کی زندگی کے اسی واقعے کو بیان کرتے ہیں:

رخصت اے ماں باپ بیوی رخصت اے اہل دیار
دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشک بار
کی تمھارے ہی لیے میں نے یہ غربت اختیار
دیکھیے کیا کیا دکھائے گردش لیل و نہار
المدد اے جستجوے صادق راہ نجات
کون سی خلوت میں ہے اے شمع راز کائنات

(تلوک چند محروم، گنج معانی، (بار دوم) دہلی، 1957، ص: 54)

چاند نارائن رینا چاند نے گوتم بدھ پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ سب مذہبی روایتوں کو بیان کرتی ہیں۔ جیسے ریاضت میں مار (شیطان) کا خلل ڈالنا وغیرہ۔

سنسکرت شعریات کے تنقیدی تناظرات و معیارات کی بازیافت کرنے والے اردو کے ادیب اور شاعر عنبر بہرائچی نے گوتم بدھ کے حالات زندگی نظم کیے ہیں اور اس کتاب کا نام انھوں نے بالکل نئے انداز کا رکھا ہے 'مہا بھنشکرمن'۔ یعنی ہجرت عظیمہ۔ اس کتاب میں 14 عنوانات کے تحت بدھ کے حالات زندگی بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔ اردو شاعری میں بدھیات کے تحت یہ کتاب بہترین اضافہ ہے۔ لیکن اس میں بھی روایتی باتوں کو خوبصورت شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔

واضح رہے کہ کچھ محققین اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے کہ سدھارتھ نے ان ڈرامائی حالات میں چوری سے گھر بار چھوڑا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر اپنی کتاب The Budh And his Dhamma میں لکھتے ہیں کہ گوتم بدھ کے چپکے سے آدھی رات کو محل چھوڑنے کا قصہ بے بنیاد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کپل وستو میں روہنی ندی سے پانی آتا تھا۔ اس کا پانی پڑوسی کولیہ ریاست بھی لینا چاہتی تھی۔ یہ بات کپل وستو کی شاکیہ گن سنگا کو گوارا نہ تھی۔ اس ہمیشہ کے مسئلے کو ختم کرنے کے لیے کولیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا گیا۔ شہزادے سدھارتھ نے اس بات کو ناپسند کیا اور بھرے دربار میں احتجاج کیا کہ پانی قدرت کی دین ہے اور اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔ چونکہ کپل وستو میں مجلس شوریٰ ہوتی تھی لہٰذا اس نے انھیں بغاوت کے جرم پر، بہ الفاظ دیگر مظلوم کے حق میں آواز اٹھانے کی وجہ سے ملک بدر کیا۔

Dr. B. R. Ambedkar, The Budh And His Dhamma, Pub. Govt. of M.S., Edi. I, 1956, pp. 24-27

اس کے بعد انھیں سچائی کا عرفان ہوا اور وہ بدھ یعنی عارف اور تتھاگت کہلائے۔

اردو شعرا نے گوتم بدھ سے عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے منقبتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثال کے طور پر سیماب اکبرآبادی ہیں۔ انھوں نے گوتم بدھ پر جو نظم لکھی ہے اس میں عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے جہاں جہاں ان کا نام آیا ہے اس کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کا نشان بھی لگایا ہے۔ وہ گوتم بدھ کو عرفانِ اول پکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یاد تیری آج بھی ہندوستاں میں تازہ ہے
چین جاپان اور تبت تک ترا آوازہ ہے
روشنی جس کی نہ ہوگی ماند وہ مشعل ہے تو
سرزمین ہند کا عرفانِ اول ہے تو

(سیماب اکبرآبادی، کار امروز، آگرہ، 1947، ص: 21)

ساغر نظامی نے بھی گوتم بدھ کے اوصاف نظم کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اے مرے پیارے وطن کے راہب عالی مقام
آج بھی کلمہ ترا پڑھتی ہے دنیا صبح و شام
تیرا اک اک لفظ ہے اک کلیات اخلاق کا
کردیا تو نے منور فلسفہ اخلاق کا
امن سرنامہ ترے قانون اخلاقی کا ہے
رحم اک عنواں تری تعلیم روحانی کا ہے
تیری تعلیمات پر ہندوستاں کو ناز ہے
ہند کو کیا ناز ہے سارے جہاں کو ناز ہے

(ساغر نظامی، بادۂ مشرق، میرٹھ، 1935، ص: 18-117)

نظموں کے بعد جب ہم غزل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پاتے ہیں کہ نئی غزل کو علامت نگاری نے نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ اس سے غزل کی ایمائیت اور تہہ داری میں اضافہ ہوا ہے۔

نئی شاعری میں اساطیر نے تلمیحات کی شکل اختیار کر کے اردو شاعری کو نئے زاویے عطا کیے ہیں۔ بدھ اساطیر اک رجحان کی صورت میں نہ سہی کچھ حد تک علامت اور استعارے کی شکل میں استعمال ہوئے ہیں۔ جن شعرا نے بدھی اصطلاحوں اور روایتوں پر زیادہ توجہ کی ان میں پاکستان کے شاعر اختر احسن کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام کا نام ہے، 'گیانگر میں لنکا'۔

لیکن بغیر سوچے سمجھے بھی بدھ علامتوں کو استعمال کیا گیا۔ ممتاز الحق اینٹی غزل کے تحت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جب میر کی سنجیدگی اور اداسی کا چلن بڑھا تو بدھ کا نام اسی کے تحت استعمال ہوا۔

(ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ، دہلی، 1998، ص: 93)

بہر کیف اگر شعر و ادب میں بدھی تلمیحات کے ساتھ بدھی افکار کو بھی جگہ دی جائے یہ الفاظ دیگر اردو ادب میں بھی بدھ کی یافت کے لیے سنجیدہ کوشش ہو تو یہ کار خوب ہمارے فن شعر کو نئے افق سے روشناس کرا سکتا ہے۔

■

Mohd Yahya Jameel, Baitul Jalil, Plot No.9
Aseer Colony, post VMV
Amravati - 444604 (Maharashtra)

یوسف صابر

سنت نامدیو بحیثیت اردو شاعر

اردو زبان کو ادبی مقام عطا کرنے میں جن شعرا و ادبا کے نام اردو ادب کی تاریخ میں درج ہیں، ان میں سنت نامدیو بھی شامل ہیں۔ سنت نامدیو کا شمار مراٹھی کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے مگر انھوں نے اردو شاعری بھی کی۔ اردو ادب کی تاریخی کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سنت نامدیو کا اردو کلام بھی مقصدی، بلند پایہ، صاف ستھرا اور سبق آموز ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اردو کا جنم عربی اور فارسی کے بعد ہوا مگر جس رفتار کے ساتھ اردو نے اپنی ترقی کے منازل طے کیے اور ادب میں اپنے آپ کو منوایا اس کی مثال کہیں اور بہت مشکل سے ملتی ہے۔

آج اردو کی ادبی حیثیت ایک تناور درخت جیسی ہے، سنت نامدیو کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ موصوف اس تناور درخت کے بیج بونے والوں اور نازک پودے کی دیکھ بھال کرنے والوں میں شامل ہیں جس دور میں سنت نامدیو نے اردو شاعری کے لیے قلم تھاما وہ اردو قلم کاروں کے لیے انتہائی مشکل دور تھا، مگر دیگر صوفیوں اور سنتوں کی طرح سنت نامدیو نے بھی اردو زبان کے حال کو سمجھا، پرکھا اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اسے چنا۔

اردو زبان کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی اس میں ضرور اختلافات ہیں لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اردو زبان کی نشو و نما اور ترقی میں صوفیوں اور سنتوں کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

ایک دور وہ بھی تھا جب اردو زبان بولی جاتی تھی، سنی جاتی تھی، سمجھی جاتی تھی، مگر ادب میں اس کا کوئی مقام نہیں تھا۔ ادب میں اس زبان کو استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ فارسی، عربی، سنسکرت اور دوسری کئی زبانیں ادبی ذخیرے سے مالا مال تھیں، اردو کا دامن خالی تھا۔ وہ صوفی اور سنت ہی تھے جنھوں نے اردو زبان کو فرش سے اٹھا کر ادب کے عرش پر بٹھا دیا۔ ان ہی میں سے ایک کا نام سنت نامدیو ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کا اہم مقصد انسانیت، بھائی چارہ، اتحاد، قومی یکجہتی اور محبت کی تبلیغ کرنا تھا، اس کام کے لیے انھیں ایک ایسی زبان چاہیے تھی جو آسانی سے عوام کی سمجھ میں آئے، یہ خوبی اردو میں انھیں بدرجہ اتم نظر آئی، اس لیے ان لوگوں نے اپنی تعلیمات اسی زبان میں عام کرنی شروع کی اور توقع کے مطابق انھیں کامیابی ملی۔ اس طرح اردو زبان کو ادب میں جگہ مل گئی، رفتہ رفتہ لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اردو زبان ترقی کرتی گئی۔

اکثر سنتوں کا تعلق سماج کے نچلے طبقوں سے تھا۔ سنت نامدیو نے بھی بھید بھاؤ کے خلاف اردو شاعری کے ذریعے اپنی آواز بلند کی۔ سنت نامدیو کے مختلف اردو اشعار جمیل جالبی کی تصنیف 'تاریخ ادب اردو- جلد اوّل، قدیم دور' اور مسعود حسین خان کی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' میں بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں جن کی مدد سے ان کے اشعار میں پائی جانے والی خوبیوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے مگر اس سے پہلے سنت نامدیو کے حالاتِ زندگی مختصراً ہیمنت وشنو انعامدار کی مراٹھی تصنیف 'سنت نامدیو' سے اخذ کرکے بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سنت نامدیو مہاراشٹر کے نامور سنت تھے۔ سنت نامدیو کا جنم 26 اکتوبر 1270 میں پنڈھر پور میں ہوا۔ سنت نامدیو کے والد داماشیٹی زری برہمنی کے رہنے والے تھے۔ سنت نامدیو کی والدہ کا نام

گونائی تھا۔ بیوی کا نام راجائی۔ وہ چار لڑکے اور ایک لڑکی کے والد تھے۔ سنت نامدیو کے ایک بہن بھی تھی جس کا نام آؤبائی تھا۔ سنت نامدیو نے دو سال کی عمر سے ہی بولنا شروع کردیا تھا۔ کم عمر میں ہی ان کی شادی کردی گئی۔ سنت نامدیو نے پنجاب میں اٹھارہ سال گزارے۔ سنت نامدیو کے خاندان کے جملہ پندرہ افراد ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کا ذکر ملتا ہے۔ سنت نامدیو نے 3 جولائی 1350 میں اکیلے سمادھی لی تھی۔ سنت نامدیو محنتی، خوددار، ایماندار، ہمدرد، سچے اور محبت کرنے والے انسان تھے اور یہی خوبیاں ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ سنت نامدیو کی فکر نے زبان و بیان کے رنگ و روپ کو تبدیل کردیا تھا اور اسے اتنا نکھار دیا تھا کہ اس کا شمار بلند درجہ ادب میں ہونے لگا۔

جس طرح جدید شاعری میں مقصدیت کو اولیت دی گئی، شاعری کو زندگی کے ساتھ جوڑا گیا، اسی کام کو صدیوں پہلے سنت نامدیو نے شروع کیا تھا۔ جس کا ثبوت ہمیں ان کے اشعار میں ملتا ہے۔ سنت نامدیو نے شاعری کے ذریعے اپنے بھکتوں کو نہ صرف نصیحتیں کیں بلکہ کئی سچائیاں عوام کے سامنے لائیں۔ خدا کی ذات پر یقین کرنے کے لیے سنت نامدیو نے اپنے شعروں میں جو دلیلیں پیش کیں انھیں پڑھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ وہی اشعار ہیں جنھیں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی اپنی تصانیف میں حوالوں کے ساتھ پیش کیے:

''مائے نہ ہوتی باپ نہ ہوتا کرم نہ ہوتی کائیا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آئیا
چند نہ ہوتا سور نہ ہوتا پانی پون ملائیاں
شاست نہ ہوتا بید نہ ہوتا کرم کہاں تے آئیا''

(بحوالہ گروگرنتھ صاحب، راگ رام کلی، نامدیو)

مسعود حسین خان صاحب نے ان ہی اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''مہاراشٹر کے دور دراز گوشے میں بیٹھ کر مراٹھی کے بھگت شاعر نامدیو نے اس سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے پیغام کو عمومیت دینے کے لیے مراٹھی کو ترک کرکے کبھی کبھی اسے بھی اپنے لیے ذریعہ ابلاغ بناتے ہیں۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص 83)

ان اشعار کے ذریعے سنت نامدیو نے واضح کیا کہ ماں باپ، ہم تم، چاند، سورج، پانی، ہوا، علم، کتاب، غرض تمام جاندار و بے جان چیزیں خدا کے ہونے کا ثبوت ہیں۔ ہر چیز اپنے وجود سے ظاہر کرتی ہے کہ کوئی ان کا بنانے والا موجود ہے اور وہ خالق صرف خدا ہی ہوسکتا ہے، کیوں کہ یہ کام انسانوں کے بس کا نہیں ہے۔

ایک اور مثال ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس طرح پیش کی ہے:

''میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھوند کارہ
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے آدھارا
کریما رحیما اللہ تو گنی
حادرا حددر دوریس تو منی
دریاؤ تو دھند تو بسیار تو دھنی
تو دانا تو بینا میں بیار کیا کری
نامے چہ سوامی بکھسند تو ہری

(گروگرنتھ صاحب، راگ تلنگ، نامدیو)

سنت نامدیو کے کلام میں انسانیت، اخلاق اور قربانی کے جذبے کو فروغ دینے کا درس ملتا ہے۔ سنت نامدیو کا اردو کلام اکٹھا کرکے شعری مجموعے کی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ساتھ ہی ان کی مراٹھی شاعری کا منتخب کلام کا ترجمہ کرکے اردو میں شائع کیا جائے تو نہ صرف اردو ادب میں اضافہ ہوگا بلکہ عام انسانوں کی کردار سازی کے لیے بھی یہ اقدام سود مند ثابت ہوگا۔

عاجزی کا یہ انداز بندے کو بندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ ان اشعار کے ذریعے سنت نامدیو نے انسانوں کو خدا کے سامنے حقیر بندوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور نہ صرف خدا کی ذات کو مانا ہے بلکہ خدا کی طاقت اور عظمت کا کھلے الفاظ میں اعلان کردیا ہے۔ یہ اشعار صدیوں پہلے تخلیق کے گئے ہیں مگر معنی خیزی کے اعتبار سے آج بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعروں میں انسانوں کو خاکساری کی تعلیم ملتی ہے۔ خدا سے اپنے لیے بخشش مانگی گئی ہے۔ خدا کو رحیم اور کریم کہا گیا ہے اور انسان کو درویش، فقیر ومحتاج مانا گیا ہے۔

سنت نامدیو کی شاعری میں انسانوں کے باطن کی اصلاح کی کوشش ملتی ہے۔ ان کے اشعار انسان کو ہوس، حسد، نفرت، ظلم وتشدد اور فریب سے دور رہنے کا درس دیتے ہیں۔ گناہوں سے بچنے اور نیک کام کرنے کی ترغیب سنت نامدیو کے اشعار میں جابجا نظر آتی ہے۔ غرض وہ تمام خوبیاں سنت نامدیو کی شاعری میں موجود ہیں جو اُس دور کے صوفیوں اور سنتوں کی شاعری کا خاصہ رہی ہیں۔ عمدہ خیال اور سلیقے سے استعمال کیے گئے لفظوں نے سنت نامدیو کے اشعار کو دلوں میں اتار دیا۔ وہ اپنے دور کے انتہائی مقبول شاعر تھے۔ صدیوں پہلے کہے گئے اشعار میں کئی الفاظ ایسے ہیں جو آج بھی صف اوّل کے شعرا اپنے شعروں میں استعمال کررہے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سنت نامدیو کے اشعار میں ایسے الفاظ بھی ہیں جو اب مروج نہیں رہے لیکن شعر کا مرکزی خیال، مقصد اور خصوصاً روانی یہ دکھا دیتے ہیں کہ سنت نامدیو کی شاعری کی عمارت ایک ایسی بنیاد پر کھڑی ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور مزید صدیوں تک قائم رہے گی۔ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مادہ پرستی نے عام انسانوں کی زندگیوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ جھوٹ، فریب اور حق تلفی کرکے کچھ لوگ اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ عیش وعشرت کے سامان سے گھروں کو بھرا جارہا ہے، ظاہری صورت اچھی کی جارہی ہے لیکن باطن سنوارنے کی فکر ختم ہوتی جارہی ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات کو عام کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے شاید اتنی ضرورت قدیم دور میں بھی نہیں تھی۔ سنت نامدیو کے کلام میں انسانیت، اخلاق اور قربانی کے جذبے کو فروغ دینے کا درس ملتا ہے۔ سنت نامدیو کا اردو کلام اکٹھا کرکے شعری مجموعے کی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ساتھ ہی ان کی مراٹھی شاعری کا منتخب کلام کا ترجمہ کرکے اردو میں شائع کیا جائے تو نہ صرف اردو ادب میں اضافہ ہوگا بلکہ عام انسانوں کی کردار سازی کے لیے بھی یہ اقدام سود مند ثابت ہوگا۔ مراٹھی وانگریزی زبان میں سنت نامدیو کے حیات فن اور شخصیت پر کتابیں موجود ہیں۔ میرے علم کے مطابق اردو زبان وادب میں سنت نامدیو پر مواد بہت کم دستیاب ہے، اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔ صوفیوں اور سنتوں نے قدیم دور میں قومی یکجہتی کے لیے جو انمول خدمات انجام دی ہیں وہ تمام عالم انسانیت کے لیے انتہائی قیمتی تحفہ ہے۔ یہ ہماری قوم کا اثاثہ ہے، ہمیں اس کو سنبھال کر رکھنا چاہیے اور مختلف زاویوں سے اُن کے حیالات کی تشہیر کرتے رہنا چاہیے۔ سنت نامدیو پر اردو زبان وادب میں بھی ریسرچ ورک ہونا چاہیے تاکہ وہ تمام حقائق عام وخاص انسانوں تک پہنچیں جو روحانی تسکین کا سامان اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا وسیلہ ہیں۔

■

Dr. Khan Yousuf Sabir N-12, Plot No 2616, CIDCO, Raoza Bagh Aurangabad -431001 (MS)
Mob.:9326772575

قارئین ابن صفی اور نقلی ’ہیروں کا فریب‘

ادریس شاہجہانپوری

’’بدو آفرینش ہی سے آدمی تن آسانی کا جویا رہا ہے۔‘‘

ابن صفی نے یہ جملہ اپنے یادگار خاص نمبر ’برف کے بھوت‘ میں ایک نفسیاتی کردار فرزانہ کی زبان سے کہلوایا تھا جس کو دوران گفتگو ثقیل الفاظ بولنے کا خبط تھا۔ ان کو کہاں معلوم تھا کہ ان کا یہ جملہ جملہ ثابت ہوگا بعد میں ان جعلی مصنفین اور پبلشروں پر جو محنت شاقہ کے بجائے، محنت دابا (ابن صفی کی محنت کو داب کر) اور ادب میں تن آسانی (نقالی) کے ذریعے جھوٹی شہرت حاصل کریں گے اور ان کے لازوال کرداروں کی مٹی پلید کریں گے۔ ابن صفی تاحیات ایسے نقالوں سے نالاں رہے اور نالہ وشیون کے نالے بہاتے رہے مگر افسوس صد افسوس اپنی آہوں اور فغاؤں کے ان نالوں میں ان نقالوں کو نہ بہا سکے۔ ان کو درحقیقت ان جعلیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جن کی ضد میں انھوں نے مزید تحاریر پیش بہا پیش کیں (نہ جعلیے پیدا ہوتے نہ وہ ضد کرتے) لیکن وہ ساری زندگی شکوہ و شکایت ہی کرتے رہے۔ کراچی سے شائع ناول ’گیارہ نومبر‘ کے پیش رس میں رقم طراز ہیں:

’’اب آیئے مصنف کی طرف کہ اسے بہت دنوں کے بعد پھر وہی پرانا مرض لاحق ہوگیا ہے لیکن اس بار بنگلہ بھاشا میں ہوا ہے یعنی مشرقی پاکستان کے دو پبلشروں نے میرے کچھ ناولوں کا بنگلہ ترجمہ چھاپا ہے اور اس پر میرے نام کے بجائے ’مراد پاشا‘ اور ’آلک باری‘ رسید کردیا ہے یعنی اردو میں تو صرف چوریاں ہی ہوتی تھی لیکن بنگلہ میں تو ڈاکہ پڑا ہے مجھ پر! آلک باری صاحب نے عمران سیریز کے ’بھیانک آدمی‘ کو ذبح کیا ہے اور مراد پاشا نے شعلوں کے پورے سیٹ پر دھاوا بول دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہی غریب کیوں ایسوں کے ہتھے چڑھتا ہے (اسے صنعت تجاہل عارف کہتے ہیں)......‘‘

آگے رقمطراز ہیں:

’’سنا ہے کہ کراچی میں کوئی گجراتی اخبار عمران سیریز کا کوئی ناول نہ صرف چھاپ رہا ہے بلکہ کرداروں کی ایسی قلمی تصاویر بھی وہ اخبار میں چھاپ رہا ہے جنھیں دیکھ کر بعض ’عمران پسند‘ آپے سے باہر ہوگئے ہیں! قلمی تصاویر وہ چھاپ رہا ہے اور سلواتیں مجھے سننی پڑ رہی ہیں— یہ دوسرا مرض ہے جو مجھے لاحق ہوا ہے.. ......‘‘

ایک اور ناول ’سبز لہو‘ کے پیش رس میں طناز ہیں:

’’ہر شعبہ زندگی میں ہماری قوم کا کردار یہی بن گیا ہے کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔‘‘

یہاں ہندوستان میں بھی ایک طرف جہاں این،

ابن اور نجمہ صفیوں کی بھرمار تھی تو دوسری طرف کانپور کے ہیرامن پوروہ کے پبلشر درویش اینڈ سنس نے غضب ہی ڈھادیا اور ان تمام 'صفیوں' سے حجت تمام کرتے ہوئے، ابن صفی کی علالت سے فائدہ اٹھا کرایک نقلی ناول 'ڈیڑھ متوالے' کے نام سے ہی شائع کر دیا۔ بعد میں وہ پبلشر علت میں پھنس گیا۔ابن صفی کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی علالت سے پہلے اس ناول کا اعلان کر دیا تھا۔ (کاش کہ وہ اپنی علالت کی علت سے قبل از وقت ہی واقف ہوجاتے!)

یہ ستم تو اغیار نے ابن صفی پر ڈھایا مگر اپنے بھی پیچھے نہیں رہے۔ان کے عزیز ترین رفیق عباس حسینی جن کی ایک مسکراہٹ پر ابن صفی ایک درجن کتابیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، ان صفیوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے اور کسی نقلی ابن صفی سے نقلی ہیرے 'روشنی کی آواز' اور 'سائے کا قتل' ترشواکر جاسوسی دنیا کے علم تلے فروخت کر دیے۔ کیا ان کا یہ جرم قابل معافی قرار دیا جاسکتا ہے۔؟ اس سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ دونوں ہی نقلی ناول ان کے اداریوں کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ناول 'سائے کا قتل' کے اداریے میں انھوں نے بقلم خود تحریر کیا ہے:

''اعلان کے مطابق اس شمارے کی کہانی 'پہاڑوں کے پیچھے' ہونا چاہیے تھی لیکن قارئین کا اصرار تھا کہ وہ آئندہ ناول میں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کو دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے 'سائے کا قتل' آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔''

عباس حسینی نے قارئین کے اس اصرار کو تو دھیان میں رکھا کہ آئندہ ناول میں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کو دکھایا جائے مگر وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ قارئین اصل ابن صفی کو ہی پڑھنا چاہتے ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس اعلان کی صداقت کا کیا ہوگا جو آئندہ شمارے کی شکل میں ناول 'پہاڑوں کے پیچھے' میں کیا گیا ہے۔ شاباش ہے ان قارئین پر کہ انھوں نے ابن صفی کے جوش محبت میں ہوش گنوا کر اس نقلی ناول کو بھی گلے لگا لیا۔

'جاسوسی دنیا' اور ماہنامہ 'نکہت' سے شائع ہر ناول میں آئندہ شمارے کی جھلک ضرور دی جاتی تھی۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ 'اجنبی کا فراز' (مارچ 1971) اور روشنی کی آواز (مئی 1971) دونوں ہی ناولوں میں آئندہ شمارے کی جھلک کے بطور 'پہاڑوں کے پیچھے' (اگست 1971) کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے بعد 'روشن ہیولی' (ستمبر 1971) شائع ہوا۔ جبکہ کسی بھی ناول میں آئندہ

شمارے کی جھلک کے طور پر 'سائے کا قتل' کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔صرف عباس حسینی ہی اس کی وجہ سے واقف ہو سکتے ہیں لیکن وجہ بتانے کے لیے مجبور نہیں ہیں کیونکہ اب وہ مرحوم ومغفور ہیں۔

ابن صفی پابندی سے اپنے ان ناولوں کا مسودہ الہ آباد روانہ کرتے تھے جو پہلے کراچی میں شائع ہوتے تھے اور بعد میں یہاں ہندوستان میں۔ اس کے لیے وہ حساب دوستاں دردل کے تحت کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کرتے تھے، جس کی وجہ سے عباس حسینی تا عمر 'نہال' ہی نہیں خوشحال بھی ہوتے رہے۔ مگر کراچی سے شائع ان کے ناولوں کی فہرست میں یہ دونوں ہی ناول شامل نہیں ہیں۔اب جوں جوں پیاز کی پرتیں کھلتی جارہی ہیں ان نقلی ہیروں کے فریب کا پردہ چاک ہوتا جارہا ہے۔

محمد عارف اقبال نے اپنے مضمون ''ابن صفی کے نام سے شائع دو جعلی ناول — سائے کا قتل اور روشنی کی آواز'' (اردو دنیا، مئی 2016) میں جبر و مقابلہ (جبر اپنی طبیعت پر اور مقابلہ نقالوں سے) اصولوں سے ان ناولوں کو نقلی ثابت کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں لفظ 'ایکدم' کا استعمال نہیں کیا ہے۔اس پر صاد کرتے ہوئے یہ اضافہ کافی ہوگا کہ کہیں کہیں انھوں نے دفعتاً کی جگہ یکدم تو تحریر کیا ہے، ایکدم نہیں۔ اس سلسلے میں 'آنکھ شعلہ بنی' سے یہ حوالہ ملاحظہ ہو:

''پھر وہ (لیڈی بہرام) یکدم اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔عمران نے دیکھا کہ بت کی وہ آنکھ جو لیڈی بہرام کے بلاؤز کے گریبان میں رہا کرتی تھی بالکل سرخ ہوگئی ہے، شعلے کی طرح دہک رہی ہے۔''

ان دونوں ناولوں میں قاسم کے کردار کو بڑے ہی لچر، بھونڈے اور پھوہڑ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قاسم کے مکالمے ابن صفی کے منفرد انداز سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ کچھ حوالے دیکھیے:

- ''اے حمید بھائی، غمید بھائی تم ہر جگہ اپنی ٹانگ مت اڑایا کرو ورنہ اچھا نہیں ہوگا... غر... غر... غر... ہچ۔'' قاسم غرایا۔
- ''نہیں... غاغمید... ہپ چچا جان۔ اب ہو ہی جانے دیجیے۔ میں قہتا ہوں... غاں... ہچ... چچا جان... غاؤں غاؤں... غر.. غر''
- ''اب میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو... غاں... غاں... غر۔''
- ''ہاں... ہاں... کچھ بھوخ بھی معلوم ہو رہی ہے... غر... غر... ہچ۔'' قاسم منھ چلاتا ہوا بولا۔
- ''ہاں ہاں اَحمق ہی تو کہہ رہا ہوں...... تم نے میری بھی اتنی خاطر کی تھی... غاں... غاں... غرغرغر۔''

ابن صفی نے کہیں بھی قاسم کی زبان سے غرغرہچ نہیں کہلوایا جب کہ 'سائے کے قتل' میں اس کی تکرار ملتی ہے۔ ایک اور جملہ ہے:

- جب ٹیکسی ناتھانی کے بنگلے کے قریب پہونچنے لگی تو فریدی نے اسے رکوادی۔

یہاں 'رکوادی' غور طلب ہے جو فاضل مصنف کا انداز تحریر نہیں ہے۔ مزید برآں دونوں ہی ناولوں میں ایک بوڑھی اینگلو انڈین عورت کا کردار پیش کیا گیا ہے جو انتہائی کمزور ہے اور ابن صفی کے فن کردار نگاری کی سراسر نفی کرتا نظر آتا ہے۔

عارف اقبال نے اسی مضمون میں تحریر کیا ہے کہ ابن صفی کو ان ناولوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔ ایسا کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان دونوں نقلی ہیروں (ناولوں) سے واقف نہ ہوں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ممالک میں ان کتابوں کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی وسیع القلبی اور رواداری نیز دوست کی دل آزاری سے گریز کی خاطر انھوں نے اس کی طرف سے اپنی آنکھیں موند لی ہوں اور عباس حسینی سے باز پرس نہ کی ہو۔ بہرحال ابن صفی نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا اور عباس حسینی نے دوستی کا۔ دونوں ہی صورتوں میں نقصان بے قصور قارئین کا ہوا۔

■

Idrees Shahjanpuri
Email.: iahmadk@gmail.com

انقلاب اٹھارہ سو ستاون

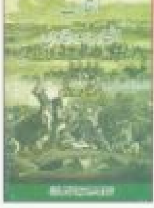

مرتب: پی سی جوشی
صفحات: 386، قیمت: 126،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد شرافت علی، ہندوستان ایکسپریس
جی 79، کالندی کنج، شاہین باغ، نئی دہلی

'انقلاب اٹھارہ سو ستاون' پی سی جوشی کی مرتب کردہ کتاب ہے، جسے اول اول 'انقلاب' کی صد سالہ تقریب کے موقع پر کتابی شکل میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا تھا۔ کتاب کی غیر معمولی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اِسے اردو کے قالب میں ڈھالنا اور اسے نذر قارئین کرنا ضروری سمجھا۔ پہلی بار بہ زبان اردو یہ کتاب 1972 میں شائع کی گئی تھی، جس کا پانچواں ایڈیشن پیش نظر ہے۔

تحریک آزادی، حب الوطنی، حریت پسندی اور تاریخ ہند کے مطالعے میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے 'انقلاب اٹھارہ سو ستاون' ایک دستاویزی کتاب کا درجہ رکھتی ہے جس میں 'انقلاب' سے متعلق مختلف الجہات و متضاد نظریات پر سیر حاصل بحث کے در بھی وا کیے گئے ہیں اور کسی حد تک اس گتھی کو بھی سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تحریک کیسے انگریزی سامراج کے خلاف 'اجتماعی جذبۂ حریت' کی ترجمان بنی اور پھر آگے چل کر ایک نئے عہد کے آغاز کا محرک کیسے قرار پائی۔

386 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو فاضل مرتب نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب ہذا میں ایسے 14 مقالہ نگاروں کی تحریریں شامل ہیں، جن کی بلند قامتی مسلم ہے۔ نہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانی فضلا کے مقالے ہی سپردِ قرطاس کیے گئے ہیں بلکہ اُن غیر ملکی صاحبان علم و فضل کی نگارشات کو بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے جنھوں نے 'انقلاب اٹھارہ سو ستاون' کے عنوان پر اپنے اپنے نظریے سے قلم اُٹھانے اور اس انقلاب کے عالمگیر اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مقالہ نگاروں کی تحقیقی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے مرتب کتاب پی سی جوشی رقمطراز ہیں:

"یہ مقالات بڑی محنت تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ ان تمام غیر ممالک میں 1857 کے انقلاب کا خیر مقدم کیا گیا کیونکہ یہ غلامی کے برطانوی جوئے سے نجات پانے کے لیے ہندوستانیوں کی قومی بغاوت تھی جس نے عالمی جمہوری حلقوں میں یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔"

1857 کی تحریک آزادی کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے واقعی یہ کتاب رہنمائی کا فرض ہی نہیں نبھاتی، بلکہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جانب صائب الرائے افراد کو مائل بھی کرتی ہے، کتاب میں شامل مقالہ نگاروں کے بعض خیالات کو پڑھنے کے بعد اس موضوع کی بابت مزید تلاش و جستجو کا احساس ہونا بھی فطری ہے۔

زیرِ نگاہ کتاب کے پہلے حصے میں مجموعی طور پر چار مقالے شامل ہیں۔ یہ چاروں مقالات موضوع کے ساتھ انصاف کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ یعنی فاضل مقالہ نگاروں نے مورخین، محققین اور مصنفین کے خیالات سے بھرپور انداز میں روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقالے کی تیاری میں اسکالروں نے کس قدر دماغ سوزی کی ہے، اسے بتانے کے لیے یہ بھی بتانا ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے پہلے مقالے میں جس کا عنوان 'بغاوت عظیم' ہے، تمیز خلدون نے 1857 کے انقلاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے 374 ماخذ کے حوالے دیے ہیں۔ تمیز خلدون کا مقالہ اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ صرف اس ایک مقالے کو پڑھ کر بھی انقلاب 1857 کو عام قارئین کے لیے بآسانی سمجھ پانا ممکن ہے۔ خلدون نے 54 صفحات میں جس طرح اس انقلاب کی تفصیل از شروع تا آخر بیان کی ہے، وہ یقیناً لائق توجہ ہے۔ 1857 کی تفہیم کے لیے انھوں نے 8 ذیلی عناوین قائم کیے ہیں، جس کی وجہ سے تاریخی تسلسل کے ساتھ 1857 کی بازیافت کی راہ آسان ہوگئی ہے۔ مقالہ نگار نے 'تمہید'، 'اسباب'، 'تنظیم'، 'سیاسی تنظیم'، 'طبقات کا رول'، 'ناکامی کے اسباب' اور 'بعض اثرات' کی سرخیاں قائم کرتے ہوئے اس جنگ آزادی کی نقشہ گری نہایت عمدہ طریقے سے کی ہے۔ کے ایم اشرف کا مقالہ 'احیائے اسلام کے حامی اور 1857 کا انقلاب' جنگ آزادی میں مسلم علماء کے قابل فخر کردار کو ہی منعکس نہیں کرتا بلکہ برطانوی حکومت کے خلاف پے در پے شورشوں میں علمائے کرام کی تنظیمی صلاحیتوں اور قائدانہ حکمت عملیوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اشرف نے اِس ضمن میں بطور خاص حضرت شاہ ولی اللہ کے جدت پسندانہ نظریات اور تعمیر پسندانہ خیالات کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے اور یہ بھی بتانے کی سعی کی ہے کہ 'شہری سماج کی تباہی' اور مغلیہ سلطنت کا زوال کیسے آیا اور اس عہد میں احیائے اسلام کی کوششیں کس انداز میں آگے بڑھیں۔ اس کے ساتھ ہی زیر نظر مقالے میں سلطان ٹیپو کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا بھی مجملاً احاطہ کیا گیا ہے اور 'وہابیوں کے نعرۂ جہاد' کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، جن کے اشتراک و عمل کی وجہ سے ماحول سازی کا عمل آگے بڑھا اور یوں نوبت 1857 کے انقلاب تک پہنچ گئی۔ پہلے باب کا تیسرا مقالہ بعنوان 'بنگال کا روشن خیال طبقہ اور انقلاب' بھی دلچسپ ہے جس میں بنے گھوش نے انقلاب کے حوالے سے بنگال کے روشن خیال طبقے کے نظریات کا جائزہ لیا ہے اور یہ جاننے کی بھی کوشش کی ہے کہ آخر اہل بنگال نے بغاوت میں شامل ہونا کیوں گوارا نہیں کیا؟ پہلے باب کا چوتھا اور آخری مقالہ 'ہماری تاریخ میں 1857' مرتب کتاب پی سی جوشی کا تحریر کردہ ہے، جس میں انھوں نے بعض مؤرخین کے خیالات کی مدلل انداز میں نفی بھی کی ہے اور بعض پوشیدہ حقائق کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ جوشی نے حب الوطنی کے جوش میں ہوش نہیں کھویا ہے بلکہ نہایت احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ تاریخ کے اوراق کو اُلٹنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے اس ضمن میں ہندوستانی مؤرخین کے موقف کو تو

پیش کیا ہی ہے، فرنگیوں کے خیالات اور نظریات کو بھی خوبصورتی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر جگہ دی ہے، جس سے 1857 کے انقلاب کی آزادی کے حوالے سے انگریزوں کی بدحواسیاں اور بداعمالیاں اچھی طرح اُجاگر ہو جاتی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں انقلاب اور ادب کے رشتے کی بازیافت کی سعی کی گئی ہے۔ اس باب میں 5 مقالے شامل اشاعت ہیں، جن میں اردو، ہندی اور بنگالی ادب کے علاوہ لوک گیت پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پی سی گپتا نے '1857 اور ہندی ادب' کے عنوان سے ہندی ادب پر انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، جبکہ احتشام حسین نے 'اردو ادب اور انقلاب 1857' کو عنوان بناتے ہوئے 'اردو اور انقلاب' کے باہمی رشتوں کا اجمالیہ بیان کیا ہے۔ کے ایم اشرف نے 'غالب اور بغاوت 1857' کے تحت مرزا اسداللہ خاں غالب کے روزنامچہ 'دستنبو' کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ غالب شناسی کے حوالے سے یہ کوشش مہتم بالشان ہے کہ اُردو کے جلیل القدر شاعر یہاں ایک بہترین مؤرخ کے طور پر جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ گوپال ہلدر نے '1857 سے پہلے اور بعد کا بنگالی ادب' کس طرح کی تبدیلیوں کا گواہ بنا، اسے اجاگر کیا ہے۔ مرتب کتب پی سی جوشی حصہ دوم میں بھی پہلو بدل کر ایک بار پھر وارد صفحہ ہیں۔ انھوں نے '1857 سے متعلق لوک گیت' کی بزم یہاں سجائی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے حصہ سوم میں ہندوستانی بغاوت کو دنیا کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں 'بغاوت ہند اور برطانوی رائے'، 'ہم عصر فرانسیسی پریس'، 'اٹلی میں 1857 کی صدائے بازگشت'، '1857 اور روسی پریس' اور 'چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں' کے عناوین قائم کرتے ہوئے جیمز برائن، چارلس فورنین، للیانا ڈل نوگارے، پی شاستی کو اور یوشینگ دو۔ چین کن نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اُس عہد میں ہندوستانی بغاوت کو متذکرہ ممالک میں کس طرح دیکھا گیا۔ کتاب کے آخر میں 'جدول تواریخ' کے ذریعے بغاوت کے آغاز سے انجام تک کی منظر کشی کی گئی ہے۔ مجموعی لحاظ سے یہ کتاب موضوع کے ساتھ بڑی حد تک انصاف کر پانے میں کامیاب ہے۔ 386 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت محض 126 روپے ہے۔

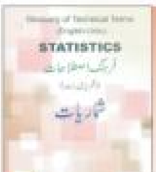

فرہنگ اصطلاحات: شماریات

ادارہ

صفحات: 95، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: معین الدین خان، D-66، جنتا فلیٹس، جسولہ، پاکٹ II، نئی دہلی 25

عصری زندگی میں اعداد و شمار کو کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ قاری یہ دیکھتا ہے کہ رسالے کی تعداد اشاعت کتنی ہے اور تاجر یہ دیکھتا ہے کہ اس کے اشتہار کی رسائی کتنے لوگوں تک ہوگی۔ اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ کسی مضمون کو پسند یا ناپسند کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے، اس سے یہ طے ہوتا ہے کہ مضمون نگار کو آئندہ شماروں میں جگہ دی جائے گی یا نہیں۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں قلانچیں بھرنے والے لوگ بخوبی واقف ہیں کہ کسی تحریر یا اشیا کو کتنے افراد شرف قبولیت بخشتے ہیں، اس سے اس کے معیاری اور عمدہ ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے تقریباً 1800 اصطلاحات پر مبنی شماریات (Statistics) کی فرہنگ کی اشاعت نہ صرف بروقت ہے بلکہ خوش آئند بھی کیونکہ کسی زبان کو استحکام بخشنے میں جہاں ادبی کتابوں کی اہمیت ہے وہیں سماجی علوم کی کتابیں بھی علمی شعبوں کے گوناگوں پہلوؤں سے روشناس کراتی ہیں۔ اس فرہنگ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں شماریات کی بنیادی اصطلاحات یکجا کر دی گئی ہیں۔ آئندہ اس موضوع پر فرہنگ تیار کرنے والوں کے لیے اس کتاب کی حیثیت اساسی ہوگی۔

زیر تبصرہ فرہنگ کے پیش لفظ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصطلاح اور عام لفظ میں فرق کیا جائے اور عام لفظ کو فرہنگ کا حصہ نہ بنایا جائے۔ فرہنگ کو تیار کرتے وقت بہت حد تک اس اصول کی پاسداری کی گئی ہے لیکن بعض جگہوں پر اس اصول سے صرف نظر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً Area, Angle, Defination وغیرہ جیسے الفاظ بھی فرہنگ میں شامل کیے گئے ہیں۔ ہر جگہ Process کے لیے 'پروسس' لکھا گیا ہے، جب کہ اس کے لیے ہمارے یہاں 'عمل' کی اصطلاح زمانے سے رائج ہے۔

پیش لفظ میں ایک اہم اصول یہ درج کیا گیا ہے کہ اگر کوئی انگریزی اصطلاح اردو میں مروج اور عام فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے اور اس کے اردو متبادل نہ اختراع کیے جائیں۔ غالباً اسی کے پیش نظر کئی اصطلاحوں مثلاً QualityControl کا متبادل 'کوالٹی کنٹرول' ہی کر دیا گیا ہے لیکن بعض جگہ ایسا لگتا ہے کہ انگریزی کی عام فہم اصطلاح کو اردو کے مزاج میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش نہیں کی گئی ہے اس فرہنگ میں متعدد انگریزی اصطلاحوں کو اردو میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کو پڑھنے میں ذہن پر شاق گزرتا ہے مثلاً Method of Scoring کا متبادل 'طریقہ اسکورنگ' اور Moment Generating Function کا متبادل 'مومینٹ تخلیقی تفاعل' دیا گیا ہے۔ اس طرح کے الفاظ سہل نہیں کہے جاسکتے اور ان سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ Normal Distribution کے لیے 'نارمل بٹاؤ' اور Matrix کا اردو متبادل 'مترس' معنی کا حق ادا نہیں کرتے۔ امید ہے کہ آئندہ خوب سے خوب تر کی کوشش ہوگی۔

توقع ہے کہ اس کتاب سے اساتذہ اور طلبا کو اردو میں شماریات پڑھنے پڑھانے میں آسانی ہوگی۔ حسب سابق قومی کونسل نے اس فرہنگ کو معیاری انداز میں شائع کیا ہے۔

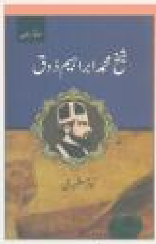

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 109، قیمت: 72 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: صبیحہ ناہید 20A/103، ٹیولپ اپارٹمنٹ، اوکھلا ہیڈ، نئی دہلی

شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شمار اردو کی کلاسیکی شاعری کے علم برداروں میں ہوتا ہے۔ ذوق، غالب اور مومن و سودا کے معاصرین میں سے ہیں۔ ذوق کو مغلیہ دور حکومت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو بحیثیت شاعر دنیائے شعر و ادب میں روشناس کرانے کا سہرا بھی ذوق کے سر ہی جاتا ہے۔

ذوق کی شاعرانہ عظمت اور فکری بلندی کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے ان فراموش کردہ ہیرو کی حیات و خدمات پر جمع ہونے والی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کوشش کے نتیجے میں زیر تبصرہ کتاب بعنوان 'شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر کوثر مظہری ہیں۔

موصوف شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہیں۔ ایک سنجیدہ اور مشفق استاد کے علاوہ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ شاعری اور تنقید ان کا خاص میدان رہا ہے۔ ان کی کئی کتابیں شاعری اور تنقید کے حوالے سے منظر عام پر آچکی ہیں جن میں چند جواز و انتخاب، جرات وافکار اور جدید نظم: حالی سے میراجی تک قابل ذکر ہیں۔

اس مونوگراف کو بنیادی طور پر چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ شخصی و سوانحی پس منظر، تنقیدی محاکمہ، دیگر اصناف سخن: رباعیات وقطعات اور انتخاب کلام کے حوالے سے ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ ذاتی کوائف میں بنیادی وثانوی دونوں حوالے سے ان کی ذاتی زندگی، ان کے شاگرد، ان کے معاصرین، ان کی تعلیم وتربیت، مشق سخن، دربار شاہی سے ربط کا تذکرہ بہت ہی مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اس مشہور قصیدے کا بھی تذکرہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ذوق نے بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی کے موقعے پر لکھا تھا اور اس کی بنا پر انھیں 'ملک الشعرا' کے خطاب سے نوزا گیا تھا۔

اس مونوگراف میں 'آب حیات' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ذوق بہت ہی نرم دل اور خداترس انسان تھے۔ نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے کبھی کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔ اس میں ذوق کی عبادت وریاضت، خداترسی اور توکل کا ذکر بھی صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں ان کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ان کی غزل گوئی اور قصیدہ گوئی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تنقیدی محاکے کے عنوان سے ذوق کی غزلوں کا تذکرہ بھی ہے، لیکن ان کے اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو انھیں آسمان ادب پر قصیدہ گوئی کا ایک درخشندہ ستارہ کہا جاسکتا ہے۔ ذوق کی غزلوں میں اس دور کے مروجہ موضوعات دکھائی دیتے ہیں نیز کوئی اجتہادی رویہ نظر نہیں آتا۔ عشق محبت، جنون، موسم گل، موسم خزاں، گل وبلبل، غنچہ وگل، ساقی ورند، جام وسبو، شب فراق، آہ وفغاں، ہجر و وصال، بے ثباتی عالم اور دنیا سے بے رغبتی کا ذکر جابہ جاملتا ہے۔

'چشم' ان کا خاص موضوع ہے کیونکہ یہ انسانی جذبات وتاثرات کو پیش کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ چشم کو انھوں نے بے شمار زاویوں سے پیش کیا ہے۔ اس کا ذکر اس مونوگراف میں خاص طور سے کیا گیا ہے۔ چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

تصور کس طرح بھولے ترے اس چشم گریاں کو — نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر کے مہماں کو

دیکھ جھوٹوں کو ہے اللہ برائی دیتا — آسماں آنکھ کے تل میں ہے دیکھائی دیتا

اس میں ذوق کی قادرالکلامی وپختگی اور روزمرہ کے محاوروں کا استعمال اور ان کو برتنے کی فنکارانہ چابکدستی کا ذکر بھی جابہ جا کیا گیا ہے۔

اس مونوگراف کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں محققانہ رویہ اپنایا گیا ہے اور بہت ہی مدلل انداز میں ذوق کی شخصیت اور فن کا محاکمہ کیا گیا ہے جو مصنف کی فنی و فکری پختگی اور بصیرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ارتضی کریم (ڈائرکٹر این سی پی یو ایل) نے اس کے پیش لفظ میں لکھا بھی ہے کہ ''اسے معلومات کا ذخیرہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوثر مظہری اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ ایک قابل داد کاوش ہے۔ اس کے ذریعہ اپنے اسلاف کی حیات وخدمات کو نئی نسل اور آنے والی نئی نسلوں کو روشناس کرانے کا اہم کام انجام دینے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ اردو کی کلاسیکی شاعری کی روایات کو زندہ رکھنے کی طرف ایک اٹھایا گیا ایک قابل تقلید قدم ہے۔ امید قوی ہے کہ قارئین اس کی طرف توجہ فرمائیں گے اور استفادہ بھی کریں گے۔

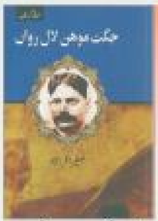

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)

مصنف: صغیر افراہیم

صفحات: 146، قیمت: 86 روپے

ناشر: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: ثاقب عمران، I-4، توحید منزل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

اردو ادب میں جگت موہن لال رواں کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور ڈراما نگاری کے میدان میں طبع آزمائی بھی کی لیکن ان کا اصل میدان شاعری ہی ٹھہرا۔ رواں نے اردو شاعری میں صرف غزلیں کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ نظمیں، رباعی، قطعات اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ صغیر افراہیم صاحب نے رواں کی شخصیت اور ان کے فن پر نظر التفات نہ ہونے کی وجہ ادب میں گروہ بندی کا پایا جانا بتایا ہے۔

کتاب کا پہلا باب شخصیت اور سوانح سے متعلق ہے۔ مصنفِ کتاب نے رواں پر قلم اُٹھاتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی زندگی اور فن کے تمام پہلو قارئین کی نظروں کے سامنے آجائیں۔ انھوں نے سوانحی حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ سوانحی حالات لکھتے وقت مصنف نے شکار سے ان کی رغبت کا بھی خوب ذکر کیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ شکار سے ان کی دلچسپی ہی ان کی زندگی کے اختتام کا بہانہ بن گئی۔ انھیں ہلکا بخار تھا، ایسی حالت میں بھی وہ دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے چلے گئے۔ واپسی پر بخار نے شدت اختیار کرلی۔ ظفر عمر قدوائی نے ان کی علالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' بہرحال یہی بیماری آخر کار ان کے انتقال کی وجہ بن گئی۔

مصنف کتاب نے سوانحی حالات لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن پر بھی مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب 'رواں بحیثیت شاعر' کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے تحت نظم نگار، غزل گو، رباعی گو، قطعہ نگار اور مثنوی نگار کی حیثیت سے رواں کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف کتاب نے 'نظم نگار' کا ذیلی عنوان قائم کرکے رواں کی چند اہم نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جن میں 'الوداع'، 'سرود عشق'، 'معمائے فطرت'، 'تتلی'، 'شاعری'، 'لاوارث بچہ'، 'شوہر کش حسینہ'، 'ویراں قصر شاہی اور ہم'، 'معجزۂ انتظار' اور 'خدا خیر کرے' اہم ہیں۔

نظم 'تتلی' کے تعلق سے مصنف نے ایک خاص بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ شاعر نے پھولوں کے معشوق کے طور پر سیاہ رنگ کے بجائے رنگ برنگے پردار کیڑے کو لیا ہے۔ آخر اس ننھے سے کیڑے کو بنانے کا مقصد کیا تھا؟ شاید اسی لیے مصنف نے اس کی ہستی کے راز کے جان لینے کو رشتۂ خلق اور خدا کے ظاہر ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ تتلی کو دیکھنا چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی لاتا ہے ساتھ ہی بچپن کی یاد بھی تازہ ہوتی ہے:

ننھی تتلی تیری ہستی کا اگر ظاہر ہو راز
منکشف ہو رشتۂ خلق و خدائے بے نیاز
کوششوں پر بھی ہمارے ہاتھ کب آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اُڑ جاتی تھی تو

اسی طرح مصنف نے بحیثیت افسانہ نگار اور ڈراما نگار بھی ان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف نے رواں کا شجرۂ نسب بھی شامل کتاب کیا ہے۔ اخیر میں ان کا منتخب کلام، ان کی نظمیں، رباعیات، قطعات اور غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نثری تحریروں کے چند نمونے بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔

مختصر لفظوں میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ صغیر افراہیم نے جگت موہن لال رواں کی

شخصیت اور ان کے فن پر یہ مونوگراف تحریر کر کے قارئین کو ایک اچھی کتاب کا تحفہ دیا ہے۔ کتاب میں موجود مواد مصنف کی محنت اور ان کے وسعت مطالعہ پر دال ہے۔

قومی اردو کونسل کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے مونوگراف کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے لیے ایسی شخصیتوں کو منتخب کیا جن پر تحقیقی کام کم کیے گئے ہیں۔ کتاب جاذب نظر ہے اور اس کا گیٹ اَپ اچھا ہے۔ پروف کی غلطیوں سے تقریباً پاک ہے جو مصنف کی محنت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ کتاب کی قیمت 86 روپیہ ہے جو مناسب معلوم ہوتی ہے۔

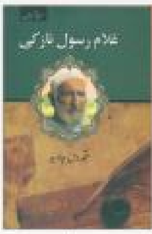

غلام رسول نازکی (مونوگراف)

مصنف: قدوس جاوید

صفحات: 87، قیمت: 65 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: طاہر محمود ڈار، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کے بنیاد گذاروں میں جو چند نام لیے جاتے ہیں ان میں میر غلام رسول نازکی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ نازکی صاحب بیک وقت شاعر، نثر نگار، صحافی، براڈ کاسٹر اور ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔ خوش آئند بات ہے کہ قدوس جاوید نے ایجاز و اختصار سے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور انھیں اپنی تحقیق کے دائرے میں لانے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر مونوگراف پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر غلام رسول نازکی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں نازکی صاحب کے خاندان، آباو اجداد، پیدائش، پرورش، تعلیم اور ملازمت، سفر محمود، ان کی ازدواجی زندگی، دین و مذہب اور سفر آخرت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قدوس جاوید نے اس باب کے ساتھ حتی الواسع انصاف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض جگہوں پر ان سے سہو ہوا ہے۔

دوسرا باب میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر محیط ہے جس میں مصنف نے نازکی صاحب کے فکر وفن کو تنقیدی وتجزیاتی نقطۂ نظر سے اشعار کا حوالہ دے کر اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان کی شاعری میں حسن خیال کے ساتھ ساتھ حسن بیان بھی ہے۔ غزل کے علاوہ مصنف نے نازکی صاحب کی رباعیات وقطعات کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے اور بالخصوص ان اشعار کو پیش نظر رکھا ہے جو کشمیری عوام کو اجتماعی لاشعور اور آرکی ٹائپس Archetype کی گہرائیوں میں لے جاتے ہیں۔ نازکی صاحب کی ادبی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اردو اور کشمیری زبان کے مقتدر نعت گو ہیں۔ قدوس جاوید نے اس پہلو پر خصوصی توجہ صرف کی ہے اور ایسی تشبیہات واستعارات کو سامنے لائے ہیں جن سے قرآنی آیات اور احادیث اور خلفائے راشدین کے اعمال وکردار کی روشنی چھن چھن کر باہر آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میرے خیال سے یہی باب نازکی صاحب کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے لکھا گیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مصنف نے نازکی صاحب کی نظم نگاری کو یکسر مسترد کر دیا ہے جبکہ ان کی بعض نظمیں جیسے کشمیر، آمد بہار، دیوالہ، گڈریے کا گیت، بانگ درا، ایک اندھی لڑکی کی دعا بہت اہم ہیں جن کا باضابطہ جائزہ لیا جا سکتا تھا اور ان پر مختلف پہلوؤں سے تنقیدی نگاہ ڈالی جا سکتی تھی۔

تیسرا باب میر غلام رسول نازکی کی نثری خدمات پر مشتمل ہے۔ نازکی صاحب کی نثری کاوشیں کئی پہلو پر محیط ہیں۔ سیاسی، سماجی، دینی، ادبی وتنقیدی نثر کے ساتھ ساتھ سنجیدہ تحریروں کا بھی ایک قابل قدر ذخیرہ ان کے قلم سے نکلا ہے۔ معلوماتی، پر مغز اور بے عیب نثر لکھنے میں وہ اپنے معاصرین کے صف اول میں جگہ پاتے ہیں۔ مصنف نے نازکی کی نثری خصوصیات پر ایجاز واختصار سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی نثر نگاری میں فصاحت وبلاغت، زور بیان اور معیار ومزاج کا پتہ لگانے کے لیے اقتباسات کا سہارا لیا ہے۔

چوتھا باب انتخاب نظم ہے جس میں مصنف نے نازکی صاحب کی مشہور ومعروف شعری تخلیقات کا انتخاب کیا ہے۔ پانچواں باب انتخاب نثر ہے جس میں دو مضامین 'اسلام اور مشترکہ قومیت کا تصور' اور 'خواجہ غلام السیدین' کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی قدوس جاوید نے اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے میر غلام رسول نازکی کی ادبی خدمات کا مکمل احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ نازکی صاحب کی شعری ونثری خدمات اور اردو ادب میں ان کے مقام پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ انتخاب کلام نے کتاب کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔ ڈاکٹر قدوس جاوید کی یہ کوشش لائق ستائش ہے اور امید ہے کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

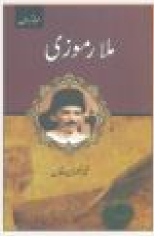

ملا رموزی (مونوگراف)

مصنف: محمد نعمان خاں

صفحات: 128، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصرہ: کوثر جہاں، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اپنے نابغہ ادیبوں وشاعروں پر مونوگراف لکھوانے کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ پیش کیا جا سکے۔ 'ملا رموزی' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ملا رموزی (پ 21 مئی 1896 – 10 جنوری 1952) پر یہ مونوگراف پروفیسر محمد نعمان خاں نے لکھا ہے۔ 128 صفحات پر مشتمل اس مونوگراف میں پیش لفظ، ابتدائیہ، شخصیت اور سوانح، ادبی اور تخلیقی سفر، تصنیفات وتالیفات کی مشمولات کا جائزہ، تنقیدی محاکمہ اور مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب شامل ہیں۔

کتاب کا پہلا باب 'شخصیت اور سوانح' کئی ضمنی عنوانات مثلاً شخصیت، اساتذہ اور احباب، مشاغل، اسفار، شہرت اور مقبولیت اور وفات میں منقسم ہے۔ اس باب میں محمد نعمان خاں نے ملا رموزی کی زندگی سے متعلق تمام گوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور ان کی پیدائش، خاندان، شادی، اولاد، معاشی حالات، ادبی زندگی کا آغاز، مقبولیت، ادبی سلسلے میں کیے گئے اسفار، وفات اور وفات کے بعد ملک کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والی خبروں اور ان کی وفات پر لکھی جانے والی تحریروں اور نظموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

مونوگراف کا دوسرا حصہ 'ادبی اور تخلیقی سفر، تصنیفات وتالیفات کے مشمولات کا جائزہ' ملا رموزی کی ادبی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ملا رموزی نے 1917 میں باقاعدہ طور پر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جلد ہی ان کے مضامین اور کالم ہندوستان کے تمام اہم اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے لگے۔ ملا رموزی نے مختلف موضوعات پر 50 سے

زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور متعدد مضامین، کالم، منظومات، غزلیات، خطوط، تبصرے اور تجزیے تحریر کیے ہیں۔ ان کتابوں اور تحریروں میں بعض کتابیں اور تحریریں اب دستیاب نہیں ہیں۔ ملا رموزی کی دستیاب شدہ کتابوں اور تحریروں کو پروفیسر خالد محمود نے 'کلیات ملا رموزی' کے نام سے پانچ جلدوں میں مع مقدمے کے شائع کیا ہے۔ یہ کلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ملا رموزی کا ایک شعری مجموعہ 'نظریات غزل' بھی چھپ چکا ہے۔ مونوگراف کے اس حصے میں محمد نعمان خاں نے ملا رموزی کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں، مضامین اور دیگر تحریروں اور دستیاب اور غیر دستیاب تحریروں کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ ملا رموزی کے مضامین، کالم، نظمیں، غزلیں اور دیگر تحریریں جن اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے تھے ان کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔

محمد نعمان خاں نے ملا رموزی کی تحریر کردہ چند اہم دستیاب کتب کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ ان کتابوں کے نام درج ذیل ہیں: مقالات گلابی اردو، خواتین انگورہ، سوانح ملا رموزی، نکات ملا رموزی حصہ اول، نکات ملا رموزی حصہ دوم و سوم، صبح لطافت، شادی عورت ذات، لاٹھی اور بھینس، شفاخانہ، زندگی، انتخاب گلابی اردو، خطوط رموزی، جنگ، مشاہیر بھوپال، گلابی شاعری، نظریات غزل، اور ملا رموزی۔

مونوگراف کا تیسرا حصہ 'تنقیدی محاکمہ' ہے جس میں محمد نعمان خاں نے ملا رموزی کے فن کے تمام نمایاں اوصاف کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملا رموزی کے یہاں طنز و مزاح، مشاہدے کی گہرائی، معلومات کی وسعت، جزئیات نگاری، صاف گوئی، ذہانت، اظہار بیان کی قدرت اور جرأت رندانہ پائی جاتی ہے۔ مونوگراف کے آخر میں ملا رموزی کی تحریروں کا جامع انتخاب ہے جس میں محمد نعمان خاں نے ملا رموزی کی نثر اور نظم کا انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ انتخاب 40 صفحات پر مشتمل ہے۔ مونوگراف مختصر اور جامع ہے اور ملا رموزی کی شخصی اور مکمل ادبی زندگی ہے۔ امید ہے اردو داں طبقہ خصوصاً نئی نسل اس سے فیض یاب ہوگی۔

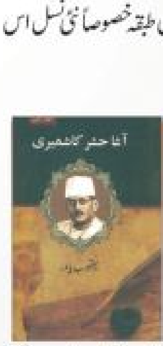

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

مصنف: یعقوب یاور

صفحات: 132، قیمت: 81 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: اسما، R-206، گلی نمبر 5، سرسید روڈ بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'آغا حشر کاشمیری' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادب کے زیر اہتمام نابغہ ادیبوں اور شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے نئے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کو شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستہ ناول نگار 'پروفیسر یعقوب یاور' نے تیار کیا ہے۔ یعقوب یاور بنیادی طور پر ناول نگار کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ 'دل من' اور 'عزازیل' کا شمار ان کے اہم اور مقبول ناولوں میں ہوتا ہے۔ ان کے اب تک دو شعری مجموعے 'الف' اور 'قلم گوید' بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ درجن سے زائد انگریزی اور دوسری زبانوں کے ناولوں کے تراجم بھی کر چکے ہیں۔

پروفیسر یعقوب یاور نے 132 صفحات پر مشتمل آغا حشر کاشمیری مونوگراف بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے اور آغا حشر کاشمیری کے عہد و پیدائش کے ساتھ ساتھ ان کی ڈراما نویسی اور شاعرانہ خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ فہرست سے قبل ایک صفحے پر مشتمل ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر سید علی ارتضیٰ کریم صاحب کا پیش لفظ ہے جس میں اس کتاب کے اغراض و مقاصد پر چند سطور میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعدازاں فہرست عناوین ایک صفحے پر درج ہے۔ 'ابتدائیہ' کے عنوان سے یعقوب یاور کا مضمون بھی قابل ذکر جس میں انھوں نے ڈراما نگاری کی تاریخ و روایت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے اس کا سلسلہ آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری پر ختم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ آغا حشر کاشمیری کی حیات و شخصیت پر مبنی ہے جس میں مصنف نے بڑی تفصیل سے آغا حشر کاشمیری کی زندگی کے کوائف اور اہم واقعات قلم بند کیے ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب 'آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری' کے عنوان سے ہے جس میں ابتدا کے دو تین صفحات میں مصنف نے ایجاز و اختصار کے ساتھ آغا حشر کاشمیری کے ادبی معیار و مرتبے کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عبدالرحمٰن بجنوری کے اس قول کو بھی نوٹ کیا ہے جو انھوں نے اپنے مضمون 'محاسن کلام غالب' میں غالب کے تعلق سے ظاہر کیا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں ''غالب کا کلام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے یا ان کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے۔'' عبدالرحمٰن بجنوری کے درج بالا قول کے ذریعے موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب غالب کے لیے قواعد زبان میں ضمیموں کی ضرورت پڑسکتی ہے تو آغا حشر کاشمیری کے لیے بھی ادبی تنقید کو اپنے طریقے میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ اس حصے میں آغا حشر کاشمیری کے تئیں جو لوگوں میں منفی تاثر قائم ہوگیا تھا اس کا ازالہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور یہ باور کرایا گیا ہے کہ آغا حشر کاشمیری کا معاملہ ڈرامے کے اسٹیج کے ساتھ وہی ہے جو غالب کا غزل کے ساتھ تھا۔

تیسرا باب آغا حشر کاشمیری کی شاعری پر مبنی ہے جس میں ابتدا میں ناقدین کی آرا کے ذریعے آغا حشر کے شاعرانہ مقام کے تعین کے سلسلے میں طویل بحثیں ملتی ہیں جس میں ان کی شاعری اور نظموں کے چند نمونوں اور اقتباسات کے ذریعے ان کی شاعرانہ صلاحیت اور ان کی شاعری کے متعلق موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا چوتھا حصہ آغا حشر کاشمیری کے چند اہم ڈراموں کے مختصر تعارف پر مبنی ہے۔ اس حصے میں آغا حشر کے اردو، ہندی ڈراموں کی کہانی اور قصے کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے قارئین ان کے ڈراموں کے موضوعات و مقاصد سے کلی طور پر واقف ہوسکیں۔

کتاب کے پانچویں حصے میں 'ڈراموں سے انتخاب' کے نام سے آغا حشر کاشمیری کے اہم اور معروف ڈراموں کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں جس میں ان کا اولین ڈراما آفتاب محبت، مرید شک، یہودی کی لڑکی، رستم سہراب، سیتا بن واس اور خوب صورت نیلا کو جگہ دی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں شاعری اور نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس کے تحت آغا حشر کی دو نظموں 'شکریہ یورپ' اور 'موج زمزم' کو جگہ دی گئی ہے جبکہ غزلوں کے انتخاب کی تکمیل 6 صفحات پر مشتمل ہے۔ غرض یہ کہ یعقوب یاور صاحب نے آغا حشر کاشمیری کے اس مونوگراف کے ذریعے ان کی سوانح و شخصیت اور ان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کے معیار و مرتبے کو اجاگر کیا ہے۔

قومی اردو کونسل کے معیار کے عین مطابق ہے جو آغا حشر کے ڈراموں، ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نایاب تحفے سے کم نہیں ہے اور یہ کتاب اردو ڈراموں خصوصاً آغا حشر کاشمیری کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی بے حد مفید اور ناگزیر حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہے اس کتاب کو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

شکست کی آواز: نئے اطراف کی طرف

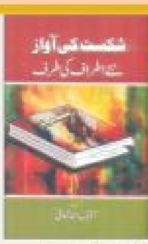

مرتب: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی
صفحات: 236، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر قاسم انصاری، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

عبدالصمد کا شمار عہد حاضر کے ممتاز اور صف اوّل کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی ناول پوری اردو دنیا میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اور معاصر ادب میں ایک گرانقدر اضافے کے طور پر تسلیم کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے عہد اور اس کے تقاضوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ پوری حسیت کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ سیاسیات و سماجیات کے ساتھ ان کا بہت گہرا رشتہ ہے اور وہ انسانی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تصورات میں ابہام اور پیچیدگی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور نہ تکنیکی سطح پر وہ ناول کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ ان گرہوں کو کھولتے ہیں جن سے انسانی زندگی اور معاشرہ لہولہان ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ عناصر بھی ان کے فکر و عمل کا حصہ بنتے رہے ہیں جو ہماری مشترکہ ثقافت کو برباد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اسی لیے عبدالصمد کے یہاں زندگی یکساں اور سپاٹ نہیں بلکہ ان کے یہاں زندگی کشادگی اور تضادات کے ساتھ ایک ایسا مسئلہ بنتی ہے جسے عبدالصمد کی انفرادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یوں تو عبدالصمد کے یہاں موضوعات میں بڑا تنوع ہے لیکن جس مسئلے پر انھوں نے خصوصی توجہ دی ہے وہ سیاسی نظام ہی ہے جس نے انسانی زندگی اور اقدار دونوں کو پامال کر دیا ہے۔ لیکن شکست کی آواز – اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ان معنوں میں توجہ طلب ہے کہ پہلی مرتبہ عبدالصمد نے روش سے ہٹ کر لکھا اور قومی و بین الاقوامی تبدیلی کے رجحان، جدید تقاضے اور پیچیدہ ذاتی و اجتماعی مسئلے کو تخلیق کی زبان عطا کی، اس ناول میں جنسی مسائل اور پیچیدگیوں کے باوجود عبدالصمد نے اعتدال اور توازن کو برقرار رکھا ہے۔ اس میں کردار اور شخصیت کے محض جذباتی پہلوؤں تک ہماری رسائی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دیگر متعلقات زندگی سے بھی ہم واقف ہوتے ہیں اور اس ذہنی و نفسیاتی کشمکش سے بھی جن سے نئی نسل نبرد آزما ہے۔ اسی لیے عبدالصمد نے اس ناول کا انتساب 'ان جوانوں کے نام کیا ہے جن کی ایک بڑی تعداد دھند میں کھوئی ہوئی منزل کی طرف رواں دواں ہے لہٰذا عبدالصمد جیسے بڑے فنکار اور تخلیق کار پر کسی کتاب کا منظر عام پر آنا ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کتاب میں علم و ادب کی ان شخصیات کے مضامین قلمبند ہیں جو نہ صرف اپنی شناخت رکھتے ہیں بلکہ اپنی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوا چکے ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے بڑی خوش اسلوبی اور جانفشانی سے ان مضامین کو یکجا کر کے انھیں کتابی شکل دی ہے اور کتاب کی ابتدا میں ہی اپنے اس اعتراف کو بھی شامل کیا ہے جس میں انھوں نے کتاب کو ترتیب دینے کی غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس اعتراف میں عبدالصمد کے فن، ان کے اسلوب اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ پیش کیا ہے جس سے عبدالصمد کی شخصیت، ان کے فن بالخصوص ان کے ناول شکست کی آواز کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے، وہ مبارکباد کے مستحق اس لیے بھی ہیں کیونکہ عبدالصمد کے فن کو سمجھنا پھر اس کی چھان پھٹک کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے اعتراف کے بعد پہلا مضمون علیم اللہ حالی کا ہے جس میں انھوں نے کہانی کی تفہیم کے لیے ناول کے مطالعے پر زور دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قصے کی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب پوری کہانی کو اسی عہد اور حالات میں رکھ کر دیکھا جائے جس میں فنکار نے بیان کیا ہے ورنہ معاملہ ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ والا بن کر رہ جائے گا''۔ شموئل احمد اپنے مضمون 'شکست کی آواز کے کرداروں کا تجزیہ' میں کہتے ہیں کہ ناول کا مرکزی کردار بڑی حد تک روحانی کرائسس میں مبتلا ہے وہ ہر لمحہ اس پیچیدہ زندگی کی گرہوں کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے اسی لیے ندیم جنسی بدعنوانی کا شکار ہے اور نامحرم سے تعلقات استوار کرنے کا خواہاں ہے اور آخرکار بیمار پڑتا ہے اور زندگی کے آخری ایام میں خود آگہی کی منزل سے گزرتا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کے نزدیک عبدالصمد نے شکست کی آواز میں کرداروں کے حوالے سے الجھی ہوئی بے راہ روی، منتشر زندگی کے واقعات پیش کیے ہیں، اظہار خضر اپنے مضمون میں عبدالصمد کے اسلوب کی چابکدستی کے معترف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عبدالصمد نے ایک ایسی دنیا خلق کی ہے جس میں ہمارا معاصر رویہ اور اعمال دونوں خود احتسابی کی دعوت دیتے ہیں۔ پروفیسر یعقوب یاور اپنے مضمون 'شکست کی آواز – ایک بازدید' میں کہتے ہیں کہ یہاں گناہ و ثواب، نیکی و بدی کا وہ معیار نہیں جو ہماری میراث رہا ہے اس کی جگہ ناول میں شکست و ریخت کے درمیان ایک نئے قسم کی تہذیبی قدر کے ابھرنے اور رفتہ رفتہ سماج میں اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے کا عمل نظر آتا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، ابوذر ہاشمی، مناظر عاشق ہرگانوی، علی امام، منظر اعجاز، راشد انور راشد، انوارالحق کے بھی مضامین شامل ہیں جو ناول اور ناول نگار دونوں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں، کتاب کے آخر میں ایک مضمون انگریزی کا بھی شامل ہے۔ یہ مضمون افروز اشرفی کا ہے جس کا عنوان "Shikast ki Awaz, the long dark night" ہے۔ انگریزی سے دلچسپی رکھنے والے قاری اس دس صفحے کے مضمون کو بآسانی پڑھ سکتے ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اس کتاب کو اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی سے منسوب کیا ہے۔ کتاب میں احتشام حسین کے اُس قول کو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں ان دونوں اہم شخصیات کی خدمات کو سلام کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب عبدالصمد کی شخصیت، ان کے فن، اسلوب اور سب سے بڑھ کر ناول شکست کی آواز کا مکمل احاطہ کرتی ہے جس سے عبدالصمد کی سیاسی و سماجی و تہذیبی بصیرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کی یہ کتاب ناول کے فن، بالخصوص شکست کی آواز کی فنی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو سمجھنے میں بھرپور مدد کرے گی۔

علی عباس حسینی کی کہانیاں (حصہ اول)

مرتب / ناشر: نند کشور وکرم
صفحات: 624، قیمت: 312 روپے، سنہ اشاعت: 2015
مبصر: نفیس عبدالحکیم،
51 مسلم ہاسٹل، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

علی عباس حسینی [3 فروری 1897 – 27 ستمبر 1969] ضلع غازی پور کے قصبہ 'پارہ' میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے غازی پور، الہ آباد، پٹنہ، لکھنؤ اور علی گڑھ میں تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد تدریس جیسا محترم پیشہ اختیار کیا۔ سرسید کے قائم کردہ 'وکٹوریہ اسکول' غازی پور کے پرنسپل مدرس مقرر ہوئے۔ وہ پریم چند کے بعد اردو کے دوسرے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دیہی زندگی پر خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے فلمی دنیا میں بھی قدم رکھا لیکن طبعی مناسبت نہ ہونے کے باعث بہت جلد کنارہ کش ہو گئے۔

علی عباس حسینی نے کہانی لکھنے کی شروعات پریم چند کے زیر اثر کی لیکن بہت جلد انھوں نے اپنا مخصوص رنگ پیدا کر لیا اور ہمیں کئی اہم افسانے عطا کیے اور اردو کہانی کی تاریخ میں اس طور اپنا نام ثبت کیا کہ آج بھی کہانی کی تاریخ میں ان کا اسلوب اور کہانی کہنے کا رنگ اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے قومی اور معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی قبیح رسومیات، بیوہ عورت کے مسائل، بے جوڑ شادی، جہیز

کی لعنت اور چھوت چھات جیسے موضوعات کو اپنا موضوع بنایا۔ اس دور میں وہ ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے معاشرے کو احترام انسانیت اور مشرقی و مغربی تہذیب کے فرق اور اخلاقی اقدار کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اتر پردیش کی دیہی معاشرت سے متعلق متعدد افسانے سپرد قلم کیے۔ اس میں دیہات کی خوشیاں، تکلیفیں اور پریشانیاں اپنے پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ سمٹ آئی ہیں۔ ساتھ ہی دیہاتیوں کی سادہ لوحی، بھولے پن اور آپسی رنجش و دوستی..... غرض کے زندگی جن مختلف رنگوں سے عبارت ہے وہ بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں بعض رنگ شوخ ہیں تو بعض دھندلے۔ 'ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے' کے دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہے: ''جو دس افسانے اس مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں وہ سب ہماری دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ حقیقت بھی ہیں اور خواب بھی اور وہم بھی؛ لیکن ہمارا دیہاتی معاشرہ انھی تانوں بانوں سے بُنا ہے۔'' [ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے؛ ص:5] علی عباس حسینی نے اپنی کہانیوں میں ذات پات کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ پسماندہ اور غریب کسانوں کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعے کیے جانے والے استحصال اور جبر و ستم کی بھی مذمت کی ہے۔

حسینی کے افسانوں کی کتابیں ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئی تھیں۔ اب وہ کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی ہیں۔ بزرگ ادیب نند کشور وکرم قابل مبارک باد ہیں جنھوں نے اس جانب توجہ دی اور ان کے افسانوں کو بہ صورتِ کلیات شائع کیا۔ ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے جس میں کل باون کہانیاں اور ایک مختصر خود نوشت شائع کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کلیات ریسرچ اسکالرز کے لیے معاون اور عام قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ثابت ہوگی۔

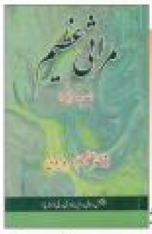

مراثی عظیم

مصنف: ڈاکٹر عظیم امروہوی

صفحات: 384، قیمت: 300 روپے

ناشر: عالمی مرثیہ سنٹر، نئی دہلی

مبصر: ارشاد قمر، اے بی452، پہلی منزل، امر پوری، رام نگر، نبی کریم، پہاڑ گنج 55

ڈاکٹر عظیم امروہوی ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سادات نقوی کے چمن کا مہکتا ہوا پھول ہیں۔ عظیم نے علم کے گہواروں میں پرورش پائی اور آغوش ادب کے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جس میں محبت اہل بیت دلوں میں گھر بنائے ہوئے ہے۔

ان کی کتاب 'مراثیِ عظیم' مرثیوں پر محیط ہے۔ اور مرثیہ کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ اسے نیا موڑ میر ضمیر نے دیا اور اس کے اجزا کو ترتیب دے کر اس کے دامن کو مزید وسعت عطا کی۔ پر اس درخت کو خون جگر سے سینچ کر میر انیس اور مرزا دبیر نے اتنا گھنیرا، تناور اور سایہ دار کر دیا کہ اس طرح کی ارتقائی شکل کسی دیگر صنف سخن کو میسر نہ ہوئی اور انیس و دبیر نے اسے معراج پر پہنچایا لیکن اس کے بعد مرثیے کی زندگی کے لیے ضروری تھا کہ اسے کوئی نیا موڑ دیا جائے، نئے رجحانات سے روشناس کیا جائے، وقت کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اور اس کی افادیت میں نئے نئے زاویے شامل کیے جائیں تاکہ مرثیے کو نئی زندگی حاصل ہو اور پھر ایسا ہی ہوا بھی۔ ان بانیانِ جدید مراثی کے ذریعے مرثیے کے دامن کو وسعت و کشادگی حاصل ہوئی۔ کردار کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنا۔ عوام کی زندگی کا ترجمان بھی بنا، ان کے مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بھی بنا، امام حسین کی شخصیت کے محدود تصور کو ختم کر کے اس میں ہمہ گیری اور عوام سے قربت پیدا کی گئی اور تزکیہ نفس کے لیے امام کی سیرت اور کردار کے اعلیٰ نمونوں کو ذریعہ بنا کر جدید مرثیہ سامنے آیا جس کی ایک مثال مراثی عظیم ہے۔

اس طرح جدید مرثیے میں نواسۂ رسول امام حسین کو انسانیت کا پیکر، کاروان حیات کا رہنما، خواب غفلت سے جگانے والا، صبر و تحمل کا مجسمہ، نوع بشر کو تذلیل سے بچانے والا، حریت کا پیغامبر اور عدم تشدد کی عملی تعلیم دینے والا کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ مرثیے کی دنیا میں یہ وہ انقلاب تھا جس سے مرثیے کی شکل و صورت میں کافی تبدیلی آئی۔ مرثیے کو وسعت بھی ملی، سامعین و قارئین اور عوام سب کے ذہنوں میں تبدیلی کے ساتھ انھیں متاثر بھی کیا۔ مراثی عظیم ان خصوصیات کا بین ثبوت ہے۔

قدیم و جدید مرثیے میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ قدیم مرثیے کا مقصد شہادت کے واقعات کا بیان تھا لیکن جدید مرثیہ مقصد شہادت بیان کرنے پر زور دیتا ہے۔ یعنی کربلا کی قربانی نے بنی نوع انسان کو کیا کیا درس دیا اور کس لیے قربانی پیش کی گئی۔ قدیم مرثیہ کا اصل مقصد حزن و ملال، رنج و غم اور گریہ وزاری تھا لیکن جدید مرثیے کا مقصد رلانے کے ساتھ جگانا اور ذہنوں کو بیدار کرنا ہے۔

قدیم مرثیے کے موضوعات واقعات شہادت اور اسیری اہل حرم کے ساتھ شاعرانہ تعلی، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، ساقی نامہ اور فطری مناظر وغیرہ تھے لیکن جدید مرثیے کے موضوعات معاشرے کی اصلاح، مسائل زندگی کا بیان، کردار سازی اور حیات و کائنات کے تمام اخلاقی، علمی، تاریخی، تہذیبی، سائنسی اور فلسفیانہ موضوعات ہیں۔ قدیم مرثیہ ایک غریب الوطن ایک بے کس و بے مددگار اور ایک بھوکے اور پیاسے کی مظلومیت پر گریہ وزاری کرنے پر آمادہ کرتا تھا۔ لیکن جدید مرثیہ ایک مجاہد، ایک شجاع اور ایک بہادر دلاور کی شہادت پر رلاتا ہے اور صبر کی تلقین نہیں کرتا بلکہ عزم و حوصلہ اور جوش و خروش پیدا کر کے مرد میدان اور سورما بناتا ہے اور حق پر جان دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ایسے آنسو بہانے کو کہتا ہے جن سے شرار زندگی برسے۔

قدیم مرثیہ اپنے عہد کا آئینہ دار نہیں تھا جبکہ جدید مرثیہ اپنے عہد کا آئینہ دار ہے۔ قدیم مرثیہ تاریخ تھا۔ جبکہ جدید مرثیہ تاریخ کے ساتھ ہی تبصرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ قدیم مرثیہ طویل ترین صنف سخن ہے لیکن جدید مرثیہ نسبتاً اختصار چاہتا ہے جس کا سبب عصر حاضر میں انسانی زندگی کی مصروفیت ہے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی دانستہ کوشش رہی کہ زبان سلیس اور سہل ہو۔ بیان کی ژولیدگی سے پاک رہے کیونکہ آج کے سامع اور قاری کا وہ معیار نہیں ہے جو سو سال یا پچاس سال قبل تھا کسی بھی واقعے یا پیغام کے ابلاغ و ترسیل کے لیے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حسینیت کے آفاق گیر محرکات اور انسانیت نواز اثرات پر نظر رکھ کر رثائی ادب کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں یقیناً عظیم امروہوی کامیاب ہوئے ہیں ساتھ ہی جس سلیقے اور ترتیب سے مراثی پیش کیے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ ان کے مراثی کے بارے میں مشاہیر نے بہت عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے لکھا تھا کہ ہندوستان کا نوجوان شاعر عظیم امروہوی فکر و نظر سے کام لے رہا ہے اور حسین ابن علی کے معرکہ حق سے درس عمل دینے پر آمادہ نظر آتا ہے اسی طرح انیس امروہوی کی یہ رائے ہے کہ ''اس جواں فکر شاعر نے صنف مرثیہ میں جو اضافے کیے ہیں ان کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے اور حیرت بھی۔ ان کے مراثی علمی و ادبی منظوم مقالے ہیں۔ کتاب کی طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

مصنف: احمد صغیر

صفحات: 180 قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصرہ: تسنیم بانو، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

احمد صغیر کا نام مشہور و معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اب تک ان کے تین ناول، چار افسانوی مجموعے (منڈیر پر بیٹھا پرندہ، اناکو آنے دو، درمیان کوئی تو ہے اور داغ داغ

زندگی)، پانچ تراجم کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی، انتخاب اور تجزیہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' احمد صغیر کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے لیکن یہ افسانوی مجموعے کے ساتھ مضامین اور ناقدین کے نظریات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس مجموعے میں 14 افسانے، دو مضمون اور احمد صغیر کی ادبی خدمات پر 13 ناقدین کے نظریات و آرا شامل ہیں۔ مقالہ 'انحراف اور احتجاج کے افسانے' از علی احمد فاطمی، 'طبقاتی رشتوں کا نیا انداز بیانیہ' از پروفیسر فصیح ظفر۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ احمد صغیر نے افسانہ تحریر کرنے سے پہلے معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اقتباس درج کیا ہے اور اس سے متعلق تصویریں بھی شائع کی ہیں۔ جن افسانہ نگاروں کے اقتباس ہیں ان میں نجات، کفن پریم چند کے افسانے کا اقتباس 'تعفن' اور 'انا کو آنے دو' ابتدا میں ہے۔ کرشن چندر کے افسانے کالو بھنگی اور مہالکشمی کا پل کا اقتباس 'ڈوبتا ابھرتا ساحل' 'پیاسی ہے زمین پیاسا آسمان' کے شروع میں ہے۔ اور علی عباس حسینی کا افسانہ 'ہمارا گاؤں'، سعادت حسن منٹو کا افسانہ 'شغل'، عصمت چغتائی کا افسانہ 'دو ہاتھ'، حیات اللہ انصاری کا افسانہ 'ڈھائی سیر آٹا'، خواجہ احمد عباس کا افسانہ 'تین بھنگی'، احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'موچی'، ہاجرہ مسرور کا افسانہ 'کمینی' جیلانی بانو کا افسانہ 'نروان' خواجہ احمد عباس کا افسانہ 'میری لین کی چلون' اور واجدہ تبسم کا افسانہ 'جھوٹن' کے اقتباس آغاز میں ہیں۔ احمد صغیر کی ادبی خدمات پر جن ناقدین نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے ان میں وہاب اشرفی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر محفوظ الحسن، ڈاکٹر مشتی رضوی، حقانی القاسمی، فیاض احمد وجیہ، ڈاکٹر نسیم ابن صمد، ڈاکٹر کوثر مظہری، معصوم عزیز کاظمی، سید احمد قادری، اشہد کریم الفت، محمد جسیم الدین اور ڈاکٹر غضنفر اقبال ہیں۔

احمد صغیر نے افسانہ 'تعفن' میں ماحولیات اور ماں کی ممتا کو قلم بند کیا ہے'۔ اس کے برعکس 'انا کو آنے دو' ایک انقلابی افسانہ ہے۔ اس میں ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ یہ افسانہ عوام میں بیداری پیدا کرتا ہے اور نظام کو تبدیل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ افسانہ 'ڈوبتا ابھرتا ساحل' انفرادیت کا حامل ہے اس میں مرد کی بدلتی ہوئی نفسیات اور جذبات کو پیش کیا گیا ہے ایک لڑکی کے ساتھ پولس والا زبردستی اور زیادتی کرتا ہے جب وہ تنہا رہ جاتی ہے تو وہ اس سے پدری شفقت کا اظہار کرتا ہے۔ احمد صغیر کا یہ افسانہ خیالی افسانہ ہے۔ افسانہ 'پیاسی ہے زمین پیاسا آسمان' عقیدت اور توہم پرستی پر مبنی ہے جو پوری طرح سے بے حس اور بے رحم سماج کے رویے کو اجاگر کرتا ہے۔ ایک ماں بھوک سے بلکتے ہوئے اپنے بچے کے لیے بھگوان سے بغاوت کرتی ہے احمد صغیر نے اس افسانے میں سماج کی بدلتی ہوئی تصویر کو پیش کیا ہے۔ 'پناہ گاہ' افسانے میں بدکردار ماسٹر کو پیش کیا ہے۔ افسانہ 'شدھی کرن' میں ذات پات اور چھوا چھوت سے نظریے کو نئے انداز میں تحریر کیا ہے۔

افسانہ 'اوور ٹائم' جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ احمد صغیر کا افسانہ 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' لڑائی و خون خرابے کی کہانی ہے جو ابھی تک سماج میں رائج ہے اور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ اس مجموعے میں کچھ وہ افسانے بھی شامل ہیں جو پہلے افسانوی مجموعے میں موجود ہیں۔ اسلوب سادہ اور شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں پر جملے اور حروف کی لغزش ہے۔ مجموعہ 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے دلت افسانے' کی کہانیاں عصر حاضر کے اہم مسائل کو بیان کرتی ہیں۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس کے افسانے آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں کیونکہ ہمارے سماج کی حقیقت نگاری اور جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ ان کہانیوں میں انھوں نے موجودہ دور کے مسائل جیسے ظلم و ستم، استحصال و عصمت ریزی، دہشت و تشدد اور نکسل واد جیسے موضوعات کے ذریعے سماجی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ اور کہیں کہیں رومانوی جذبات کی عکاسی بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ اختصار اور معنی خیزی سے پر ہے اور صداقت کے ساتھ زبان سادہ اور شفاف ہے افسانوں کے کردار کی زبان اور ان کی ادائیگی کو خاص اہمیت حاصل ہے نسوانی کردار معاشرے پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں احمد صغیر نے عورت کی زبانی سماج کے منفی پہلو کو عیاں کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے متعلق پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں: 'احمد صغیر کی یہ کہانیاں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں حالانکہ جابہ جا رومانی تخلیقی جملوں عنوانوں نے اسے حد تک افسانوی فضا بنائی ہے تاہم ان کی ترقی پسند سماجی وابستگی نے بڑے خلوص و اہتمام سے اسے جذب و پیوست کیا۔ اس لیے کوئی چاہے تو اسے اکہری یا جامد حقیقت کہہ سکتا ہے جبکہ حقیقتیں سیال بھی ہوا کرتی ہیں اور پیچیدہ بھی'۔

بلا شبہ احمد صغیر کی پہچان احتجاجی اور انقلابی کہانیوں کی بدولت ہے انھوں نے مجموعے میں دلت، مظلوم اور مفلس طبقے کی پیروی کی ہے۔ غریب اور دلت طبقے سے وابستہ یہ کہانیاں فن، تہذیب اور حقیقت کے اعتبار سے معیاری ہیں کیونکہ زندگی کی حقیقت اور صداقت کو افسانوں میں فکری آگہی اور فنی ادراک کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امید کہ احمد صغیر کی اس کتاب کو ادبی حلقے میں پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

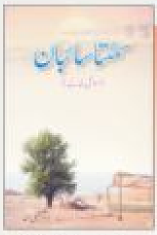

سمٹتا سائبان

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر شکیل احمد

صفحات: 160، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: راحت افزا

R-206، گلی نمبر 5، سرسید روڈ بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر شکیل احمد کے سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب خاکہ نگاری میں ان کا پہلا تجربہ ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد کافی حد تک اس فن میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ خاکے ان تمام ہستیوں پر مشتمل ہیں جو اس دنیائے فانی سے رحلت کر چکے ہیں۔ جو لوگ ہمارے درمیان موجود نہیں ہوتے ان پر خاکہ لکھنا بہت ذمے داری کا کام ہوتا ہے کیونکہ موت اور حیات کا وقفہ انسان کو اس کی حقیقی تصویر میں کہیں دھندلکے میں چھپا دیتا ہے لیکن ڈاکٹر شکیل احمد نے اس فاصلے کو بڑی ہنرمندی سے طے کیا ہے کیونکہ ڈاکٹر شکیل احمد نے اپنی منجھی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ایک اردو افسانوں میں سماجی مسائل دوسری 'مئو شہر ہنروراں' کتاب میں انھوں نے 10 خاکے تحریر کیے ہیں جن میں دو خاکے ان کے متعلقین سے وابستہ ہیں۔ باقی تمام مصنف کے اساتذہ کی نذر ہیں جن میں ڈاکٹر انیس ادیب، ڈاکٹر محمد طاہر، ڈاکٹر لکھپت رائے، رام جی اپادھیائے، پروفیسر احمد لاری، پروفیسر افغان اللہ اور پروفیسر محمود الٰہی ہیں۔ ان سبھی اساتذہ کا تعلق دارالعلوم مئو سے لے کر، پی جی کالج لکھنؤ مئو، ڈی اے وی کالج اعظم گڑھ، ڈی سی ایس کالج (گورکھپوری یونیورسٹی) سے ہے۔ مصنف نے ان خاکوں میں اپنے اساتذہ کرام کے ان تمام واقعات و سانحات کا ذکر کیا ہے جس سے طالب علمی کے دور میں سابقہ پڑا تھا۔ ان خاکوں میں مصنف نے اپنے استاد کے عادات و اطوار و گفتار کے ساتھ ان کی ادبی خوش فعلیوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسے پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر احمد لاری، ڈاکٹر اختر بستوی اور افغان کا خاکہ لکھتے وقت ان مقالات کی تفصیلی نوعیت، اور مقالہ نگار کے موضوع کو بھی واضح کیا ہے جو ان کے زیر نگرانی لکھے گئے جو قاری کو لطیف حقائق کے ساتھ معلومات میں بھی مزید اضافہ فراہم کرتے ہیں۔

اس کتاب میں تمام خاکے شخصی ہیں۔ اس نوعیت کے خاکے لکھتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ قلم کی ذرا سی لغزش تعصب اور جانبداری کے الزام کی نذر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں خاکہ نگاری تنقید نگاری، یا تجزیہ نگاری سے کہیں زیادہ دشوار گزار کام ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد نے اپنی رفیق حیات کا خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے اپنی اہلیہ کی شخصیت کو ابھارتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کے تمام واقعات، کو بڑی فراخ دلی

سے پیش کیا ہے۔ اس خاکے کے مطالعے سے مصنف کی اہلیہ اور خود ان کی زندگی پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس کی زندگی کے نامساعد حالات، خوشیاں اور غم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی اہلیہ کے عادات و اطوار کے ساتھ اس کی سیرت و کردار کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی واضح کیا ہے۔ لیکن کمزوریوں کا ذکر بہت ہی ہلکے پھلکے اور مدھم انداز میں کیا ہے۔ دراصل یہ انداز مصنف کا اپنی رفیق حیات کے تئیں محبت و عقیدت اور دلی قربت کے سبب در آیا ہے۔ یہ بات بالکل فطری ہے کہ اگر کسی شخص سے دلی قربت یا قریبی روابط ہوں تو قلم ڈگمگانے کا خدشہ رہتا ہے۔ بہرحال یہ تمام خاکے لائق توجہ ہیں ان میں دلچسپی اور اثرانگیزی بدرجہ اتم ہے۔ آخری خاکہ اپنے بیٹے (کامران عادل) پر لکھا ہے۔ اس میں ڈاکٹر شکیل نے عہد طفلی سے لے کر جوانی اور موت تک کے واقعات کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ پڑھ کر دل لرز اٹھتا ہے جس میں بیٹے کی طویل علالت کا بھی ذکر ہے۔ اس کی مصیبتوں، مشقتوں کو لکھتے وقت ایک باپ نے اپنے کو کس طرح سنبھال رکھا ہے یہ لائق توجہ ہے۔ بہرحال مصنف تو مصنف ہوتا ہے۔ ان خاکوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بے حد سہل اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ زبان میں روانی کے ساتھ اس کی شگفتگی بھی سلامت ہے۔ آخر میں کہوں گی کہ ڈاکٹر شکیل احمد کی یہ کوشش اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ یہ کتاب اردو حلقوں میں اپنی شناخت و معیار ثبت کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

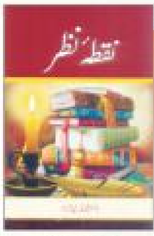

نقطۂ نظر

مصنف: ڈاکٹر نور نبی آزاد

صفحات: 216، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عادل حیات، 37/89 گراؤنڈ فلور، گلی نمبر 1، غفار منزل، نئی دہلی

زندگی کا عام اصول ہے کہ ایک پیڑھی کے بعد دوسری پیڑھی اس کی جگہ لیتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کی رفتار تھم جائے اور دنیا ویرانی و بیابانی کا نقشہ بن کر رہ جائے۔ یہی اصول تمام شعبہ ہائے زندگی بشمول زبان و ادب پر صادق آتا ہے۔ جب کوئی شاعر یا ادیب دنیائے فانی سے جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے تو اس کی جگہ پر کرنے کے لیے کوئی نیا چہرہ سامنے آجاتا ہے، جس کی وجہ سے زبان و ادب کا کاروبار اپنے آغاز سے لے کر ابھی تک قائم و دائم ہے۔ ڈاکٹر محمد نور نبی آزاد بھی اردو ادب میں نووارد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین گاہے گاہے جرائد و رسائل میں بھی چھپتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب 'نقطۂ نظر' انھیں مضامین پر محیط ہے۔ جس میں انھوں نے زیادہ تر نثری ادب سے خاص دلچسپی دکھائی ہے۔ ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا غالب، انشاء اللہ خاں انشاء، سرسید احمد خاں، پریم چند، سہیل عظیم آبادی، صالحہ عابد حسین، سعادت حسن منٹو، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن اور بیگ احساس جیسی شخصیتوں کی سوانح و تخلیقات کو موضوع بنایا ہے۔ اس حصے میں پریم چند پر ان کے دو مضامین پریم چند کی تخلیقات پر گاندھیائی اثر اور پریم چند کا اسلوب نگارش شامل ہیں۔ دراصل ڈاکٹر نور نبی آزاد کی تحقیق کا موضوع بھی پریم چند سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بنا پر پریم چند کی طرف ان کا جھکاؤ فطری ہے۔ اس مجموعے کے دوسرے حصے میں انھوں نے رومانی تحریک، ہم عصر اردو افسانہ، اردو ادب میں مزاحمت اور فورٹ ولیم کالج جیسے علمی و ادبی افکار اور تحریکات و رجحانات پر اپنی بساط بھر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ چند مضامین ایسے بھی ہیں، جن کا تعلق بنیادی طور پر تحقیق سے جا کر مل جاتا ہے۔ 'نقطۂ نظر' میں شامل ان مضامین کو پڑھ کر صاحب کتاب کی تنقیدی بصیرت اور اس میدان میں ان کی جاں فشانی کا پتہ چلتا ہے۔

زبان و ادب کے اس جدید دور میں سمینار اور ستائش کے لیے لکھے گئے مضامین کی کتابوں سے لائبریریوں کی الماریاں بھری ہوئی ہیں، ڈاکٹر نور نبی آزاد کا بغیر کسی لالچ اور ہوس کے علمی و ادبی مضامین لکھنا اور پھر اسے قرینے کے ساتھ سجا سنوار کر کتابی صورت میں پیش کرنا لائق تحسین ہے۔ 'نقطۂ نظر' میں مصنف نے نہ کسی فلسفے کی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور نہ ہی اپنے کسی خاص نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان کے مضامین میں وہی باتیں دہرائی گئی ہیں، جو ہمیں دوسرے ناقدین کے یہاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے کہ ڈاکٹر محمد نور نبی آزاد تنقید کے میدان میں نووارد ہیں۔ انھیں تو ابھی لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اس لمبے سفر میں بہت سی مشکلوں کا سامنا ہوگا، کئی رکاوٹیں آئیں گی اور تنقیص و تحسین کے مقام سے بھی گزرنا پڑے گا۔ اگر ثابت قدمی کے ساتھ ان مراحل کو عبور کر گئے تو یقیناً وہ ایک اچھے تنقید نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں گے۔

میں آخر میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے ان الفاظ کو دہرانا چاہتا ہوں کہ 'بنیادی طور پر 'نقطۂ نظر' میں شامل تمام مضامین کا اسلوب اور انداز بیان یکساں ہے یعنی سادہ اور صاف۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھا کر اپنی باتوں کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ عبارت میں کہیں کہیں ناہمواری اور کھردرے پن نے جگہ لے لی ہے اور کہیں کہیں زبان پر نظر ثانی کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے، مگر مصنف کی اولین کوشش، مقصد، نقطۂ نظر اور علمی و ادبی کساد بازاری کے اس دور میں جب 'کاٹا اور لے دوڑی' کا دور دورہ ہے، زبان و ادب سے ان کے لگاؤ اور محنت کو دیکھ کر اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔' میں مستقبل میں خوب سے خوب تر کی توقع کرتے ہوئے، انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ 'نقطۂ نظر' کی علمی و ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

عرفان و ادراک

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر رئیس احمد

صفحات: 547، قیمت: 216 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان، ڈاکٹر عبدالعلی طبیہ کالج، کٹولی، ملیح آباد، لکھنؤ

زیر تبصرہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع شدہ معیاری کتاب ہے جو مختلف نوعیت کے مضامین، تجزیے اور تحقیق و تنقید پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر رئیس احمد کے یہ مضامین اور مقالے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جنھیں اب کتابی شکل دے دی گئی ہے۔

ترتیب کے اعتبار سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا پیش لفظ ہے، جناب شین کاف نظام کا مقدمہ ہے اور خود مصنف نے اپنے تاثرات بھی حرفے چند کے عنوان سے پیش کیے ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے 'عرفان و ادراک' کو ایک ادبی دستاویز بتایا ہے۔ ڈاکٹر رفعت اختر خاں نے رئیس احمد کو تخلیقی حسیت کا قلندر بتایا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شرف النہار کے مطابق وہ رئیس الفہم ہیں۔ ڈاکٹر امتیاز احمد کہتے ہیں خدا تجھے۔ کسی طوفاں سے آشنا کردے، ڈاکٹر غلام حسین نے گوہر بے بہا کہا ہے اور خاور نقیب نے فکر و دانش کا جہانِ دیگر، یہ فہرست طویل ہوجائے گی جو صرف مصنف کی ادبی شناخت کے ساتھ شخصیت اور ذاتی نوعیت کے تعارف پر مرکوز ہے۔

تحقیق و تنقید کے باب میں ڈاکٹر رئیس احمد نے مختلف تذکروں اور تذکرہ نگاروں پر اپنے تحقیقی نظریات پیش کیے ہیں۔ ان مقالوں کی تعداد گیارہ ہے جو عمدہ تنقیدی رجحان بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جن کتابوں کو موضوع بنایا گیا ہے ان کے مصنفین اور مرتبین کا بھی تعارف پیش کردیا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب تنقید وتجزیے پر مشتمل ہے جس میں 22 کتابوں کے اچھے تجزیے شامل ہیں بالخصوص اردو زبان اور لسانیات: گوپی چند نارنگ، پرواز: اے پی جے عبدالکلام، میرا سفر: عبدالکلام تلامذۂ غالب: مالک رام، لفظ: پروفیسر آل احمد سرور، مخزن-6، مدیر مقصود الٰہی شیخ اور ادراک ادب: ڈاکٹر غلام حسین وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس باب میں غیر مسلم ادیب وشاعر ومصنف کی کتابیں بھی شامل ہیں مثلاً آثار الشعرائے ہنود: منشی دیبی پرشاد بشاش، فیضان غالب: عرش ملسیانی، تذکرۂ شعرائے فرخ آباد: شگفتلا موج فتح گڑھی وغیرہ۔

کتاب کا اگلا باب نقد وتبصرہ ہے جن کی مجموعی تعداد 15 ہے۔ ان تبصروں میں سہ ماہی فکر وتحقیق، سورداس کے روحانی نغمے، شہر غزل، غزل اور غزل کی تعلیم - اردو ناول کے اسالیب، اردو زبان کی تدریس، سہ ماہی نئی کتاب وغیرہ شامل ہیں جن میں ڈاکٹر رئیس احمد کی بصارت اور بصیرت دونوں کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ 'نگارشات' کے عنوان کے تحت رئیس صاحب کی دو خوبصورت تخلیق بھی کتاب کی زینت بنی ہوئی ہیں جس میں ایک 'پروفیسر صاحب' کا خاکہ ہے اور دوسرا انشائیہ ہے جس کا عنوان ہے خوشامد درآمد۔

ڈاکٹر رئیس احمد کو مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی دلچسپی دیگر زبانوں کے ادب سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور کتاب میں شامل تراجم جو ہندی سے اردو میں کیے گئے ہیں اس بات کا غماز ہیں کہ یہ ترجمے جو مختلف نوعیت کے مضامین، افسانے، انٹرویو اور سائنسی وتکنیکی موضاعات پر مشتمل ہیں اردو کے قالب میں پہنچ کر ان کی اہمیت اور افادیت نمایاں ہوگئی ہے۔

'اردو تذکرہ نگاری 1835 کے بعد': (اصحاب قلم کی نظر میں) کتاب کا آخری باب ہے جس میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر فیروز احمد، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر حدیث انصاری، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر معین الدین شاہین اور ڈاکٹر عبدالرب کی تحریریں شامل ہیں جو تاثراتی نوعیت کی ہیں۔

عرفان وادراک میں شامل تجزیاتی مطالعے بھی بہت عمدہ ہیں۔

اس نہایت اہم مجموعے عرفان وادراک پر میں ڈاکٹر رئیس احمد کو مبارکباد دیتا ہوں۔

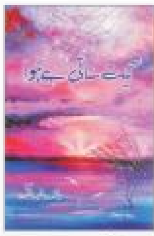

گیت سناتی ہے ہوا

مصنف: راشد انور راشد

صفحات: 264 مجلد، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: نوشین عثمانی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202002

'گیت سناتی ہے ہوا' 60 غزلوں اور 60 نظموں پر مشتمل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تمام غزلیں اور نظمیں فطرت سے متعلق ہیں۔ غزلوں میں جہاں مظاہر فطرت کو برتا گیا ہے وہیں تمام نظمیں فطرت اور انسانی رشتے کے ناگزیر پہلوؤں سے وابستہ ہیں۔ قدرت کے حوالے سے کہیں مستانہ کیفیت کا احساس ہے، کہیں قدرتی مناظر کی تباہ کاریوں کا خوف، کہیں بدلتے ہوئے مناظر کا افسوس، تو کہیں موسموں کا لطف ہے مگر پھر بھی قدرت کی آغوش میں ہی شاعر پناہ ڈھونڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی ایسی جاذبیت ہے کہ یہ مجموعہ ادب کے موجودہ منظرنامے میں قابل ذکر اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے۔ شاعر نے موضوع کی سطح پر ایک بہترین تجربہ کیا ہے۔ یہ تجربہ اس لیے کامیاب ہے کہ غزل کی مستحکم روایت اس میں فنکاری کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں اپنے زمانے کا احساس اور اپنی روایت سے گہری وابستگی بہ طور خاص نمایاں ہوتی ہے اور یہی خصوصیت ان کی غزلوں کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ترنم اور لطافت کا عنصر نمایاں ہے اور مختلف ذہنی تاثرات وکیفیات خوف، خوشی، غم، اداسی، جوش، حیرت غرض کہ تمام کیفیات ومحسوسات کی کامیاب ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں قدیم اقدار اور فن کے پامال ہونے کا افسوس جابجا نظر آتا ہے اور یہ سارا منظرنامہ مظاہر فطرت سے متعلق ہے۔ یہ اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں:

کیا کوئی یاد ترے دل کو دکھاتی ہے ہوا سرد سناٹے میں کیوں شور مچاتی ہے ہوا
لوگ خوشبو کی تجارت میں ہیں مصروف مگر یہ ہنر ہم نے تو سیکھا ہی نہیں وادیٔ گل
بدن جزیرے کی چنگاریوں سے تنگ آکر وہ اپنے جسم پہ ملنے لگی پہاڑ کی برف

ان اشعار میں فطرف کے مظاہر اور انسانی زندگی کی وابستگی کو بہ طور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے۔

راشد انور راشد کی نظموں میں انداز بیان کا تنوع پایا جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ انداز بیان موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ قاری مظاہر فطرت اور انسانی رشتوں کی وابستگی کو نئے تناظر میں دیکھتا ہے اور نظموں میں پیش کیے گئے مسائل زندگی کے آفاقی تصور کو وسعت بخشتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہیں یہ انداز بیان سوالیہ، تحیر آمیز، خطابیہ، عاجزانہ اور کہیں رجائی بھی ہے۔ بعض اوقات شاعر نے مختلف پیرایہ بیان کا ایک ہی نظم میں استعمال کیا ہے جس سے نظم کی دلکشی دوبالا ہوجاتی ہے۔ اس سلسلے میں 'موسم آئے گا، ضرور آئے گا' نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

زندگی تو بھی مجھے اجنبی گرداتی ہے یاد کر یاد وہی پیڑ ہوں میں
جس کی چھاؤں کے تلے تونے اک عمر گزاری ہے
اور تو پھر بھی میری ذات سے ناواقف ہے دھوپ سے جنگ تو جاری ہے مگر
آج تم روٹھ گئیں مجھ سے میری پرچھائیں تو بھی اپنوں کی طرح غیر ہوجاتی ہے
زندگی تو مجھے کیوں اجنبی گرداتی ہے

مجموعی طور پر یہ مجموعہ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

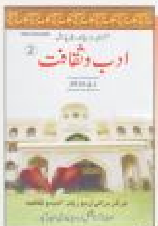

ادب وثقافت۔ ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

سرپرست اعلیٰ: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، مدیر: پروفیسر محمد ظفرالدین

شمارہ: 2، مارچ 2016، صفحات: 220 قیمت: درج نہیں ہے

ناشر: مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' حیدرآباد

مبصر: قمر جمالی

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد سے شائع ہونے والا ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل ''ادب وثقافت'' کا شمارہ نمبر 2 بابت مارچ 2016 منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ شمارہ کچھ اتنا پرمغز' دلچسپ اور معلوماتی ہے کہ لگتا نہیں کہ صحافت کی اس سنگلاخ زمین پر اس کا یہ دوسرا ہی قدم ہے۔ جادہ پیمائی تو ابھی باقی ہے۔ اس کا ہر مضمون قرات مکرر کا متقاضی ہے۔ کسی بھی تحریر کے بڑے کہلانے کا یہی تو وصف ہے کہ ہر قرات کے بعد کچھ اور نئی راہیں تفہیم کی طرف راغب کرے۔ جریدے میں شامل سبھی مضامین ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں اور اس کے رجحان ورفتار کا پتہ دیتے ہیں۔

'شذرات' کے تحت ایڈیٹر پروفیسر محمد ظفرالدین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یونیورسٹی کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ہمیں اس اہم دانش گاہ کے حوالے سے ایک خوش آئند احساس دلاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''20 اکتوبر 2015ء کا سورج مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے تعلق سے ایک

انتہائی مبارک پیغام کے ساتھ طلوع ہوا جب سائنس اور اُردو کی معروف شخصیت ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے چوتھے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی۔ اُن دنوں یونیورسٹی پرآشوب دور سے گزررہی تھی۔ اساتذہ' طلبہ اور غیرتدریسی عملے میں ہرسطح پر اضطراب کی سی کیفیت تھی۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر اسلم پرویز نے عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے یونیورسٹی برادری سے خطاب کیا۔ اُن کی تقریر نے تپتے ہوئے صحرا کے پیاسوں کے لیے آب سرد کا کام کیا اور حالات یکا یک کافی حد تک معمول پر آگئے... خوش آئند بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اسلم پرویز اُردو زبان اور اُردو ذریعہ تعلیم کے زبردست حامی ہیں۔ اُنھوں نے اس مختصری مدت میں اُردو کی سربلندی کے سلسلے میں کئی اقدام کیے ہیں جس سے نہ صرف اندرونِ جامعہ بلکہ بیرونِ جامعہ بھی پوری اُردو دُنیا میں اُن کا بڑے پیمانے پر خیرمقدم کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے ''ادب وثقافت'' کے لیے مثبت رویے کا اظہار کیا اور اسے پورے آب وتاب سے جاری رکھنے کی تائید کی۔''

ادب وثقافت میں سب سے پہلا مضمون پروفیسر شارب ردولوی کا 'ایک درویش انقلابی۔ نیاز حیدر' ہے۔ جس میں حقائق تو اپنی جگہ قائم ہیں مگر اظہار میں شارب صاحب کا ممدوح کے تئیں انسیت' محبت' اظہار کا رچاؤ قاری کو اختتام تک تھامے رکھتا ہے۔ جناب کلیم عاجز کی خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' پر ڈاکٹر محمد سرورالہدیٰ صاحب کا مقالہ بہت خوبصورت ہے۔ اقتباسات کے ذریعے کلیم عاجز صاحب کی نثر پڑھ کر شگفتگی کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے کلیم عاجز کی زندگی کے شخصی اور داخلی معاملات کو خارجی اور مجلسی بنا دیا۔ ڈاکٹر سید محمود کاظمی کا مضمون ''کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات۔ اقبال ایک مطالعہ کے حوالے سے'' دماغ کے خوابیدہ گوشوں کو بیدار کرتا ہے۔ اُنھوں نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات کے آٹھ نکات کو concise کرکے پیش کیا ہے وہ قاری کے ذہن میں روشن میناروں کی طرح محفوظ رہیں گے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عورت کا تصور پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اُنھوں نے نئی بات یہ کہی کہ بیدی نے ہر عورت میں ماں کو تلاش کیا ہے۔ اس میں اُن کی سائیکی کا دخل ہے۔ اُن کے ہاں ازل تا ابد اس کائنات کو چلانے والی ہستی ماں ہی ہے جس سے اس دنیا کے خیر وشر' آسودگی اور بے چینی' آخر میں تکمیل حیات منسوب ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے عابد سہیل کی سوانح 'جو یاد رہا' کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے جبکہ پروفیسر قدوس جاوید نے اُردو کے سماجی وثقافتی ڈسکورس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کے قدیم ترین حوالے سے بہت ہی عمدہ اور معلوماتی مقالہ پیش کیا جس کی ضرورت اُردو اور فارسی حلقوں میں ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ دیگر مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی (اُردو لغت کی تعین قدر)' ڈاکٹر محمد ریاض احمد (اُردو کے اہم مکتوب نگار)' ڈاکٹر شاہ نواز عالم (وقت کی کہانی کبیر جوش اور اختر الایمان کی زبانی)' ڈاکٹر مزمل سرکھوت (دکنی شاعری کا قطب شاہی دور) ڈاکٹر بدر سلطانہ (مثنوی گلشن عشق میں دکنی تہذیب وثقافت) اور ڈاکٹر رؤف خیر (اقبال اور مادہ تاریخ) شامل ہیں۔

آخر میں تاثرات کے صفحات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ عمدہ سرورق کے علاوہ اندرونِ ٹائٹل دو اہم تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ ایک 'ادب وثقافت' کے مرکزی وزیر محترمہ نجمہ ہبت اللہ کے ہاتھوں اجرا کی تصویر ہے جبکہ دوسری تصویر ممتاز شاعر زبیر رضوی کی آخری جلسے میں شرکت سے متعلق ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ جریدہ اُردو کے ادبی و ثقافتی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں جریدے کے سرپرست اعلیٰ محترم شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اور ایڈیٹر پروفیسر محمد ظفرالدین کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

مختصر تبصرے

سورج تم جاؤ

شاعر: علینا عترت/ صفحات: 176 / قیمت: 250 روپے/ ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

دور حاضر میں تانیثیت کے حوالے سے اردو غزل کا ابھرتا ہوا نام علینا عترت کا ہے۔ جنھوں نے اپنی غزلوں میں ایک ایسی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو اپنے آپ کو اس مسابقاتی دنیا میں کسی سے کم نہ سمجھتی ہو اور نہ ہی اس مرد پرور سماج میں کسی کا سہارا لینے پر مجبور ہو۔ اسی لیے وہ اپنی کتاب کے آغاز میں ہی اعلان کر دیتی ہیں ''میرے ارد گرد اپنی کرنوں کا روپہلا جال پھیلانے والے ...... میں خوش ہوں اپنی ذات میں، اپنے آپ میں، اپنی تنہائی میں، اپنی رات میں...... اس سے پہلے کہ میں تمہارے اس سنہرے جال میں پھنس کر اپنے وجود پر خود کا اختیار کھو بیٹھوں۔ تم جاؤ...... سورج تم جاؤ......''

'سورج تم جاؤ' علینا عترت کا شعری مجموعہ ہے جو عرشیہ پبلی کیشنز سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں 100 غزلیں، 18 نظمیں اور 9 قطعات شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعے کی پہلی غزل سے ہی قاری کو ایک نئی آواز اور احتجاجی آہنگ کا اشارہ مل جاتا ہے جو اخیر تک برقرار رہتا ہے:

شام کے وقت چراغوں سی جلائی ہوئی میں   گھپ اندھیروں کی منڈیروں پہ سجائی ہوئی میں
دیکھنے والوں کی نظروں کو لگوں سادہ ورق   تیری تحریر میں ہوں ایسے چھپائی ہوئی میں

خود آگاہی کا یہ جذبہ اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ یہ کہنے میں بالکل بھی جھجک محسوس نہیں کرتی:

بے قراری سے نہ اب ایسے صدا دو مجھ کو
میں تمھیں بھول گئی تم بھی بھلا دو مجھ کو

لیکن علینا عطرت کا یہ انداز نظموں میں آکر بدل جاتا ہے جس کا اندازہ مجموعے میں شامل نظموں 'تکمیل، بکھرے رنگ، ایک تجارات' سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ محبوب کے بغیر زندگی کو احساس سے عاری تصور کرتی ہیں، اور زندگی کو بھرپور بنانے کے لیے کسی کا سہارا لینے پر مجبور نظر آتی ہیں۔ ''دوست مرے...... کیا تم مدد کروگے......؟۔ رشتے، انجام، آج پھر، دو بوند آنسو، اوس کے عنوان سے لکھی گئی نظموں میں دور حاضر کے مسائل مثلاً رشتوں کے ہجوم میں احساسات کا فقدان اور انسان کا اپنی ذات میں سمٹ کر رہ جانا وغیرہ کو بہ خوبی پیش کیا گیا ہے۔ قطعات میں بھی انھیں موضوعات سے ہم کو واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجموعی طور سے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔

خوشبو کے تعاقب میں

شاعر: ڈاکٹر عارف انصاری/ صفحات: 120، قیمت: 150 / ناشر: فاضلی اردو سوسائٹی، برہانپور

'خوشبو کے تعاقب میں' ڈاکٹر عارف انصاری کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ ان کے اشعار ہمارے ذہن ودل کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ متعدد شعروں میں فکر وخیال کی بلندی ایسی ہے کہ ہمارے ذہن کو اہم فکر انگیز واقعات اور امور کی جانب لے جاتی ہے اس قسم کے اشعار میں ان کا انداز سخن اچھوتا اور قابل داد ہے لیکن ایسے اشعار کی تعداد کم ہی ہے۔ زیادہ تر ان کی کوشش رہی ہے کہ سامنے کی باتوں کو ہی سہل انداز میں پیش کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ بعض اشعار میں موضوعات کی رنگارنگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مجموعے میں شامل نظموں کی ابتدا 'مدرس' کے عنوان سے ہوتی ہے۔ چونکہ شاعر کا تعلق درس وتدریس کے پیشے سے ہے اس لیے اس نظم میں ان کے تجربات کے ساتھ اس عظیم پیشے میں شامل افراد کے کارناموں کے بیان میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ نظموں کے عنوانات میں جہاں تنوع پایا جاتا ہے وہیں ان کے خیالات میں ایک قسم کا ٹھہراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب 'خوشبو کے تعاقب میں' شاعری سے شغف رکھنے والے افراد کے لیے ایک نیا اضافہ ثابت ہوگی۔

اچھی ہوا

شاعر: ڈاکٹر ظفر سرونجی/صفحات: 112 / قیمت: 150 / ناشر: انتساب پبلی کیشنز (ایم پی)

'اچھی ہوا' ڈاکٹر ظفر سرونجی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات کو شامل کیا گیا ہے۔ ظفر سرونجی نے جس طرح کا مزاج پایا تھا اس کے مطابق عام شاہ راہ پر چلنا مشکل تھا لہٰذا انھوں نے انسانی زندگی اور اس میں پائے جانے والے مسائل کو ایک الگ زاوئے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ روزمرہ زندگی میں وقوع پذیر واقعات وحادثات کو جداگانہ انداز سے دیکھنے کی روش ان کے قارئین کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے:

پتے اڑا کے لے گئی کھانے کے واسطے　　فاقہ تھا چار دن کا ہوائیں بھی کیا کریں

کرشمہ صرف ہاتھوں کا ہے خنجر کون ہوتا ہے　　جہاں پھینکو وہیں جائے گا پتھر کون ہوتا ہے

ان جیسے متعدد اشعار کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی شاعری میں جب یکسانیت کا رونا رویا جا رہا ہے تو ان حالات میں ظفر سرونجی جیسے لوگ ایک امید کی کرن بن سکتے ہیں۔ ظفر کا ایک اور کمال یہ ہے کہ انھوں نے دیسی بھاشا اور ہندی الفاظ کو اپنے شعر میں کلیدی حیثیت دی ہے، جو دیگر زبان سے اردو میں آ کر اب اردو زبان کے لفظ کہے جانے کے مستحق ہیں:

وہ سندر سا پیارا سپنا روٹھ گیا ہے آنکھوں سے　　جسکو ہم نے دن میں چاہا پیار کیا ہے راتوں میں

لاکھ بھلانا چاہا تم کو تنہائی کے موسم میں　　یاد کے کاجل ڈھل نہ پائے اشکوں کی برساتوں میں

غزلیہ اشعار کے علاوہ ان کی نظموں اور قطعات میں ہمیں ایک ایسا انداز دیکھنے کو ملتا ہے جس میں انسانی قدروں کی پامالی پر تیکھے انداز میں وار کیا گیا ہے۔ نئی نسل کے کسی انجان شاعر کے اشعار اگر قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کتاب موجودہ شاعری کے موسم میں ایک 'اچھی ہوا' ثابت ہوگی۔

نئے پرندے

شاعر: ہستی مل ہستی/صفحات: 128 / قیمت: 125 / ناشر: والی آسی اکیڈمی لکھنؤ

زیر تبصرہ کتاب 'نئے پرندے' ہندی کے مشہور شاعر ہستی مل ہستی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو اردو رسم الخط میں والی آسی اکیڈمی لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو اردو رسم الخط میں منظر عام پر لانے میں مشہور شاعر منور رانا اور کیف صدیقی کا بہت اہم رول رہا ہے۔ جنھوں نے ہندی مسودے کو اردو قالب میں ڈھالنے کا کام انجام دیا۔ مجموعے میں شامل غزلوں کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہستی مل ہستی کی فکر کا پرندہ تصورات کی کن کن وادیوں کا سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ وہ کسی خاص نہج اور مکتب فکر کے پابند نظر نہیں آتے۔ کہیں کہیں انھوں نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو غزل کے مزاج سے میل نہیں کھاتے لیکن انھیں گرانی کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا:

دوریاں، نزدیکیاں ایسی ہی ہم دونوں میں ہیں　　جیسی ہوتی ہے عموماً دو گھروں کے درمیاں

اپنے گھر کے آنگن کو مت قید کرو دیواروں میں　　دیواریں زندہ رہتی ہیں لیکن گھر مر جاتے ہیں

مذکورہ اشعار کے مطالعہ سے قاری پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہستی مل ہستی کی غزلوں میں انسان اور انسانی رشتوں کی تعظیم وتکریم کے ساتھ عہد حاضر پر بھی گہری نظر ہے۔ ان کا فکروشعور اور فہم وادراک معاشرے کی زبوں حالی وکسمپرسی کو خوش حالی وترقی میں تبدیل کر دینے کا خواہاں ہے۔ ان کی شاعری عزم وحوصلہ سے بھرپور ہے اور اس میں مضبوط نصب العین اور ثابت قدمی کی باتیں بھی ملتی ہیں۔

دوہا درپن

شاعر: فراغ روہوی/صفحات: 112 / قیمت: 73 روپے/ ناشر: گلستاں پبلی کیشنز، کلکتہ

عہد قدیم سے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو جس خوبصورتی کے ساتھ دوہے میں بیان کیا جاتا رہا ہے وہ شرف شاید ہی کسی دوسری صنف کو حاصل ہوا ہو۔ گویا دوہا ہماری گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے کا ایک بہترین ذریعہ رہا ہے۔ جس میں بلاتفریق مذہب وملت شاعروں نے اپنے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اپنی مٹی سے محبت اور اپنی تہذیب کی حفاظت ہر قوم کا وصف ہے اور باعث فخر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اس زبان کے حساس تخلیق کار اپنی تہذیبی وثقافتی میراث کو نہ صرف محفوظ رکھتے ہیں بلکہ نئی نسل کو منتقل بھی کرتے رہتے ہیں۔ انھیں تخلیق کاروں میں فراغ روہوی کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے ہندوستان کی قدیم ترین صنف شاعری دوہا سے اپنی محبت وعقیدت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس فن میں طبع آزمائی کی اور اس کی تہذیبی قدروں اور مزاج کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'دوہا درپن' فراغ روہوی کے دوہوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے دوہے کی قدیم ترین روایت کو جس خوش اسلوبی سے اپنے فکروفن کی اساس بنایا ہے وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ فراغ روہوی کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے ان کے متعدد مجموعہ کلام منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ دوہے کی فنی اور جمالیاتی قدروقیمت سے وہ بخوبی واقف ہیں اس لیے اپنے دوہوں میں انھوں نے اظہار وابلاغ کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ معرفت الٰہی کا بیان ہو یا علم وفضل کا احوال، معاشی یا معاشرتی بدحالی ہو یا پھر عدم رواداری کا شکوہ غرض زندگی کے ہر پہلو کو اپنے دوہوں کا موضوع بنایا ہے:

جگنو ہو یا چاندنی، جگ ظاہر یہ بات　　سب میں میرے سائیاں، جھلکے تیرا روپ

ناممکن کچھ بھی نہیں، جگ ظاہر یہ بات　　چاند ستارے چھو چکے انسانوں کے ہاتھ

جھگڑے سے جھگڑا مٹے ناممکن یہ بات　　سمجھوتہ کر دیکھئے بدلیں گے حالات

درج بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی ارضی ثقافتی وراثت پر شاعر کی نظر کتنی گہری ہے۔ ہماری قومی تہذیب وثقافت، ادب وفنون لطیفہ، طرز معاشرت اور سماجی زندگی کے تمام معمولات میں ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کا پرتو نظر آنا باعث فخر ہے۔ اس لحاظ سے فراغ روہوی کے دوہوں کا یہ مجموعہ 'دوہا درپن' وقت کی ضرورت اور ہندوستانی میراث کو نجو کر رکھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

مسرت کے ترانے

مرتب: ضیاء الرحمٰن غوثی/صفحات: 120 / قیمت: 150 / ناشر: دارالتصنیف وتالیف، سمستی پور

زیر تبصرہ کتاب 'مسرت کے ترانے' 70-1960 کے درمیان پٹنہ سے شائع ہونے والے بچوں کے محبوب ماہنامہ 'مسرت' کی شائع شدہ نظموں کا انتخاب ہے۔ جسے اس کے ایڈیٹر ضیاء الرحمٰن غوثی نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ ماہنامہ 'مسرت' تازہ اور رنگارنگ پھولوں سے سجا ہوا ہوتا تھا۔ ان میں پیاری پیاری نظمیں باتصویر شائع ہوتی تھیں۔ جو نہ صرف بچوں میں بلکہ عمر رسیدہ بزرگوں کے درمیان بھی معروف ومقبول تھیں۔ جیسا کہ مرتب نے نظموں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے 'سات سال سے ستر سال کے بچوں کے لیے' مجموعے میں شامل نظموں میں زبان کی سلاست کے ساتھ زندگی کی آئینہ داری بھی ملتی ہے۔ انوکھے اور سحر انگیز تراکیب کے لیے ضیاء الرحمٰن غوثی نے ان نظموں کو یکجا کیا ہے۔ ان نظموں میں احساس، تخیل اور جذبے کی آمیزش ہے اور غیر معمولی دانشمندانہ حسن اور فن ہے۔ سیدھی سادی باتیں، سیدھے سادے مشاہدے، منفرد بننے کے فلسفے اور زندگی کے مختلف تصویروں کا سفری اظہار ان نظموں میں ہم پاتے ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں بچوں کے لیے نظمیں کہنے والے شاعر گنے چنے رہ گئے ہیں، ایسے میں یہ نظمیں بلند حوصلگی کی ارفع ترین مثالیں ہیں۔ جو بچوں، بڑوں اور شاعروں کو نئی کائنات عطا کرتی ہیں۔ تاریخی، سماجی، نفسیاتی اور قومی نوعیت کی یہ نظمیں حقیقت، تلاش اور جستجو سے بھرپور ہیں جو شعور اور لاشعور کو زیادہ سے زیادہ روشن کرتی ہیں۔

مبصر: جمال اختر، D-238 چوتھی منزل ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی

عالمی اردو نامہ

گلف اردو کونسل کا سیمینار

خلیجی ریاستوں میں اردو ادب کے موضوع پر منعقدہ اپنی نوعیت کے پہلے سیمینار میں پروفیسر ارتضی کریم ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان نے صدارت کی، مہمان خصوصی پروفیسر پیرزادہ قاسم اور مہمان اعزازی قطر سے بطور خاص ان تقریبات کے لیے تشریف لانے والے سرپرست بزم صدف دوحہ قطر جناب صبیح بخاری رہے۔

فراست علی خسرو نے گلف اردو کونسل کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ گلف اردو کونسل کا قیام خلیج میں مقیم قلمکاروں کو عالم اردو سے روشناس کروانے کے لیے ایسی تقریبات منعقد کرنا ہے جس سے مقامی ٹیلنٹ کو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کا موقع ملے۔

اس اجلاس میں شہاب الدین احمد ایڈیٹر صدف برائے قطر کو علی الحق یادگار ایوارڈ سے نوازا گیا جن کے مقالے کا عنوان 'خلیجی ادب کا جائزہ عالمی تناظر میں' موصوف نے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے قطر کی تنظیم بزم صدف اور سہ ماہی صدف کا تعارف بھی پیش کیا اور پروگرام کے دوران سہ ماہی صدف کی رونمائی کی رسم بھی ادا کی گئی جسے اسٹیج پر تشریف فرما تمام مہمانوں نے سراہا۔

جبکہ خاتون مقالہ نگار سمیرہ عزیز کو مولانا فرید الوحیدی ایوارڈ پیش کیا گیا ان کے مقالے کا عنوان 'سعودی عرب کے اردو ادب میں خواتین کا کردار تھا'، سمیرہ عزیز سعودی شہریت کی حامل خاتون قلمکار ہیں انھوں نے جدہ ریاض دمام اور دیگر شہروں میں مقیم خواتین کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ادبی مساعی سے بھی حاضرین محفل کو روشناس کروایا، یہ معلومات شرکا کے لیے استعجاب وحیرت کا باعث تھیں کہ سعودی عرب میں بھی خواتین اپنے حصے کی شمع خوب روشن کر رہی ہیں۔ خاص طور پر سمیرہ عزیز نے محترمہ تبسم علوی کا ذکر بھی کیا جن کی تنظیم ماوراخواتین کے اجلاس منعقد کرتی ہے۔

عرب نیوز کے سینئر اڈیٹر جناب سراج وہاب کے مقالے کا موضوع 'جدہ سعودی عرب میں اردو صحافت' تھا، جناب سراج وہاب نے اردو صحافت کے حوالے سے حافظ برادران اور خاص طور پر اردو نیوز ہفت روزہ آواز اور مدینہ پبلی کیشنز کا ذکر کیا۔ اردو نیوز کے پہلے ایڈیٹر انچیف مختار الفال سے موجودہ ایڈیٹر انچیف طارق مشخص کے سفر کو بیان کرتے ہوئے اردو میگزین اوہفت روزہ روشنی پر بھی نظر ڈالی۔

ندیم ماہر نے قطر کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے گلف اردو کونسل کے جنرل سکریٹری مہتاب قدر کو بھی بزم صدف کی جانب سے یادگار مومنٹو سے نوازا۔ محترم ندیم ماہر نے اردو کو قطر کی دوسری بڑی زبان گردانا اور قطر کی تنظیموں اور مدارس کا ذکر بھی کیا۔ بزم اردو قطر، قطر کی معروف انجمن جو 1959 میں قائم ہوئی، گویا یہ پورے خلیج کی سب سے قدیم انجمن ہے۔ صبیح بخاری کی خدمات کو بھی ندیم ماہر نے خوب سراہا، جو قطر کی کئی انجمنوں کے سرپرست ہیں۔ سلیم جعفری اور مسیّب مرحوم کے دور کو بھی یاد کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اطہر عباسی گلف اردو کونسل جدہ کے متحرک اور معزز رکن، صدر عالمی اردو مرکز نے متحدہ عرب امارات میں اپنے قیام کے دوران لکھے گئے ایک مقالے کو پیش کر کے اپنی یادوں کے پھول تازہ کر لیے۔ امارات کی ابتدائی کوششوں کا احاطہ کرتے ہوئے موصوف نے وہاں کی تنظیموں اور افراد کی خدمات کو بہت خوب صورت انداز میں سراہا اور

ساتھ ہی گلف اردو کونسل کی موجودہ کوششوں کو جناب اطہر عباسی نے نئی تاریخ رقم کرنے کا باعث گردانا۔ نعیم جاوید کو ڈاکٹر اوصاف احمد ایوارڈ سے نوازا گیا جن کے مقالے کا عنوان 'دنیائے خلیج میں اردو کا ارتقا اور مستقبل' تھا۔

مہمان خصوصی جناب صبیح بخاری کو عبدالرحیم انصاری ایوارڈ اور صدر اجلاس پروفیسر ارتضی کریم کو مولانا حامد الانصاری غازی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ جناب صبیح بخاری نے اپنے احساسات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اردو زبان قطر آنے کے بعد اس وقت سیکھی جب مجھے اپنی ماں کو خط لکھنے کے لیے کوئی اور زبان کا سہارا نہ مل سکا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ اردو کی سرپرستی کے لیے ہمیشہ تیار ہیں اور موصوف نے سمیرہ عزیز کے جذبات کی بھی تعریف کی۔

پیرزادہ قاسم صدیقی نے کہا کہ سمینار کی کیفیت اور تاریخ سے میں تو واقف ہوں ہی کہ پچاس برس سے درس وتدریس سے وابستہ ہوں، اور ارتضی کریم صاحب جانتے ہیں کہ اس میں گنے چنے لوگوں کی تعداد ہوتی ہے، جو موضوع سے متعلق اور مطابقت سے کچھ گفتگو کرنا اور سننا چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں اتنی بڑی تعداد میں آپ سب جمع ہیں یہ نہایت قابل تحسین بات ہے۔

پیرزادہ نے اپنے ہندوستان کے دورے میں پروفیسر ارتضی کریم کے ساتھ ملاقات کا ذکر بہت خوب صورت انداز میں کیا۔ ارتضی کریم صاحب کی تعریف کرتے ہوئے پیرزادہ صاحب نے ان کی صلاحیتوں کو سراہا اور کہا کہ استاد دنیا کی کسی بھی بڑی ذمے داری کو سنبھال سکتا ہے اسی لیے آج وہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادارے کے سربراہ ہیں۔ پیرزادہ نے فرمایا کہ اردو زبان کی محبت اور اس کے رشتے سے جڑے ہم یہاں بیٹھے ہیں اور یہ اصل میں بڑی خوبیوں والی زبان ہے۔ وہ جو خوبیاں زبان کی ہوتی ہیں وہ ساری خوبیاں اردو میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ارشاد کونسل قونصل خانہ ہند جدہ نے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ہے جہاں عربی نہیں پڑھائی جاتی ہے مگر ایسا گھر نہیں ملے گا جہاں اردو کا ٹیچر بھی رکھا جاتا ہو موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ اردو بچوں کو پڑھانے کے لیے ہم اسی عربی کے استاد کو کچھ پیسے زیادہ دے کر اردو بھی پڑھوائیں اگر آپ نے یہ کرلیا تو آپ نے اپنی زبان اور ثقافت کو منتقل کر دیا۔

پروفیسر ارتضی کریم نے اپنی تقریر کے دوران اردو والوں کو کہا کہ جو بات دو دنوں کی روداد میں قدر مشترک کے طور پر نظر آئی وہ یہ ہے کہ آپ سب حضرات وہی باتیں سوچ رہے ہیں جو یہ خاکسار سوچتا ہے۔ حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے۔ لیکن یار کے لیے دلدار ہونا ضروری ہے، اگر وہ دل کا بڑا نہ ہو تو معمولی سی فرمائش اور فہمائش کو بھی شکایت سمجھ کر دل موڑ لیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ماحول میں نفاق کو ختم کرکے اتفاق کو پیدا کرنے کی سعی کریں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم کل ہر شعر پر واہ واہ کر رہے تھے اور آج ہر مقالے پر آہ آہ کر رہے ہیں۔ آہ سے واہ کا یہ سفر اردو نے ہمیشہ طے کیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ادیبوں اور شاعروں کی بے شمار کتابیں روزانہ چھپتی ہیں، مجھے لگتا ہے کہ اردو میں کتابیں چھپتی ہیں اور چھپتی ہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ میں یہاں کی صورت حال سے بھی خوب واقف ہوں کیونکہ جو دل کا حال ہے وہی دلّی کا حال ہے۔ اردو والوں کی ایک بات اچھی ہے کہ وہ پوری دنیا میں ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ مزید کہ اردو زبان کو یہ شرف حاصل ہے اور صرف اردو کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں کوئی دو نمبر کا شاعر پیدا نہیں ہوا سب ایک نمبر کے عظیم شاعر ہیں۔ سرکار کو اردو کا دشمن قرار دینے والے یہ سوچیں کہ حکومت کو اردو سے سروکار نہیں ہے مگر آپ کا سروکار کیا ہے سرکار۔ موصوف نے سبھی کو فردا فردا اس کی ذمے داری دی کہ ہم سب کل صبح سے ایک غیر اردو داں کو اردو پڑھانے کا عزم لے کر جائیں اور یہ کام اپنے گھر سے شروع کریں۔

ڈاکٹر ارتضی کریم نے کہا کہ میں زبان کے فروغ کے لیے کام کروں گا ادب کے فروغ کے لیے نہیں، کیونکہ زبان نہیں رہے گی تو کون پڑھے گا غالب کو کون پڑھے گا آج کے شاعر کو۔

آخر میں کونسل کے فعال رکن حسن بازید نے کلمات تشکر سے اس یادگار محفل کے اختتام کا اعلان کیا۔

پریس ریلیز: مہتاب قدر، جدہ، 16 جون 2016

نصر ملک کی ادبی خدمات کا اعتراف

ڈنمارک: ڈنمارک میں اردو زبان وادب کے فروغ کے

لیے، بزم ڈنمارک پچھلے تیس برس سے متحرک ہے اور اردو زبان وادب کے لیے خدمات بجالانے والوں کی خدمات کے اعتراف میں انھیں اعزازات سے نوازتی ہے۔

28 مئی کو ہفتے کے روز بزم ادب ڈنمارک نے لاہور ویلفیئر سوسائٹی کے تعاون سے مشترکہ طور پر یہاں کے معروف صحافی وادیب، شاعر و براڈ کاسٹر اور مترجم جناب نصر ملک کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا اور ان کی چالیس سالہ ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ڈنمارک میں پاکستانی برادری کے ایما پر ایک 'شیلڈ' سے نوازا۔ اس تقریب کی صدارت بزم کے بانی و سرپرست رکن جناب خواجہ محمد ادریس نے کی۔ ڈاکٹر محمد اقبال، اے ڈی بٹ، ہاشی ریشی، طاہر محمود (اوڈنسے)، محمد آفتاب (لاکرونا پیزا والے) اور چاند شکلا نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔

بزم ادب ڈنمارک کے صدر سید ترغیب بلند نقوی امروہوی نے نصر ملک کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ موصوف ڈنمارک میں وہ پہلے شاعر وادیب ہیں جن کی شاعری کی کتاب 'قطبین' اور کہانیوں/افسانوں کا مجموعہ 'ہوئے مر کے ہم جو رسوا' کم و بیش تیس بتیس سال پہلے یہاں سے شائع ہوا اور اس سے پہلے نصر ملک، ڈنمارک سے 'صدائے پاکستان' کے نام سے ایک ماہانہ اخبار جاری کرتے رہے جو بعد میں پندرہ روزہ کردیا گیا تھا۔ یہ اسکینڈے نیویا کا پہلا اردو اخبار تھا جو آٹھ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اور اب ان کی مرتب کردہ 'ڈینش اردو لغت' بھی شائع ہو چکی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی جامع لغت ہے اور لغت کی تیاری میں ان کی اہلیہ ہما نصر نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ نصر ملک ڈنمارک میں اردو ادب کا بیج بونے والے وہ پہلے قلمکار ہیں جو آج بھی اردو ادب کے فروغ کے لیے اس کی آبیاری میں کوشاں ہیں۔ سید بلند ترغیب نقوی امروہوی نے اس موقعے پر نصر ملک کو 'منظوم خراج تحسین' پیش کرتے ہوئے ان کی علمی وادبی کاوشوں کو سراہا اور ان کی ادبی وسماجی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

تارکین وطن اور یورپ میں نسلی تعصب کے حوالے سے چار کتابوں کے مصنف اور یورپی سطح پر تارکین وطن کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیم 'اینار' کے جنرل سیکریٹری باشی قریشی نے اپنے خطاب میں نصر ملک کی اردو ادب کے فروغ کے لیے خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈنمارک میں تخلیق ہونے والے اردو ادب میں نصر ملک کا سب سے زیادہ حصہ ہے اور ڈینش ادب کو اردو اور اردو کے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ڈینش زبان میں ترجمہ کرکے انھوں نے دونوں ملکوں کے درمیان ایک لسانی وثقافتی پل تعمیر کردیا ہے۔

ڈنمارک سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ وقار کے بانی و مدیر ماسٹر ذوالفقار، بزم ادب کے بانیوں میں شامل معروف دانشور وادیب اور شاعر جناب اسلام ساقی، جناب محمد حنیف ایڈووکیٹ، آزاد صحافی اور روزنامہ جنگ کے نامہ نگار جناب اسلم مہر اور ورلڈ پیس مومنٹ کے چیئرپرسن جناب عابد علی عابد، بزم ادب کے سرپرست اعلیٰ ممتاز شاعر جناب خواجہ محمد ادریس (ساحل ریسٹورینٹ والے) ممتاز شاعر اور آن لائن ریڈیو سب رنگ کے ڈائریکٹر شری چاند شکلا ہدیہ بادی، جناب ڈاکٹر محمد اقبال خان، جناب پرویز اختر، جناب راجن ملک اور لاہور ویلفیئر سوسائٹی کے بانی وصدر اور معروف سماجی و سیاسی کارکن اور پاکستانی برادری کی ہردلعزیز معتبر شخصیت جناب برکت علی ملک پیانے بھی خطاب کیا اور اردو ادب وصحافت کے لیے اپنی اپنی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے نصر ملک کی اردو ادب کے لیے خدمات پر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

جناب نصر ملک نے اس موقعے پر ڈنمارک میں اردو ادب اور اس کے فروغ کے لیے اپنی اور اپنے احباب کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کو اجاگر کیا۔

رپورٹ: اردو ہمعصر ڈاٹ ڈی کے، کوپن ہیگن، ڈنمارک

اردو تدریس کے مسائل پر ڈنمارک میں بین الاقوامی سمینار

کوپن ہیگن: ڈنمارک میں مہجری ادب اور اردو تدریس کے مسائل پر بین الاقوامی سمینار اور تقسیم ایوارڈ پروفیسر خواجہ اکرام کو &quot سفیر اردو ایوارڈ سے نوازا گیا لٹریچر اینڈ کلچر انٹرنیشنل اور ٹی لنک ڈنمارک کے اشتراک سے بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت عباس رضوی نے کی۔ مقررین میں سندھو محترمہ لبنی ومحترمہ سویٹا یوسف زئی، محترم زبیر رائے، محترم سرور ان کے علاوہ کئی مقامی ادیبوں نے شرکت کی۔ صدف مرزا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے صدف نے بتایا کہ ہندو پاک کو یہ اردو ہی قریب لاسکتی ہے اس زبان کی ترویج وتشہیر ہم سب کی ذمے داری ہے خواہ وہ مہجری ادیب ہوں یا ہندو پاک کے۔ اس سمینار کا بڑا مقصد یہ تھا کہ کس طرح اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی تدریس کو فروغ دیا جائے کیونکہ اگر نئی نسل کو اردو کی جانب راغب نہیں کیا گیا تو گزرتے وقت کے ساتھ کہیں نئی بستیوں میں اردو کا چلن کم نہ ہوجائے ابھی تک مقام شکر ہے کہ نئی نسل کے ادیب و شاعر اس تہذیبی وراثت کو آگے بڑھانے میں شامل ہیں لیکن ان کی تعداد حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ابھی بروقت اس حوالے سے کام کرنے کی ضرورت اور وقت کے مطالبے کے مدنظر اس ورکشاپ اور سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ لٹریر اینڈ کلچر انٹرنیشنل، ڈنمارک نے بہت جلد اوپن اردو اسکول کھولنے کا عزم کیا ہے۔ ورکشاپ میں اس کے لائحہ عمل پر غور کیا گیا۔ انشاءاللہ جلد اس اسکول کا قیام عمل میں آئے گا۔ ساتھ ہی ٹی وی لنک ڈنمارک نے یہ طے کیا کہ اپنے پرگراموں کو مزید دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 4 جون 2016

امریکہ میں اردو مشاعرے

واشنگٹن: امریکہ میں مقیم اردو برادری کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی ورثوں سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے اور اسی جذبہ جنون خیز کی مہمیزی سے اردو کی محفلیں سجاتے رہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں ہندوستان، پاکستان، چین، دبئی اور امریکہ میں مقیم اردو دوست اور شاعروں کا ایک قافلہ ہیوسٹن، نیوجرسی اور ڈیلاس میں اردو کی شمع روشن کی۔ اس موقعے پر ہندوستان سے شبنم صدیقی نئی دہلی، منظر بھوپالی، ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی، چین سے شکوژان (انتخاب عالم)، دبئی سے ڈاکٹر زبیر فاروق، ڈیلاس سے نورامروہوی، پاکستان سے سلمان گیلانی، عبداللہ شیخ واشنگٹن، فرحت شہزاد یوایس اے کے علاوہ کئی شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ پہلا پروگرام ہوسٹن میں بیوٹی آف ہیومنیٹی کے زیراہتمام ایشیا بال روم بیچٹ ہوسٹن میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام کا انعقاد بیوٹی آف ہیومنٹی کے صدر مسٹر فیاض رامپوری اور ان کے احباب کی مشترکہ کوششوں سے ہوا۔ اس پروگرام میں ہوسٹن کی اردو برادری جو ہند و پاک کے علاوہ مختلف ممالک کے اردو دوست احباب پر مشتمل تھی، بڑی تعداد میں موجود تھی۔ دوسرا پروگرام ڈیلاس کے لاس لوماس ارون بینکوٹ ہال میں منعقد ہوا یہ پروگرام 21 مئی کو منعقد ہوا۔ اس کے فاؤنڈر صدر نورامروہوی نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ اس مشاعرے کی صدارت یونس اعجاز نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر امیر سلمان، اس پروگرام کا انعقاد النور انٹرنیشنل اور پیس اینڈ یونیٹی کے زیراہتمام ہوا تھا۔ ڈیلاس کے اس پروگرام میں شرکت کرنے والوں کی اردو سے محبت قابل دید تھی۔ وہ اتنی مصروف زندگی کے باوجود اردو کے لیے وقت نکال لیتے ہیں یہ بڑی بات ہے۔ اس سفر کا تیسرا پروگرام محبان اردو تنظیم کے زیراہتمام نیوجرسی کے ڈبل ٹری بائی ہلٹن فورٹ لی میں منعقد ہوا۔ اس تنظیم کے سرپرست متین خطیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تنظیم کے ساتھ شاہین خطیب اور متین خطیب نے اپنا تعاون دیا۔ اس پروگرام میں عبداللہ شیخ واشنگٹن، فرحت شہزاد یو ایس اے اور نورامروہوی کے علاوہ بقیہ یہی حضرات تھے۔ اس پورے سفر میں مذکورہ بالا شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2016

اردو صحافت آج اور کل

شکاگو: اردو انسٹی ٹیوٹ یوایس اے کے زیراہتمام 14 مئی کو ہالی ڈے ان میں ایک محفل مذاکرہ اور شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرہ کے مہمان خصوصی شکاگو میں بھارت کے قونصل جنرل اوصاف مہمان خصوصی تھے جبکہ بھارت کے اخبار سیاست کے مدیر اور پبلشر زاہد علی خان کے علاوہ مقررین میں عابداللہ غازی، افتخار شریف، پاکستان نیوز کے بیورو چیف رانا جاوید، اردو ٹائمز کے طارق خواجہ اور دیگر شامل تھے۔ تقریب کی نظامت اردو انسٹی ٹیوٹ کے روح رواں امین حیدر نے کی۔ مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے رانا جاوید نے اردو صحافت کی اہمیت اور کردار پر روشنی ڈالی اور واضح کیا کہ اردو صحافت محض برصغیر یا جنوبی ایشیا تک محدود نہیں بلکہ اس کے قارئین و ناظرین کا دائرہ دنیا بھر میں اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سننے کروڑوں افراد تک پھیلا ہوا ہے۔ رانا جاوید نے پاکستان نیوز کی مثبت پالیسیوں کے حوالے سے کہا کہ ہماری کوشش اور واضح پالیسی یہی ہے کہ ہم دیار غیر میں رہنے والے اپنے قارئین تک بلا فریق معاشی، سیاسی وادبی حقائق پہنچائیں اور انھیں غیر جانبداری کے ساتھ مکمل آگہی دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر صحافت میں غرض، جانبداری، غلط بیانی اور منافرت شامل ہوجائے تو وہ غلاظت بن جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان نیوز اپنی اس پالیسی پر ہمیشہ عمل پیرا کہ لوگوں کو صحیح اور غیر جانب داری سے حالات و واقعات سے آگاہ کرتے رہیں۔ اردو ٹائمز کے طارق خواجہ نے شمالی امریکہ

میں اردو صحافت کے ارتقا اور اس میں حائل کوششوں اور مشکلات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ کمیونٹی رہنما افتخار شریف اور اقراء انٹرنیشنل کے عابداللہ غازی نے اردو زبان کی اہمیت، تاریخی حوالوں اور نئی نسل کو زبان کی آگاہی پر زور دیا تاکہ اردو زبان کا مستقبل تابناک ہو سکے۔ بھارت سے آئے ہوئے نامور صحافی روزنامہ سیاست کے مدیر زاہد علی خان نے روزنامہ سیاست کے اجرا سے لے کر موجود دور میں بطور اردو اخبار بھارت میں اس کی افادیت، اثرات اور اردو زبان کے فروغ کے کردار پر گفتگو کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان وصحافت کے تحفظ وفروغ کے ہمیں شاعری کے حدود سے باہر نکل کر تعمیری اور اصلاحی تخلیقات پر توجہ دیا جانا ضروری ہے تاکہ آنے والے ادوار میں اردو کی اہمیت برقرار رہے۔ مہمان خصوصی اوصاف سعید نے برصغیر میں اردو زبان و تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا اور اس موقف کا اظہار کیا کہ اردو زبان وصحافت کا مستقبل نئی نسل میں اردو زبان سے محبت اور دلچسپی اجاگر کرنے میں پوشیدہ ہے۔

روزنامہ 'ڈیلی نیوز پاکستان'، 15 مئی 2016

اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ میں حمزہ یوسف نے اردو میں حلف لیا

لندن: اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ میں دوسری بار منتخب ہونے والے پاکستان نژاد رکن حمزہ یوسف نے رکن پارلیمنٹ کا حلف اردو میں لیا ہے۔ اسکاٹش نیشنل پارٹی سے تعلق رکھنے والے 31 سالہ حمزہ یوسف دوسری بار گلاسگو سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئے ہیں اور اسکاٹ لینڈ کی گذشتہ حکومت میں یوروپ اور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ انھیں اسکاٹش کابینہ میں پہلے مسلمان وزیر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حمزہ کی والدہ کینیا سے تھیں جب کہ ان کے والد کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر میاں چنوں سے ہے۔ حمزہ یوسف کا کہنا تھا کہ وہ اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ انگریزی ان کی پہلی زبان ہے لیکن انھوں نے حلف دونوں زبانوں میں اس لیے لیا کیونکہ وہ اپنی ثقافت کو بھولنا نہیں چاہتے۔ اس بارے میں حمزہ یوسف کا کہنا تھا کہ اسکاٹش پارلیمنٹ میں آپ کسی بھی 2 زبانوں میں حلف لے سکتے ہیں اور اسی لیے میں نے اردو زبان میں حلف اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ ایک بین الثقافتی ملک ہے اور ہم دوسرے مذاہب اور ثقافتوں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف یہ دیکھیں کہ میرے اردو میں حلف اٹھانے پر کسی رکن پارلیمنٹ نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اسے سراہا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2016

بزم اردو قطر کی شعری نشست

دوحہ: اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر (قائم شدہ 1959) کے زیر اہتمام، ہندوستان سے تشریف لائے مہمان شعرائے کرام محترم نعمان شوق اور محترم ایم آر چشتی کے اعزاز میں حسب روایت کامیاب اعزازی نشست کا انعقاد دوحہ کے ماز اایسٹوریٹ میں ہوا۔ مہمان شاعر کے علاوہ قطر کے چند چنیدہ شعرا اراکین بزم اور سخن فہم سامعین نے شرکت کی۔ نعمان شوق اور ایم آر چشتی انڈین ایسوسی ایشن آف بہار اینڈ جھارکھنڈ (IABJ) کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے عالمی مشاعرے میں شرکت کے لیے دوحہ تشریف لائے تھے۔ IABJ نے نعمان شوق کو شاد عظیم آبادی ایوارڈ اور ایم آر چشتی کو رام دھاری سنگھ دنکر ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا ہے۔ نشست کا باقاعدہ آغاز زبیر علوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نشست کی صدارت، مجلس فروغ اردو ادب کے صدر اور معروف ومعتبر شاعر فرتاش سید نے فرمائی بزم اردو قطر کے صر شاد اکولوی نے مہمان کا استقبال کیا اور بزم کا مختصر تعارف پیش کیا۔

بزم کے سینئر سرپرست سید عبدالحی اور انڈو وقطر اردو مرکز (دوحہ دہلی) کے بانی صدر محمد سلیمان دہلوی کے دست مبارک سے بزم اردو قطر کی جانب سے تحائف پیش کیے گئے۔ مشاعرہ کی نظامت، بزم اردو قطر کے چیئرمین ومعروف ادیب وتنقید نگار ڈاکٹر فیصل حنیف نے فرمائی۔ نعمان شوق نشست میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ نعمان شوق عالمی شہرت کے حامل خوش اسلوب سنجیدہ شاعر ہیں۔ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے نشست کے ادبی معیار کو دوبالا کرنے کے لیے ایم آر چشتی جلوہ افروز ہوئے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 16 مئی 2016

دمام میں تیسرے عالمی جشن مزاح کا انعقاد

دمام: طنز ومزاح کی مشہور شخصیت سلمان خطیب کی یاد میں تیسرے عالمی جشن مزاح مشاعرہ دمام کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے ممتاز شعرائے طنز ومزاح نے حصہ لیا۔ دمام میں اردو زبان کا شوق رکھنے والی معزز شخصیات مشاعرہ کی رونق رہیں۔ اس دوران عصر حاضر میں شہنشاہ طنز ومزاح ڈاکٹر اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی نے ہندوستان کی جانب سے اس مشاعرہ میں نمائندگی کی۔ منتظمین کی جانب سے ڈاکٹر پاپولر میرٹھی کو شال اور اعزاز پیش کیا گیا۔ اس دوران ان کے دست مبارک سے کئی اہم کتابوں کی رونمائی بھی ہوئی۔ ادارہ ہدف کی جانب سے منعقدہ اس مشاعرے میں پاکستان سے انور مقصود، امریکہ سے خالد عرفان، قطر سے افتخار راغب، کویت سے محمد علی وفا وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر پاپولر میرٹھی نے اس سلسلے میں بتایا کہ یہ مشاعرہ ایک منفرد مشاعرہ تھا جس میں عالمی سطح پر طنز ومزاح کی شاعری کرنے والی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مئی 2016

کویت میں مشاعرے کا اہتمام

کویت: انڈین ایمبیسی اوڈوریم کویت میں ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام انڈین کلچرل سوسائٹی اور انڈین ایمبیسی کویت کے مشترکہ زیر اہتمام منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان سے معروف ناظم محفل ڈاکٹر منصور عثمانی مراد آبادی، تام الثر رضا مراد، عقیل نعمانی، الوک شریواستو، دپتی نول وغیرہ نے کلام پیش کیا۔ اس سلسلے میں مراد آباد کے مشہور شاعر ڈاکٹر منصور عثمانی نے اخبار کے نامہ نگار سے فون پر کی گئی اپنی گفتگو میں بتایا کہ اردو شاعری کو فروغ دینے والی یہ شام نہایت کامیاب رہی جس میں ہمارے مشاعرہ کی دنیا کے کامیاب شعرا کرام کے علاوہ فلم اداکار رضا مراد اور بیسٹ ایکٹرا اعزاز یافتہ شاعرہ دپتی نول کو بھی کویت کے سامعین نے بہت پسند کیا، موصوف نے بتایا کہ رضا مراد کی پرکشش آواز اور دپتی نول کا انداز شاعرانہ نے اہل کویت کو نہ صرف متاثر کردیا بلکہ عاشقان اردو کے دلوں پر جادو کردیا، الثر کے خصوصی انداز اور الوک شریواستو کی سادہ زبان شاعری پر بھی مداح اردو کویت نے دل کھول کر داد دی۔ اردو زبان اور ہماری تہذیب کا جو مظاہرہ سامعین محفل نے کیا وہ لائق قدر تھا اور شرکائے محفل کے ادبی شوق اور داد وتحسین کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اردو زبان بڑی تیزی کے ساتھ آج کی نئی نسل کو نہ صرف متاثر کر رہی ہے بلکہ عالمی پیمانے پر مسلسل فروغ پا رہی ہے۔ اس دوران ہندوستانی شعرائے کرام کو منتظمین کی جانب سے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔ مشاعرے کی خوب صورت نظامت اپنے منفرد انداز میں اے اے خاں نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2016

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کو اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے عوامی تعاون درکار ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں تخلیقی ادب پینل میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون، جسولہ نئی دہلی میں تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی۔ میٹنگ میں تخلیقی ادب کی اشاعت سے متعلق اہم نکات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

تخلیقی ادب پینل کے سبھی ممبران کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے گزشتہ میٹنگ اور اس کی روداد پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ قومی اردو کونسل کو اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے عوامی تعاون درکار ہے۔ میٹنگ میں سید محمد اشرف نے اردو کے فروغ کے لیے تخلیقی ادب کی اشاعت پر زور دینے کی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ ایسی کتابوں کی اشاعت کی ضرورت ہے جو عام اردو قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اس موقع پر شائستہ یوسف نے اپنے تجربے کو ممبران کے سامنے پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے بنگلور میں 'اردو کارنر' پروگرام کے تحت 10 چنندہ اسکولوں میں بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دلچسپ پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ پینل کے ممبران نے اردو کارنر پروگرام کو دہلی میں کچھ اسکولوں جیسے متھرا روڈ پر واقع ڈی پی ایس اسکول، ذاکر حسین پبلک اسکول، سردار پٹیل، اے پی جے اسکول رو ہنی میں کرانے کی تجویز پیش کی۔ جناب سلام بن رزاق اور جناب اسرار گاندھی نے مصنف سے ملاقات پروگرام کے انعقاد کا مشورہ دیا جس میں افسانہ نگار اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کریں گے۔ پروفیسر گنگا پرساد ول نے اس موقع پر سارک ممالک کی بہترین کہانیوں کے اردو ترجمے کی تجویز پر زور دیا۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ کونسل اپنے رسالے 'اردو دنیا' میں بھی تخلیقی ادب کے لیے کچھ صفحات مختص کرے گی۔

میٹنگ میں جناب رتن سنگھ، پروفیسر طارق چھتاری، سلام بن رزاق، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر گنگا پرشاد ول، محترمہ شائستہ یوسف، جناب محسن خان، اسرار گاندھی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر انور ظہیر انصاری، ڈاکٹر راشد انور راشد کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تخلیقی ادب پینل میٹنگ کا منظر

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 جون 2016

کونسل ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ پر ایک جامع کتاب ترتیب دے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں فارسی ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: یہ میٹنگ ایک ایسی زبان سے وابستہ ہے جو ہندوستان کی آٹھ سو سالہ تہذیب و ثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس زبان کے بغیر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کا مطالعہ ادھورا ہے۔ فارسی کے بغیر اردو زبان و ادب کی تفہیم اور تدریس مشکل ہے۔ اس انعقاد کونسل کی جانب سے ایک مستحسن قدم ہے اور اس اگلے چھ ماہ میں منظر عام پر آجائے تاکہ ہندوستان میں دوسری زبانوں کے پڑھنے والے کو اس کا خاطر خواہ فائدہ ہو سکے۔ اس موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ چھ ماہ کے اندر دوسری میٹنگ کا اسے تاریخ کے حساب سے، اصناف کے حساب سے، ادوار کے حساب سے، خطوں اور علاقوں کے حساب سے، شعرا اور نثر نگار کے حساب سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس بابت ہم لوگوں کو اگلے دس دنوں میں پروپوزل بنا کر کونسل کے حوالے کرنا ہے تاکہ معینہ مدت کار میں اس

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں فارسی ادب پینل میٹنگ کا منظر

کے حل کے لیے کونسل ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ ترتیب دینا چاہتی ہے۔ یہ کام بہت دنوں سے تشنہ ہے اور یہ اگلے چھ ماہ میں مکمل کر لیا جائے گا۔ اتنے کم وقفے میں فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ایک جامع اور مکمل کتاب کی ترتیب آسان کام نہیں ہے اس لحاظ سے یہ کونسل کے لیے فخر کی بات ہوگی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پینل برائے فارسی زبان و ادب کی منعقدہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ہمارا عزم ہے کہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ کے لیے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر موصوف کی طرف سے یہ تجویز کہ ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ ترتیب دی جائے یہ ایک مثالی کام ہوگا اور ہندوستان میں فارسی ادب کے تعلق سے کیا خدمات رہی اس کی روداد سامنے آجائے گی۔ اس موقع پر پینل کی ممبر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے اس پروجیکٹ کی تفصیلات پر انتہائی مؤثر انداز میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں جو فارسی ادب تخلیق ہوا ہے اس کی ایک جامع تاریخ مرتب کی جائے، عظیم کام کو مکمل کیا جا سکے۔

اس میٹنگ میں پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر وجیہ الدین، پروفیسر عمر کمال الدین، پروفیسر علیم اشرف خان، پروفیسر مظہر آصف، کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 جون 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

ڈاکٹر مصطفیٰ کریم

نئی دهلی: برطانیہ میں مقیم اردو کے ممتاز فکشن نگار ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی وفات سے صرف برطانیہ کا افسانوی افق ہی تاریک نہیں ہوا بلکہ برصغیر کے اردو فکشن کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم گو پیشے سے ڈاکٹر تھے مگر اردو زبان وادب سے ان کا بہت گہرا لگاؤ تھا۔ برصغیر کے مختلف مقتدر مجلات و رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے ناول 'طوفان کی آہٹ' کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی۔ اس تاریخی ناول کے حوالے سے مذاکرے بھی ہوئے۔ مرشدآباد بنگال کے سراج الدولہ پر مبنی اس ناول کو تمام ناقدین نے ایک اچھا تاریخی ناول قرار دیا ہے۔ اس ناول کی خاص بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم نے خود مرشدآباد جاکر تاریخی دستاویزات جمع کیے اور انھیں ناول کے قالب میں ڈھالا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مصطفیٰ کریم کی شخصیت بڑی نستعلیق تھی۔ انھوں نے اسکاربرو (یوکے) میں اردو کا چراغ جلائے رکھا تھا۔ ان کے انتقال سے برطانیہ کی ادبی فضا ہی نہیں بلکہ برصغیر کا تخلیقی موسم بھی سوگوار ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 جون 2016

ڈاکٹر اسلم فرخی

نئی دہلی: بزرگ ادیب، دانشور اور مایہ ناز خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی

رحلت سے خاکہ نگاری کے ایک روشن باب کا خاتمہ ہوگیا۔ اسلم فرخی نے خاکہ نگاری کو جو رعنائی اور توانائی عطا کی ہے وہ ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ انھوں نے 'آنگن میں ستارے'، 'رونق بزم جہاں'، 'لال سبز کبوتروں کی چھتری'، 'سات آسمان'، 'موسم بہار جیسے لوگ' اور 'گلدستۂ احباب' جیسے خاکوں کے اہم مجموعے سے خاکہ نگاری کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا اور اس صنف کی ثروت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ انھوں نے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کا ادبی خاکہ بھی 'نظام رنگ' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو بزرگوں اور اسلاف سے ان کی عقیدت کا مظہر ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اسلم فرخی کراچی کے دبستان تحقیق کا ایک اہم ستون تھے۔ 'محمد حسین آزاد حیات وتصانیف' ان کا نہایت اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے محمد حسین آزاد کی کئی کتابیں بھی مرتب کیں۔ اسی وجہ سے پاکستان میں آزاد شناس کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت تھی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسلم فرخی کا تعلق بہت ہی اہم علمی وادبی خانوادے سے تھا جسے ایں خانہ ہمہ آفتاب کہا جاسکتا ہے۔ وہ نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات تھے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ 'بچوں کے سلطان جی'، 'بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ادب اطفال میں بھی ان کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کا تعلق بھی ہندوستان کی سرزمین سے تھا۔ ان کا آبائی وطن فتح گڑھ فرخ آباد تھا مگر ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی اور اپنے وطن سے انھیں بہت محبت تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے سالانہ عرس کی تقریبات میں وہ ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ وہ وضع داری اور شرافت کا پیکر جمیل تھے۔ انھوں نے اپنی علمی اور ادبی وراثت کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں ہمیشہ فیاضی سے کام لیا۔ ان کے صاحب زادے آصف فرخی ان کی ادبی وراثت کے امین اور اردو کے مشہور نقاد ودانشور ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جون 2016

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر

دهرادون / منگلور: اردو خالص ہندوستانی زبان ہے، اس کا خمیر بھی ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اشتراک

ومیل جول سے تیار ہوا ہے، اس کی آبیاری میں ہندوستانی سماج کے تمام طبقوں، فرقوں بلا لحاظ مذہب وملت ورنگ و نسل سبھی لوگوں نے اپنا خون صرف کیا ہے، اردو کے سنوارنے اور پروان چڑھانے میں صوفیوں، سادھوؤں، سنتوں سے لے کر تمام ہندوستانیوں نے اپنا اپنا رول ادا کیا ہے، زبان سماج کے ذریعے وجود میں آتی ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اپنا سماج ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر تنویر چشتی سابق ممبر پلاننگ کمیشن نے انجمن فیضان اولیا دہرادون کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے 'اردو ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر' کے عنوان سے منعقدہ سمینار میں اپنے صدارتی خطبے کے دوران کیا۔

اس موقعے پر مقالہ نگاروں میں محترمہ غزالہ تبسم مرادآبادی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر سید اشرف حسین قادری، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کے علاوہ محترمہ ترنم پروین، معروف شاعر ضیا نہٹوری، انیر کھربندا نے مختلف جہات سے اردو کے قومی یکجہتی کے تصور کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر وزیراعلیٰ کے میڈیا انچارج سریندر کمار اگروال اور مہمان ذی وقار کے طور پر شری ڈبل سنگھ بھنڈاری نائب صدر ضلع پنچایت دہرادون نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے کنوینر محمد مستفیض نعیمی کے علاوہ انجمن کے صدر محمد اسلم انصاری اور محمد یامین کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 مئی 2016

میر ببر علی انیس کی شاعری

گیا: گیا کے ملکی کالج، جی بی روڈ گیا میں نور فلاح کی جانب سے ایک روزہ سمینار 'میر ببر علی انیس' کی شاعری پر منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح عزت مآب وزیر اقلیتی فلاح و بہبود حکومت بہار جناب ڈاکٹر عبدالغفور کے دستِ مبارک سے ہوا۔ سکریٹری نور فلاح نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا بھی شکریہ ادا کیا جس میں ان کا جزوی تعاون شامل ہے۔ سمینار کی صدارت ریٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر افصح ظفر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض دہلی سے تشریف لائے مہمان جناب بدنام نظر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر میر انیس کی مرثیہ نگاری پر مقالے جناب ڈاکٹر حسین الحق، جناب ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، جناب ڈاکٹر عین تابش اور جناب ڈاکٹر احمد صغیر نے پیش کیا۔ اس موقعے پر طرحی شعری نشست بھی کی گئی، جس میں بدنام نظر، سید عبدالمغیث، اعجاز مانپوری، نوشاد ناداں، ندیم جعفری، ظفر یتھوی، عبدالحنان صبا نے اپنا کلام پیش کیا۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر آفتاب عالم کی حالیہ تصنیف 'اردو شاعری کے ارتقا میں شعرائے گیا کا حصہ' کا رسم اجرا اقلیتی فلاح و بہبود وزیر عزت مآب ڈاکٹر عبدالغفور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس موقعے پر ظفر حسنین، ایم اے کریمی، اصغر سیفی، پردیشی کابری، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر شاہد اقبال، ڈاکٹر رضاء الدین کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ تھے۔

پریس ریلیز: منظر احسن، گیا، بہار، 19 مئی 2016

راجندر سنگھ بیدی: حیات و خدمات

اٹوا/سدھارتھ نگر: راجندر سنگھ بیدی حیات و خدمات کے موضوع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

کے تعاون سے دو روزہ قومی سمینار اور مشاعرہ کا انعقاد ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کرہی، سدھارتھ نگر کی طرف سے مدرسہ عائشہ صدیقہ للبنات اٹوا میں 29-28 مئی کو ہوا۔ سمینار کا افتتاح بزم ارباب ادب کے سکریٹری اور معروف شاعر و ادیب جمال قدسی نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ اردو ادب کے فروغ میں راجندر سنگھ بیدی کے خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طرف وہ باکمال ادیب تھے اور 'ایک چادر میلی سی' جیسے شاہکار ناولٹ کے تخلیق کار تھے تو دوسری طرف انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا بلکہ اس فن کو عروج تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر اسرار نے اپنے خطاب میں راجندر سنگھ بیدی کے تخلیقی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ بیدی نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا اور محسن لاہوری کے نام سے شاعری کی۔ کئی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ بیدی نے کشمیر شیخ عبداللہ کی پیشکش پر ریڈیو جموں کے ڈائرکٹر کا عہدہ بھی قبول کیا اور انھیں کی کوششوں کے نتیجے میں سری نگر ریڈیو اسٹیشن کی بنیاد رکھی گئی۔ فاطمہ اسکول کے منیجر نادر سلام نے کہا کہ راجندر سنگھ بیدی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب ناول نگار اور افسانہ نگار تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر اخلاق حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ادب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ کسی مذہب سے جڑا نہیں رہا بلکہ اس کے فروغ میں تمام مذاہب کے لوگوں نے حصہ لیا۔ ملت پبلک اسکول کے منیجر ماسٹر محمد اکرام نے کہا کہ ادب کا رشتہ بہت ہی عظیم ہوتا ہے اور اسی عظیم رشتے ہی کی بنیاد پر آج ہم سیالکوٹ جیسے دور دراز علاقے میں پیدا ہونے والے ادیب کا تذکرہ اٹوا میں کررہے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 جون 2016

'رگھوپتی سہائے فراق - حیات اور خدمات' پر منعقدہ سمینار کا منظر

رگھوپتی سہائے فراق - حیات اور خدمات

احمد آباد: مہاتما گاندھی کی قائم کردہ یونیورسٹی گجرات ودیاپیٹھ کیمپس میں واقع آدی واسی شودھ و پرشکشن سنستھان (سمینار ہال) احمد آباد گجرات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی اور دی اکھل بھارتیہ سماج سیوا ٹرسٹ احمد آباد کے باہمی اشتراک سے رگھوپتی سہائے فراق- حیات اور خدمات کے موضوع پر ایک قومی سمینار بتاریخ 8 مئی 2016 بروز اتوار منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی اور مقالہ نگار حضرات کی گل پوشی کے بعد انور منصوری (صدر اکھل بھارتیہ سماج سیوا ٹرسٹ) نے اپنی تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ تلاوت اور نعت خوانی کے بعد سمینار کی پہلی نشست کا آغاز زیر صدارت رشید ابہام ہوا۔ ڈاکٹر انور ظہیر انصاری (ایم ایس یونیورسٹی، بڑودہ) نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس کے بعد شری بسنت کمار پریہار، شیخ شاہ نور بانو، ڈاکٹر سنیل کمار، ڈاکٹر نسرین شیخ، مشتاق انصاری، پروفیسر محی الدین بومبے والا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں صدر نشست نے پیش کیے گئے مقالات پر تنقیدی نظر ڈالی۔

لنچ کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوا، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے مسند صدارت سنبھالی، ڈاکٹر اظہر ڈھیری والا، رشید ابہام، ڈاکٹر وجیہ الدین، اشفاق شیخ نے مقالے پڑھے۔ مقالات کی قرأت کے بعد شبیر ہاشمی (سمینار کوآرڈی نیٹر) نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی کی اردو زبان سے متعلق جاری سرگرمیوں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں صدر نشست ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے اپنی رائے پیش کی۔ سمینار کی دونوں نشستوں کی نظامت امان اللہ جرانی نے بحسن و خوبی انجام دی۔

پریس ریلیز: دی اکھل بھارتیہ سماج سیوا ٹرسٹ، احمد آباد، 19 مئی 2016

سردار جعفری فن و شخصیت

لکھنؤ: سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے نہ صرف اہم ستون بلکہ ترقی پسند تحریک کے سالاروں میں سے تھے اور ترقی پسندی کے اصولوں کے پابند تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، محقق، نقاد اور مترجم تھے لیکن ان کو مقبولیت کے بام پر ان کی شاعری نے چڑھایا۔ ان کی نظموں نے اردو شاعری کو ایک تیور اور لب و لہجہ دیا ان کی انفرادیت کا اعتراف ناقدین وقت کو بھی کرنا پڑا۔ ان کی بیشتر غزلوں میں جوش، بلند آہنگ اور تیز و تند لہجہ ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سردار جعفری غالب اقبال سے زیادہ متاثر ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کے اشتراک سے کیے گئے سیمینار 'سردار جعفری فن و شخصیت' کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر اقتدار حسین نے کیا۔ ایوارڈ کمیٹی کے سکریٹری سید اطہر نبی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ سردار جعفری کے یہاں فن اور موضوعات دونوں کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ موضوعات کا تعلق تو ان کے مخصوص نظریے سے ہوتا تھا تاہم وہ ہر گام ہر شاعری کو فنی بلندیوں تک لے جاتے رہے، ان کی شاعری کی ایک اہم جہت امیجری یا پیکر تراشی ہے۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 6 جون 2016

اکیسویں صدی میں رباعی

سنبھل: سرائے ترین واقع برکاتی انٹر کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور الائٹ ایجوکیشنل اکادمی کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان اکیسویں صدی میں رباعی منعقد کیا گیا جس میں مقالہ نگاران نے کثیر تعداد میں شامل ہو کر رباعی جیسے اہم موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ شفیق الرحمٰن شفیق برکاتی نے موضوع سے متعلق حاضرین کو متعارف کرایا۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز ڈاکٹر عابد حسین حیدر نے تعارفی کلمات پیش کر کے کیا انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں رباعی کو خصوصی مقام حاصل ہے چار مصرعوں کی اس صنف میں بے شمار شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ فراق گورکھپوری کو رباعی پر گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا یہ اردو اور رباعی کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ موجودہ دور میں رباعی جیسی سخت جان صنف زندہ ہے۔ مراد آباد سے تشریف لائے سید ہاشم اور کشمیر سینٹرل یونیورسٹی کے پروفیسر راشد عزیز نے فن رباعی پر سیر حاصل گفتگو کی۔ سابق ایم پی ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق صاحب نے کالج کے اسٹاف اور شفیق برکاتی کو اس سیمینار کے لیے مبارکباد پیش کی اور اردو زبان کی بقا و سلامتی کے سبھی کو سنجیدہ ہونے کا پیغام دیا۔ اس موقعے پر سید بابر اشرف کچھوچھوی نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام کنوینر شفیق الرحمٰن برکاتی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 جون 2016

'اردو شاعری میں جدیدیت کی سمت و رفتار' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

جنگ آزادی میں اردو کے قلم کاروں کا کردار

اوڈیشہ: مقامی ریڈ کراس کانفرنس ہال میں آزادی کے مہم میں اردو کے قلم کاروں کا کردار کے بارے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام مدنی ویمنس ویلفیئر ایسوسی ایشن ڈمڈما بھوبنیشور کی جانب سے مورخہ 7 مئی 2016 سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر سید شخاوت علی ایڈیٹر لوک وچار نے کی اور نظامت جناب شیخ عزیز الباری نے ڈائس پر جلوہ افروز شیخ قریش صاحب ایڈیٹر صدائے اڈیشہ تھے اور نقیب سیمینار شیخ کلیم الدین صاحب ہیڈ مولوی ریحھنشا گیلس ہائی اسکول نے سکینہ نشا شہید نگر، بھوبنیشور کو دعوت سخن دی موصوف علامہ اقبال کے کلام ترانہ ہند 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سے اپنا کلام شروع کیا۔

اس موقعے پر اڈیشہ کے کم و بیش 10 ضلعوں سے اردو کے شیدائی اور اہل ذوق حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی جن میں شیخ برکت اللہ، جناب جعفر دانش، جناب مصطفیٰ گوہر، جناب مولانا مطیع اللہ نازش، جناب سخاوت اللہ، جناب مولانا سید اقبال رضوی، جناب مولانا اختر رضا عارفی، جناب مولانا شیخ عبدالحق قاسمی، جناب مولانا شیخ نواب علی، جناب مولانا مفتی فیض الباری، جناب حافظ شفیع الرحمٰن، جناب مولانا شہاب جاوید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سید شخاوت علی نے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو کے قلم کاروں کا کردار کے موضوع پر اڈیشہ جیسی ریاست میں سیمینار کے منعقد کیے جانے پر ہم کونسل کے ممنون ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے جانب سے چلائے جا رہے ڈپلوما کمپیوٹر اور اردو زبان میں ڈپلوما کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو جناب ڈاکٹر سید شخاوت علی نے اپنے ہاتھوں سے سندیں تقسیم کیں۔ اس سیمینار کا اختتام جناب عزیز الباری کے اظہار تشکر پر ہوا۔

پریس ریلیز: معاذیہ خاتون، صدر، مدنی وومین ویلفیئر ایسوسی ایشن، ڈمڈما، بھوبنیشور، 25 مئی 2016

'اردو شاعری میں جدیدیت کی سمت و رفتار'

بھدرک اڈیشہ: اردو زبان و ادب کی ہزار سالہ تاریخ میں درجنوں تحریکات و رجحانات کا ظہور ہوا۔ اظہار کی رنگا رنگی، حیات و کائنات کی مختلف تعبیر و تشریح اور نت نئے امکانات تک رسائی کی جہتوں کا سراغ انھیں تحریکوں اور میلانوں کا مرہون منت ہے۔ ان خیالات کا اظہار اڈیشہ اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم نے بھدرک اڈیشہ میں رضوانی ویلفیئر ایسوسی ایشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'اردو شاعری میں جدیدیت کی سمت و رفتار' کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی سیشن میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کیا۔ افتتاحی سیشن میں ملک بھر سے تشریف لائے مندوبین کا استقبال اور تعارف پیش کرتے ہوئے نیشنل سیمینار منتظمہ کمیٹی کے چیئرمین اور رضوانی ویلفیئر ایسوسی ایشن کے سکریٹری پروفیسر محمد عبدالنبی نے کہا کہ آج میری زندگی کا ایک نہایت خوشگوار لمحہ ہے کہ اس چھوٹے سے شہر میں مجھے اس قدر شاندار قومی سیمینار منعقد کرنے کی توفیق ملی جس میں حیدرآباد سے لے کر دہلی تک اردو کی نئی نسل کے اسکالرز تشریف لائے اور ان تمام مندوبین کے پیشگی ارسال کردہ مقالوں کے مطالعے سے مجھے خوشی ہوئی کہ تمام ہی مقالے نہایت پر مغز اور اعلیٰ معیار کے ہیں۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مبشر نے صدارتی خطاب میں کہا کہ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ پروفیسر محمد عبدالنبی صاحب نے جس سلیقے سے اس سیمینار کا انعقاد کیا ہے وہ بغیر خلوص، اردو دوستی، دیانت داری، جنون اور دلسوزی کے ممکن نہیں۔ ڈاکٹر انوار الحق نے اپنے انگریزی ناول کا اڑیا ترجمہ 'پتھا بھوورا' اڈیشہ اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم اور سیمینار کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر محمد عبدالنبی کو ہدیہ کیا۔ اس دو روزہ قومی سیمینار میں کل تیرہ مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 مئی 2016

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

خبر نامہ

قومی :

فکشن کی تنقید

حیدرآباد: شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے 'فکشن کی تنقید' کے موضوع پر خصوصی خطبہ دیا جس میں انھوں نے فکشن کی تنقید کے طریق کار پر منظم اور مدلل انداز میں سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے ناول کی تنقید کے ابتدائی انداز کو

سرسری اور ناکافی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ انسان جب سے دنیا میں آیا ہے واقعہ یا قصہ کہہ رہا ہے تو کیا کہہ رہا ہے؟ کس کو سنا رہا ہے؟ کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا ہے؟ ہم نے کیا اسے سنا۔ یہ چیز واضح نہیں۔ بس روایت چلی آرہی ہے۔ واقعیت ہے کیا؟ پوری واقعیت کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ ناول نگار یا افسانہ نگار نے اسے جس طرح سے دیکھا ہے وہی دکھاتا ہے۔ اسی لیے واقعیت یا حقیقت نگاری کے بجائے نقطۂ نظر اہم ہے۔ فکشن نگار کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ اصل ہے۔ یہ کوئی بری چیز نہیں مگر نقطۂ نظر کے پس منظر میں واقعیت اور حقیقت نگاری کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اسکالر و نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے خصوصی خطبہ بعنوان 'اردو فکشن کی تنقید' میں کیا جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز وائس چانسلر نے صدارت کی۔ دوران خطاب جناب فاروقی نے کہا کہ پریم چند اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ جب تک کسی واقعہ میں سبق آموزی یا نفسیاتی پہلو نہیں دیکھتا افسانہ ہرگز نہیں لکھتا۔ یعنی افسانہ نگار کا پہلا کام یہ ہے کہ سبق سکھایا جائے تو سوال یہ ہے کہ کون سا سبق سکھایا جائے۔ 1936 کے بعد ایک خاص نظریہ ہی سبق آموزی تھا۔ ہونا یہ چاہیے کہ ادب اور مقصد کا توازن برقرار رہے۔ مقصد کو ادب پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ فکشن کی تنقید کرتے ہوئے ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ افسانہ نگار اور ناول نگار کے نقطۂ نظر کو بیان کرے۔ یہ بات اہم ہے کہ داستان نگار کا کوئی نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ لیکن ناول نگار یا افسانہ نگار نے نقطۂ نظر کی آڑ میں کن تعصبات کو برتا ہے اسے دیکھنا نقاد کا کام ہے۔ فکشن کی تنقید میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کرداروں کا جائزہ لیا جائے کہ وہ کیسے ہیں کن کن واقعات کی بنا پر اور کن صورت حال اور حالات میں کرداروں نے بات کی ہے۔ وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے جلسے کی صدارت کی اور اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی میری دعوت پر تشریف لائے مجھے اس چیز کا احساس ہے کہ ہمارے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے وژن اور پروجیکٹ پر صلاح ومشورہ کے لیے فاروقی صاحب سے بہتر کوئی شخص نہیں ہوسکتا۔ اس اجلاس میں شریک ہوکر مجھے فکشن اور تنقید کو سمجھنے کا موقع ملا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شمس الرحمٰن صاحب کا یہ کمال ہے کہ خشک موضوع کو انھوں نے اپنے تبحر علمی سے پانی کردیا اور طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بس ہم ان کو سنتے ہی رہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خطاب سے پہلے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوالکلام نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ جبکہ نظامت کے فرائض شعبہ اردو کی استاد ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 18 مئی 2016

راجندر سنگھ بیدی صدی تقاریب

حیدرآباد: اردو کے ممتاز اور منفرد فکشن رائٹر راجندر سنگھ بیدی صدی تقاریب کے سلسلے میں ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ سمینار کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ایس اے شکور ڈائریکٹر سکریٹری تلنگانہ اسیٹ اردو اکادمی نے کہا کہ سارے ملک میں حیدرآباد اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں ایک طرف تلنگانہ میں 2.24 لاکھ بچے اردو میں تعلیم حاصل کررہے ہیں وہیں یہاں اردو کے 1582 مدارس، 82 کالجوں کے علاوہ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم و تدریس ہوتی ہے۔

اردو کے بڑے اخبارات یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ اردو کے چینل ہیں، اردو یونیورسٹی بھی یہیں پر قائم ہے۔ حیدرآباد میں ہر روز اردو کی کوئی نہ کوئی محفل ادبی اجلاس اور مشاعروں کا اہتمام ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تلنگانہ کے وزیر اعلیٰ چندر شیکھر راؤ کو جو خود بھی اردو داں ہیں، اردو زبان اور تہذیب اور اس کے فروغ سے گہری دلچسپی ہے۔ تلنگانہ میں اردو اکادمی کا بجٹ 23 کروڑ روپے ہے اور نائب وزیر اعلیٰ جناب محمد محمود علی نے اس بجٹ کو بڑھا کر ایک سو کروڑ روپے کروانے کا وعدہ کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی صدی سمینار کانفرنس ہال ہوٹل گرانڈ پلازا، ناپملی میں منعقد ہوا تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی جبکہ اس میں پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر مولا بخش اور ڈاکٹر فیروز عالم نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد قادری نے کی، اس اجلاس میں جناب نظام صدیقی، جناب شمیم طارق اور جناب رحمٰن عباس نے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع نے کی، انھوں نے کہا کہ اب تک جو مقالے پیش کیے گئے ان میں بیدی کے فن اور حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن بیدی پر ابھی بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وسیم بیگم، ڈاکٹر حبیب نثار اور فیاض رفعت نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اکادمی 24 زبانوں میں کام کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ اکادمی 24 زبانوں میں کام کرتی ہے لیکن سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب 'ترجمان القرآن' فروخت ہوتی ہے۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ سمینار میں ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں، شاعروں اور محبان اردو کی بڑی تعداد

شریک تھی جن میں فکشن نگار رتن سنگھ، ممتاز افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس، نظام صدیقی، شمیم طارق، موسیٰ رضا، ڈاکٹر مصطفی کمال، سید شاہ نور الحق قادری، ایس کے افضل الدین، رؤف خیر، محسن جلگانوی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 مئی 2016

اردو صحافت، نئی چنوتیاں، نئے افق

ممبئی (چرچ گیٹ): ہندوستان کی تحریک آزادی کا اردو

صحافت کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اردو صحافت نے مظلوموں کی آواز اٹھانے میں ہمیشہ پیش قدمی کی ہے اور آج بھی اردو صحافت ہے جو کارپوریٹ سے نہیں صحافیوں سے وابستہ ہے۔ چرچ گیٹ میں واقع انڈین مرچنٹس چیمبر میں ہندوستانی پرچار سبھا کے زیر اہتمام اردو صحافت کے 2 سو سال مکمل ہونے پر 'اردو صحافت، نئی چنوتیاں، نئے افق' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار میں پروفیسر اختر الواسع نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اختر الواسع نے اردو زبان اور اردو صحافت کا وسیع احاطہ کیا اور کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر زبان میں اردو کا عکس نظر آتا ہے۔ قبل ازیں ہندوستانی پرچار سبھا کی جانب سے اردو صحافت کے دو سو سال پر منعقدہ سیمینار کے پہلے دن کا افتتاح صبح 11 بجے کیا گیا۔ پہلے سیشن میں فیروز پیچ (اعزازی سیکریٹری ہندوستانی پرچار سبھا) نے سامعین کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سرفراز آرزو (مدیر روزنامہ ہندوستان) نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو صحافت کئی مسائل سے دوچار ہے ان کے حل کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کا تاریخی کردار اور قائدانہ رول رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ پوری ملت اردو اخبار کی ترقی اور ان کو توانا بنانے کے لیے آگے آئے کیونکہ ہمارے پاس چند ہی اردو اخبار ہیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ظہیر قاضی (صدر انجمن اسلام) نے اپنا خطبہ پیش کیا ستیش شاہ (ہندوستانی پرچار سبھا) نے صدارتی خطبہ پیش کیا، نظامت سنجیو نگم (پروگرام کنوینر، ہندوستانی پرچار سبھا) نے کی جبکہ اروند دیگیکر (اعزازی خازن، ہندوستانی پرچار سبھا) نے رسم شکریہ ادا کی۔ دوپہر کھانے کے بعد پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں 'اردو صحافت، تاریخی پہلو' کے عنوان سے دوسرے سیشن کا آغاز ہوا۔ 'اردو صحافت کی موجودہ صورت حال' پر صحافی جاوید جمال الدین، اطہر عزیز اور ریحان انصاری نے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے مختصر میں صدارتی خطبہ پیش کیا جبکہ عبدالسلام عاصم (اردو یو این آئی) نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2016

عربی تدریس و ترجمے کے مناہج

بھوپال: شعبہ عربی برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال نے آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس اور دارالعلوم تاج المساجد بھوپال ایک سہ روزہ کانفرنس

بعنوان 'عربی تدریس و ترجمے کے مناہج' 29-27 مئی 2016 منعقد کی۔ افتتاحی اجلاس زیر صدارت ایچ ایس ترپاٹھی رجسٹرار برکت اللہ یونیورسٹی نے کی، شعبہ کی استاد پروفیسر عائشہ رئیس نے موضوع کا تعارف پیش کیا۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد حسان خاں نے استقبالیہ کلمات میں ریاست بھوپال کی عربی زبان وادب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سرزمین نے نامور علماء و فضلا پیدا کیے۔ پروفیسر محمد نعمان خاں صدر آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس نے اپنے افتتاحی خطاب میں عرب و ہند کے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی کا بالخصوص تذکرہ کیا۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر حسنین اختر نے تین سالہ رپورٹ پیش کی اور اس دوران ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔ افتتاحی اجلاس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر حبیب اللہ خاں نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں دور حاضر میں عربی زبان وادب کی تدریس کے درپیش مسائل پر گفتگو کی اور عربی کے جزوقتی پروفیشنل کورسز شروع کرنے پر زور دیا تاکہ نوجوانوں کو عرب ممالک میں روزگار کے مواقع فراہم ہوسکیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دو اجلاس منعقد کیے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے انجام دی اور نظامت کے فرائض اسلام الدین نے انجام دیے، اس اجلاس میں ڈاکٹر فوزان احمد، ڈاکٹر قطب الدین، ڈاکٹر رضوان الحق، سجاد احمد، وحید احمد قاسمی نے اپنے مقالات پڑھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عائشہ رئیس نے اور نظامت محمد فرید نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر سعید بن مخاشن، ڈاکٹر سعید الرحمٰن، نگینہ اختر، امتیاز وانی نے مقالات پڑھے۔ سیمینار کے آخری دن دو اجلاس منعقد کے گئے جس میں محمد فرید، خالدہ صدیقی، امتیاز احمد اور پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت احسن علی خاں ندوی نائب مہتمم دارالعلوم تاج المساجد نے انجام دی اور نظامت ڈاکٹر قطب الدین نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت مولانا محمد سعید مجددی اور پروفیسر محمد حسان خان نے مشترکہ طور پر کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر فوزان احمد نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر عرفات ظفر، ڈاکٹر سعید بن مخاشن اور ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری ڈاکٹر حسنین اختر نے تجاویز پیش کیں جن میں حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ یوپی ایس سی کے امتحانات میں عربی کو دوبارہ بحال کرے نیز سرکار کے اس فیصلے پر عمل درآمد کیا جائے کہ جس کی رو

سے ہر سال تین عربی اسکالرس کو صدر جمہوریہ انعامات سے نوازا جاتا ہے، قابل ذکر ہے کہ گذشتہ دو سالوں سے صرف دو اسکالرس ہی کو یہ انعام دیا جارہا ہے۔ پروفیسر عائشہ رئیس کے کلمات تشکر کے ساتھ یہ کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2016

اردو زبان سے مزین فون کا آغاز

نئی دہلی: لاوا انٹرنیشنل لمیٹڈ نے آج PearKKT کی شروعات کا اعلان کیا، جو کہ ایسا واحد فیچر فون ہے جو ہندوستانی فیچر فون بازار میں اردو زبان کی معاونت کرتا ہے۔ یہ ڈیوائس، جس نے خاص طور پر اردو زبان بولنے والی برادری کو اپنا ہدف بنایا ہے، تقابلی طور پر اس کی قیمت 1500 روپے ہے اور وہ طاقتور بیٹری اور GPRS کے ساتھ انٹرنیٹ کی سہولت سے مزین ہے۔ اس ڈیوائس کے ذریعے استعمال کنندگان اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی بات چیت کرسکیں گے۔ اس کی شروعات پر تبصرہ کرتے ہوئے، مسٹر گورو نیگم، ہیڈ پراڈکٹ، لاوا انٹرنیشنل نے کہا کہ ''ہمیں Pear KKT شروع کرنے پر بے حد خوشی ہورہی ہے، جو کہ ایسی ڈیوائس ہے جو زبان کی رکاوٹوں سے پیدا ہونے والی مواصلات کی کھائی کو پر کرکے لوگوں کو طاقت ور بنانے کے لاوا کے مہم کی معاونت کرتی ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک جس میں متنوع ثقافتیں پائی جاتی ہیں اور ہم ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرکے ڈیجیٹل تقسیم کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں خود ان کی اپنی زبان میں بات چیت کرنے کے لائق بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے حالیہ Union+UltraKKT فون لانچ کیا تھا جو 22 ہندوستانی زبانوں کی معاونت کرتا ہے، اور Pearl KKT اس سمت میں اگلا قدم ہے۔ اس سے ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک کی ایک اہم برادری کو اس لائق بنا رہے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی زبان میں بات چیت کریں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 18 مئی 2016

1947 کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

دہلی :

1947 کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فارسی و اردو کے ممتاز نقاد، محقق، دانشور اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق چیئرمین پروفیسر نذیر احمد کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں 2 روزہ سمینار بعنوان '1947 کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد' کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارے کے استحکام میں جہاں تمام اکابرین کا اہم رول ہے، وہیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد کو مستحکم اور فروغ دینے میں پروفیسر نذیر احمد کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ خانۂ فرنگ، جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی کے کلچرل کونسل ڈاکٹر علی دہگائی نے صدارتی خطبے میں ہند وایران کے تہذیبی، ثقافتی اور ادبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اسے قدیم قرار دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر نذیر احمد ایک جید عالم تھے جن سے بڑا حافظ شناس کوئی نہیں تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ پروفیسر نذیر احمد صرف میرے ہی نہیں بلکہ کئی نسلوں کے استاذ تھے۔ فارسی و اردو کی علمی دنیا کا ان کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فارسی کے اہم دانشور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ نذیر صاحب نے 4-3 فرہنگیں بھی لکھی ہیں، ان کا یہ کام ناقابل فراموش اور ادب کے سرمائے میں بڑا اضافہ ہے۔ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر جو اس جلسے میں مہمان اعزازی کے طور پر موجود تھے، انھوں نے کہا کہ میں غالب انسٹی ٹیوٹ سے درخواست کروں گا کہ وہ فارسی کے اساتذہ اور علما کا سوانحی خاکہ مرتب کریں تاکہ ان کی یادیں تازہ رہ سکیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔ افتتاحی اجلاس کے اختتام پر پروفیسر نذیر احمد کی صاحب زادی اور دہلی یونیورسٹی، شعبۂ فارسی کی سابق صدر پروفیسر ریحانہ خاتون نے تمام حضرات کا اظہار تشکر ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سمینار کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر آذرمیدخت صفوی، پروفیسر قمر غفار اور پروفیسر علیم اشرف نے کی جبکہ نظامت شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر اکبر علی شاہ نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈاکٹر جمشید خان، اور ڈاکٹر قمر عالم نے اپنے مقالوں میں پروفیسر نذیر احمد اور سمینار کے موضوع کے تعلق سے علمی گفتگو پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2016

رقعات وکلام غالب کی روشنی میں 1857

نئی دہلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام شعبہ کی لائبریری میں ایک توسیعی خطبہ بعنوان '1857: رقعات و کلام غالب کی روشنی میں، ایک تاریخی تجزیہ' منعقد کیا گیا۔ پرگرام کا آغاز یاسر عباس غازی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اس پروگرام کے مقرر خاص پروفیسر عزیز الدین حسین، شعبہ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے اور مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شمع زیدی، ایڈیٹر 'بیسویں صدی' نے شرکت کی۔ جبکہ صدارت کے فرائض صدر شعبہ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے انجام دیے۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ 11 مئی 2016 کو تحریک آزادی کے 159 سال مکمل ہورہے ہیں۔ 1857 کی لڑائی ہماری آزادی کی پہلی لڑائی ہے۔ اس کا زیادہ تر مواد فارسی اور اردو میں ہے۔ جونیشنل آرکائیوز آف انڈیا، یوپی اسٹیٹ آرکائیوز لکھنؤ وغیرہ میں موجود ہیں۔ مرزا غالب اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے ان کے رقعات اور کلام میں 1857 سے متعلق بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ شمع زیدی نے کہا کہ ابھی 1857 کے بہت سے راز ظاہر ہونا باقی ہیں جو فارسی اور اردو زبان کے ادب میں پنہاں ہیں۔

پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ 1857 کہنے کو تو انگریزوں کی فتح کا سال ہے لیکن حقیقت میں یہ جنگ ہندوستانی آزادی کے متوالوں اور ہندوستانی انگریزوں کے غلاموں کے درمیان ہوئی

'معاصر ہندی، اردو اور عربی ادب' کے موضوع پر منعقدہ ریفریشر کورس کا منظر

تھی۔ جو ریجہ بلھ گڑھ جیسے آزادی کے فارسی خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آخر میں پروفیسر عبدالحلیم نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں کثیر تعداد میں اسکالرس اور طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 مئی 2016

معاصر ہندی، اردو اور عربی ادب

نئی دہلی: یو جی سی ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 30 مئی سے 18 جون تک 'معاصر ہندی، اردو اور عربی ادب' کے موضوع پر 21 روزہ ریفریشر کورس کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں دہلی، اتر پردیش، مہاراشٹر، ہریانہ، اتراکھنڈ، بہار، مدھیہ پردیش کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے 46 اساتذہ شرکت کررہے ہیں۔ اس ریفریشر کورس کا افتتاحی اجلاس ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یلو ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممتاز اسکالر اشوک واجپئی نے شرکت کی۔ اپنے افتتاحی خطبے میں اشوک واجپئی نے کہا کہ زبان انسانی تہذیب وتمدن کی بقا کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ ہر زبان میں اس کا اپنا عالمی نظریہ ہوتا ہے۔ انسان کی پہلی اور آخری پناہ گاہ زبان ہے۔ زبان نے اس دنیا کو 'سنسار' میں بدلا۔ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں زبان کی فکری تاریخ طویل اور اٹوٹ رہی ہے۔ زبان کو ہم مذہب سے جوڑنے کے اس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ اس قدیم تہذیب کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ہر زبان میں کچھ ممکنات اور کچھ ناممکنات ہوتے ہیں۔ ہمیں سبھی زبانوں کا احترام کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کا ہندی زبان سے صدیوں سے گہرا رشتہ ہے۔ زبانوں کا کام ایک دوسرے سے جوڑنے کا ہے۔ زبانوں کے عجیب وغریب رشتے ہیں۔ تکثیریت کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

پروفیسر حنفی نے مزید کہا کہ زبانوں کا رشتہ اور گہرا ہونا چاہیے۔ اردو کے اسکالر معلوم نہیں ہندی سے کیوں دور ہیں۔ یہ دوری ختم ہونی چاہیے۔ اس موقعے پر ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر کے ڈائریکٹر پروفیسر انیس الرحمن نے سبھی شرکا اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ جبکہ جلسے کی نظامت اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر عذرا خورشید نے ادا کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 31 مئی 2016

اردو کے فروغ میں فلم ریڈیو ٹیلی ویژن اور ڈرامے کی خدمات

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام کل ہند سہ روزہ سمینار بہ عنوان 'اردو کے فروغ میں فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ڈرامے کی خدمات' کا افتتاح قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں ہوا جس کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کیا جبکہ مہمانِ خصوصی کے طور پر سید شاہد مہدی، سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شرکت کی۔ جلسے کی نظامت شعیب رضا فاطمی نے کی۔ اس موقعے پر کل ہند مشاعرہ کا بھی انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں وائس چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے مہمانِ خصوصی سید شاہد مہدی کی خدمت میں پھولوں کا گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا جبکہ ممبر گورننگ کونسل خالد سیفی نے صدرِ مجلس پرفیسر عبدالحق کی خدمت میں گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ یہ سمینار کاغذ اور قلم کے علاوہ اطلاعات کے تمام ذرائع پر محیط ہے، یقیناً اس زمرے میں داستان کو بھی شامل کیا جانا چاہیے انھوں نے داستان، ڈراما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سمیت تمام ذرائع ابلاغ کے وسائل پر بھرپور گفتگو کی۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر شاہد مہدی کی نشاندہی پر یہ اعلان کیا کہ بہت جلد ہم آرزو لکھنوی پر ایک مونوگراف کا پروجیکٹ بنا کر کسی ادیب سے اسے مکمل کرنے کی گزارش کریں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مئی 2016

حنیف ترین کے شعری مجموعے پر مذاکرہ

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شامِ شہریاراں کے موقعے پر معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری مجموعہ 'لالۂ صحرائی' پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع موجود تھے۔ مقررین میں پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر شعیب رضا خاں، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر نبیل عارفی اور ڈاکٹر شہلا نواب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا میرے لیے یہ دن خاص طور سے بہت اہمیت کا حامل ہے میں ڈاکٹر حنیف ترین کو کافی عرصے سے جانتا ہوں انھوں نے مشرق وسطیٰ اور سعودی عرب کے ہنگامی حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی شاعری میں اسے بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سماجی تقاضوں کو بھی اپنی تخلیقات میں اہم جگہ دیتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ اُن کے اس مجموعہ کو علمی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے اس موقعے پر کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین سے میرے مراسم ایک طویل عرصے سے ہیں اور میں ان کی شاعری کا ہمیشہ سے شیدائی رہا ہوں۔ جب ان کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا اُس وقت بھی میں نے اُن کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ ان کے کلام میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کا تیور ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنے تمام شعری مجموعوں میں کیا ہے۔ پروفیسر توقیر احمد خاں نے فرمایا کہ حنیف ترین نے ہمیشہ اپنی ضمیر کی آواز پر شاعری کی ہے جو کچھ دیکھا اس کو شعری کینوس پر ڈھالا۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ ان کے اس شعری مجموعے کا عنوان 'لالۂ صحرائی' ہی قارئین کو غور وفکر کرنے پر مجبور کرتا ہے جنھوں نے ڈاکٹر حنیف ترین کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ وہ نہایت ہی مخلص انسان ہیں اور انسان دوستی ومحبت کا حسین عنصر ان کی زندگی میں شامل ہے اور ان ہی تمام چیزوں کو وہ اپنی شاعری میں بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے حنیف ترین سے اپنے پرانے روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظمیں مجھے ہمیشہ پسند رہی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں ہمیشہ کچھ ایسی باتیں پیش کرتے ہیں جو

قارئین کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں زیادہ تر سماج کو پیغام دیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر شعیب رضا خاں، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر شہلا نواب اور ڈاکٹر سنبل عارفی نے بھی اظہار خیال کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے جلسے کی ابتدا میں اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین پیشہ سے تو ڈاکٹر ہیں مگر شاعری انھیں وراثت میں ملی۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 3 جون 2016

فخر الدین علی احمد کی یاد میں میموریل لیکچر

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں سابق صدر جمہوریہ ہند اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے بانی فخر الدین علی احمد کی یاد

میں میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ تصوف اور سماج کے موضوع پر اپنا توسیعی خطبہ دیتے ہوئے پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے کہا کہ تصوف کی مزید تفہیم کے لیے میں نے اس موضوع پر تقریر کے لیے خود کو تیار کیا ہے۔ مذاہب اور روحانیت کی دنیا میں تصوف کا جو اپنا منفرد و ممتاز مقام ہے اس سے سرمو انحراف کی گنجائش قطعی نہیں ہے۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں صوفی ازم موجود ہے۔ دراصل خدا سے مربوط ہونے اور اس کے عرفان کو یقینی بنانے کے لیے عشق و محبت کی راہ پر چلنے کا نام ہی صوفی ازم ہے۔ محبت اور مٹھاس کی راہ تصوف اور صوفیوں کی راہ ہے۔ نظریہ وحدۃ الوجود صوفیت کی بنیاد ہے۔ تصوف مخصوص طرز حیات کا نام ہے۔ ڈاکٹر جسپال سنگھ نے اس موقعے پر پنجاب اور سکھوں اور تصوف کی مستحکم باہمی روایات کو بھی بیان کیا۔ اس موقعے پر اپنی صدارتی گفتگو میں سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے صاحب زادے اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیرمین ڈاکٹر پرویز علی احمد نے بابا فرید سے اپنے نانی ہالی شجرے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانے میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ مناسب ہے اور وہ ہمارے مسائل کا حل تلاش کرسکتی ہے تو وہ تصوف ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے تعارفی کلمات پیش کی۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے جلسے کے افتتاح میں کہا کہ ہندوستانی صوفیہ کی خدمات اور مذاہب کے تئیں ان کے جذبات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خانقاہیں ایسے مراکز ہیں جہاں ذرہ برابر بھی امتیاز نہیں پایا جاتا ہے۔ وہاں سے مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر تمام مذاہب کے پیروکار کسب فیض کرتے ہیں۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جسٹس بدر دریز علی احمد بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی، اے رحمان، پروفیسر شریف حسین قاسمی، متین امروہوی، پنجابی یونیورسٹی کے بابا فرید صوفی اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر ناشر نقوی، پاکستان ہائی کمشنر کے نمائندہ طارق کریم، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر ابوبکر عباد، مولانا نبیل اختر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر شعیب رضا خاں اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام اراکین کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف علوم وفنون کے افراد موجود تھے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2016

اردو ایجوکیشن بورڈ کے طلبہ کو راحت

نئی دہلی: اردو ایجوکیشن بورڈ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی میں کامیابی ملنے کے بعد اب دہلی ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشنل میں بھی بڑی کامیابی ملی ہے۔ دہلی ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن نے اردو ایجوکیشنل بورڈ سے دسویں پاس کرنے والے طلبہ کو 11 ویں کلاس میں داخلہ دینے سے یہ کہتے ہوئے منع کردیا تھا کہ اس بورڈ کا نام دہلی ایجوکیشنل کی ویب سائٹ پر نہیں ہے۔ اس پر اردو ایجوکیشنل بورڈ کے طلبہ نے ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے خلاف ہائی کورٹ میں عرضی داخل کی، جس کی سماعت کرتے ہوئے دہلی ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس آسوتوش کمار نے ڈائریکٹوریٹ آف دہلی ایجوکیشنل کو طلبہ کا داخلہ لینے کی ہدایت دی۔ فاضل جج نے مزید کہا کہ جب مرکزی یونیورسٹیاں اردو ایجوکیشنل بورڈ کے طلبہ کو اپنے یہاں داخلہ دے رہی ہیں، تو ڈائریکٹوریٹ آف دہلی ایجوکیشن اردو ایجوکیشن بورڈ کے پاس آؤٹ طلبہ کو اپنے اسکولوں میں بھی داخلہ دینا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد اردو ایجوکیشنل بورڈ کے طلبہ کو دہلی کے سرکاری، پرائیویٹ اور پبلک اسکولوں میں آسانی سے داخلہ مل سکے گا۔ واضح رہے اردو ایجوکیشن بورڈ ایک منظور شدہ اقلیتی ادارہ ہے، جس کو قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کی طرف سے اقلیتی کردار کا درجہ بھی مل چکا ہے۔ بورڈ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی گائڈ لائن پر پوری طرح گامزن ہے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 جون 2016

دہلی میں اردو کی صورت حال

نئی دہلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے 'دہلی میں اردو کی صورت حال' پر ایک روزہ سمینار محمودیہ ماڈرن پبلک اسکول، چوہان بانگر، سیلم پور، دہلی میں زیر صدارت الحاج چودھری ناظم علی منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز قاری محمد زید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جبکہ نظامت کے فرائض مولانا جاوید احمد صدیقی قاسمی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر ایمریٹس دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر عبدالحق، ماسٹر ریاض الدین، شہادت علی نظامی، مولانا ایم رضوان اختر قاسمی، حافظ محمد شکیل، عابد انصاری، محمد زاہد، مولانا محمد موسیٰ قاسمی اور شاہنواز انصاری نے اپنے قیمتی مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ اردو رسم الخط کی بنیاد پر مسلمانوں کی زبان ہے اور اس زبان کو پروان چڑھانے میں غیر مسلم حضرات کا بڑا حصہ ہے اور وہ ہمارے محسن ہیں۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے یہ بھی کہا کہ اردو آئینی طور پر دہلی میں دوسری سرکاری زبان ہے لہٰذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وہ سارے اقدام کرے جو ہندی کے لیے

کرتی ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے خطاب میں کہا کہ گزشتہ پینسٹھ سال سے اردو کا نوحہ سنتے آ رہے ہیں مگر خوشی ہے کہ اردو دفن ہونے سے محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی خوش آئند ہے کہ اردو آج بھی زندہ و تابندہ ہے اور اردو کی صورت حال مجموعی اعتبار سے بہتر ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ امر بھی یقیناً خوش کن ہے کہ غیر مسلم حضرات اردو کی خدمت بڑے پیمانے پر انجام دے رہے ہیں۔ سمینار میں ماسٹر محمد زاہد، ڈاکٹر راشد حسن، اجوطالب منصوری، عامر حسین انصاری، مولانا جان محمد قاسمی، شعیب انصاری، نشاط سیفی، رومنا انصاری، انجم انصاری، جمیلہ سیفی، نسرین سیفی اور محمد زید شمسی وغیرہ موجود تھے۔ تمام شرکاء کا شکریہ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی (جنرل سکریٹری، عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن) نے ادا کیا۔

حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، نئی دہلی، 4 جون 2016

اتر پردیش:

اردو صحافت: چیلنجز اور امکانات

شاہجہانپور: فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ

کے زیر اہتمام سرزمین شاہجہانپور پر 'اردو صحافت: چیلنجز اور امکانات' کے موضوع پر 'نجب النساء میموریل ٹرسٹ لکھنؤ' کی کنوینر شپ اور فہیم تبسم کے زیر انتظام ایک تاریخی سمینار کا انعقاد ہوا جس میں صحافیوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ سمینار کی صدارت جی ایف کالج شاہجہانپور کے پرنسپل ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان ذی وقار معروف صحافی معصوم مراد آبادی (دہلی) نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اردو پڑھتے یا اردو کے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اردو پر احسان کرتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اردو ہی ہم پر احسان کرتی ہے۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم نے اردو کو اسلام قبول کرا دیا اور اسے صرف مسلمانوں تک محدود کر دیا۔ مہمان خصوصی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ کوئی بھی بڑا کام کرنے کے لیے جنون اور دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحافت بھی اسی وقت کامیاب صحافت ہوگی جب صحافی پوری محنت لگن اور دیوانگی کے انداز میں کام کریں گے۔ سینئر صحافی قطب اللہ نے کہا کہ آج اردو صحافت کے دو سو سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں صحافت نے کئی اہم تاریخ رقم کی ہے۔ لیکن آج اردو صحافت کے معیار میں گراوٹ آئی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ نو آموز صحافیوں میں تربیت کی کمی ہے۔ صدر محفل اور شاہجہانپور جی ایف کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ صحافت محض اخبار نویسی اور اس کی نشریات تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ایک ایسا پاک پیشہ ہے جسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ یہ سماج کا آئینہ ہے ہم اس میں جیسی تصویر پیش کریں گے ویسا ہی عکس ابھر کر سامنے آئے گا۔ صحافی غفران نسیم، محمد راشد خان ندوی، نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض رضوان احمد فاروقی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ خالد قیصر کے اظہار تشکر پر پروگرام ختم ہوا۔

روزنامہ 'جدید خبر' 25 مئی 2015

نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری

آگرہ: سینٹ جانس کالج آگرہ میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام 'نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری' پر دو روزہ قومی سمینار، مشاعرہ اور شام غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے اردو اور ہندی کے ادیب اور دانشوروں نے حصہ لیا۔ سمینار کا افتتاح سینٹ جانس کالج آگرہ کے پرنسپل پروفیسر پیٹر جوزف نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس کے بعد پروفیسر شفیق اشرفی نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا۔ سمینار کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر شافع قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی اور ڈاکٹر بھگوان شرما تھے۔ محترمہ سعدیہ مسلم نے نظیر کی عوامی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے نظیر کی شاعری کی سماجی معنویت کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد اکمل نے کہا کہ ان کے یہاں نظموں کے موضوعات بہت وسیع ہے۔ انھوں نے برسات، میلے ٹھیلے، جاڑے، ہولی، دیوالی، عید، وغیرہ پر نظمیں کہیں۔ ڈاکٹر جاوید اختر نے اپنے مقالے میں کہا کہ نظیر کا ہر شعر دل کو چھو لینے والا ہے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید نے اپنے مقالے میں کہا کہ نظیر عوامی شاعر ہیں ان کے نزدیک عوام سے انسان کا وہ طبقہ مراد ہے جس کو جاگیردارانہ نظام میں زیادہ اہمیت نہیں جاتی تھی انھوں نے نظیر کی نظم 'آدمی نامہ' کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے کہا کہ نظیر نے نظم کو باقاعدہ ایک صنف کے طور پر بھرپور تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مئی 2016

پنجاب:

گلستانِ اُردو پٹیالہ کی ادبی نشست

پٹیالہ: 30 اپریل 2016 کو انجمن 'گلستانِ اُردو پنجاب' پٹیالہ کی جانب سے ایک ادبی نشست اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب عابد علی خاں، سابق اُردو ٹیچر، بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر محمود عالم صاحب، سابق سکریٹری پنجاب اُردو اکادمی تشریف فرما تھے۔ پروگرام میں مہمانِ اعزازی کے طور پر جناب موسیٰ خان، صدر آل مسلم پنجاب (سماجی کارکن) نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز بھاشا وبھاگ میں اُردو تعلیم حاصل کر رہے طلبا و دیگر شعبوں سے وابستہ شخصیات نے اپنی نگارشات پیش کر کے کیا۔ کلام سنانے والوں میں کلوندر سنگھ گھمن، کامنی چوپڑہ، سیتا بترہ، بلرام جی، ایڈووکیٹ یشپال، کنول براڑ

اور مس روحی سلطان کو خوب پسند کیا گیا۔ اس کے بعد شعرا حضرات نے اپنا کلام سُنا کر سامعین کو سرشار کیا۔ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر محمود عالم صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اُردو زبان اور ریاست پٹیالہ کے رشتے پر روشنی ڈالی۔ اُردو محبت کی زبان ہے اس نے ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ اُنھوں نے اُردو

'اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

زبان وادب کے فروغ کے لیے 'گلستانِ اُردو پنجاب' کی جانب سے کیے جارہے اقدامات پر مسرت کا اظہار کیا۔

مہمانِ اعزازی جناب موسیٰ خان نے پٹیالہ میں اُردو کی ترقی کے لیے کی جارہی کوششوں اور ادبی پروگراموں پر خوشی ظاہر کی۔ جناب موسیٰ خان نے انجمن 'گلستانِ اُردو پنجاب' کو اپنی طرف -/5100 روپے دینے کا اعلان بھی کیا۔ پروگرام کی صدارت فرمارہے بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ کے سابقہ اُردو ٹیچر جناب عابد علی خاں نے پروگرام کے اختتام پر اپنے خیالات پیش کیے۔ اُنھوں نے پٹیالہ میں اُردو کے تئیں چل رہی سرگرمیوں پر اپنا ایک مضمون بھی پڑھا، جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔

پریس ریلیز: بلوندر سنگھ گھسن، صدر گلستانِ اُردو پنجاب، پٹیالہ، 31 مئی 2016

کرناٹک:

اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ

کرناٹک: شعبہ اردو مانسا گنگوتری کی جانب سے ای ایم ایم آر سی ہال میں 11 اور 12 مئی کو اردو کا دو روزہ قومی سمینار 'اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ' منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کے روح رواں اور پروفیسر ایس مسعود سراج صدر شعبہ اردو تھے۔ سمینار کے لیے عصر حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر موضوع کا انتخاب کیا گیا۔ 11 مئی کی صبح ہی سے آر ایم ایم سی ہال میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مہمانوں کی آمد کے بعد قومی اردو سمینار کا باضابطہ آغاز کیا گیا۔ مسرت پاشا راہی نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کی۔ ریسرچ اسکالر شبیر احمد ڈار نے 'تلاوت کلامِ پاک' سے محفل کا آغاز کیا، جبکہ خدیجہ تسنیم نے مترنم انداز میں نعت پڑھ کر تمام محفل کے قلوب کو گرما دیا، بعد ازاں صدر شعبۂ اردو پروفیسر مسعود سراج نے مختصر انداز میں سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ کلیدی خطبہ خلیل مامون صاحب نے پیش کیا جس میں انھوں نے اردو کے ابتدائی حالات سے لے کر آج تک کے حالات پر نہایت ہی مدلل خطاب کیا۔ خلیل مامون نے اردو کی ابتدا سے بات شروع کی اور غالب واقبال تک کے ادب کو بیان کیا پھر ترقی پسند تحریک پر سرسری تذکرہ کرتے ہوئے جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بھی روشنی ڈالی۔ پروفیسر انورالدین شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان وادب کا بدلتا ہوا منظر نامہ ایک اہم موضوع ہے بلکہ یہ موضوع ہی سمینار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اردو کے فروغ اور اس کی بقا کے لیے ہر ایک اہل اردو نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے کیونکہ کوئی بھی کارنامہ ادارے نہیں بلکہ ارادہ کرتا ہے۔ اس کے بعد جناب سراج احمد خلیل احمد رجسٹرار کرناٹکا اردو اکادمی نے اردو کے موجودہ صورت حال پر گفتگو کی۔ صدر مجلس جناب عزیز اللہ بیگ نے نہایت ہی مختصر اور جامع انداز میں اردو کو فروغ دینے کے عمدہ مشوروں سے نوازا۔ آخر میں نعمت اللہ خاں کے شکریے پر مجلس اختتام کو پہنچی۔

پریس ریلیز: نعمت اللہ خان، کرناٹک، 12 مئی 2016

مہاراشٹر:

انجمن محبانِ ادب کی نشست

مورخہ 7 مئی کو محفل افسانہ جوگیندر پال کے نام منعقد کی گئی۔ صدر نشست احمد عثمانی کے مطابق یہ انجمن محبانِ ادب کی ایک سو گیارویں نشست تھی جب شہر عزیز ادبی جمود کا شکار تھا اس جمود کو انجمن نے توڑا۔ آج افسانہ نگاروں کی پوری کھیپ تیار ہے۔ ناظم نشست رئیس ستارہ نے نوجوان افسانہ نگار صادق اسد کو آواز دی انھوں نے افسانہ 'دوسرا خط' سنایا۔ دوسرے افسانہ نگار فروغ جعفری تھے انھوں نے 'عکس خوشبو' سنایا۔ ہارون اختر نے افسانہ 'کہانی کا کرب' سنایا۔ اسی طرح پینٹر نفیس نے آخری افسانہ 'توبال' سنایا۔ صدر نشست احمد عثمانی نے جوگیندر پال کی موت کو ادب کا نقصان عظیم بتایا انھوں نے کہا ایسے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جوگیندر پال کے افسانوں سے متاثر ہو کر بہت سے نوجوان افسانہ لکھنے اور پڑھنے لگے اور آج بہت اچھے افسانے سننے اور پڑھنے کے لیے ملتے ہیں۔ صدر محفل نے مزید کہا آج انجمن کے افسانہ نگار بہتر افسانے لکھنے کی طرف مائل ہیں اور صاف ستھرا بیانیاں بہتر انداز سے پیش کر رہے ہیں۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی علامتوں سے گریز کر رہے ہیں ایسی علامتوں سے ادب کا قاری دور ہوتا جارہا تھا لیکن انجمن محبانِ ادب نے قاری اور ادب کے بیچ پل کا کام کیا۔ اس محفلِ افسانہ میں افضال سر، عمران جمیل، شب انصاری، وسیم احمد انصاری، عمران سر، نہال ایم۔ آر، اعجاز سر، آصف اقبال مرزا، عبدالرحمٰن اختر، احمد ندیم اور بہت سارے ادب نواز شریک تھے۔ ہارون اختر کے شکریے کے ساتھ محفل کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: ہارون اختر صدر انجمن محبانِ ادب (مالیگاؤں، 19 مئی 2016

تہذیب و ثقافت:

محفل شعر وسخن کا کامیاب انعقاد

برھانپور: الفیض اردو ہائی اسکول جلگاؤں کے صدر مدرس پٹھان آصف خان کے اعزاز میں دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے محفلِ شعر وسخن کا انعقاد غفوریہ حمیدیہ ہال برہانپور میں کیا گیا جس میں برہان پور کے معروف شعرا استاد جمیل اصغر، عبدالرحمٰن جامی، فاروق نور، نوید آذری، شرار آصفی، وقار آصفی، رشید عنبر، فرید جھنجھٹ، علی آغاز نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے محترم ایڈوکیٹ خلیل احمد انصاری (پروفیسر شعبۂ قانون سیوا سدن کالج برہان پور) نے کہا کہ اس طرح کی محفلوں کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ یہ ہماری تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے۔ محترم پٹھان آصف خان نے اپنی تاثراتی تقریر میں کہا کہ ہم نے برہان پور کی جو تاریخ کتابوں میں پڑھی تھی آج اُن تاریخی عمارتوں اور مزارات اولیائے برہان پور کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس کے لیے میں تنویر برکاتی اور اُن کی پوری ٹیم کا مشکور ہوں کہ انھوں نے ہمیں برہان پور کی سیر کروائی اور تاریخ برہان پور سے روشناس فرمایا۔ استقبالیہ جلسہ کی نظامت ڈاکٹر عارف انصاری نے اور محفل شعر وسخن کی نظامت برہان تنویر نے ادا کی۔ بطور مہمانِ خصوصی جلگاؤں سے شیخ زیان احمد (نامہ نگار روزنامہ راشٹریہ سہارا جلگاؤں)، اقبال اثر شامل تھے جبکہ برہانپور سے ماسٹر وکیل انصاری، ماسٹر حفاظت ہمایوں، ماسٹر عاصم صدیقی، ماسٹر مثنیٰ حارث، عارف انصاری، محمد وسیم انصاری، جلیل اختر وغیرہ موجود تھے۔ ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری تنویر رضا برکاتی نے اختتامی کلمات میں کہا کہ برہان پور کے اولیا اور صوفیا کی ادبی خدمات کے تذکرہ کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔

پریس ریلیز: شیخ زیان احمد، برہانپور، 4 جون 2016

'ایک صوفیانہ شام' پروگرام کا منظر

ڈراما 'وِدُروہ کال' کا انعقاد

نئی دھلی: پوری دنیا میں اتنی اموات جنگ، امراض اور دیگر وجوہات سے نہیں ہوتی ہیں جتنی کہ صرف بھوک میں تڑپ کر مرجانے سے ہوجاتی ہیں۔ اسی بھوک کو دھیان میں رکھتے ہوئے اندو آرٹ تھیٹر اینڈ فلم سوسائٹی کا کے نئے ڈرامہ ودروہ کال کا انعقاد نئی دہلی لودھی اسٹیٹ میں کیا گیا۔ معروف رائٹر اور ڈائرکٹر یاسین خان کی یہ گاؤں کی زندگی، جنگلات اور ان کے دکھ درد پر مرکوز ہے۔ ڈرامے میں اہم کردار عارب چودھری نے نبھایا جبکہ سندھیا سنہا، راہل تیاگی، پوروشرما، وکاس گوڑ، روہت، پارس سبروال، موہت، گرپریت، آشیش کانت نے مختلف کرداروں کو اپنی اداکاری سے زندہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2016

ایک صوفیانہ شام

نئی دھلی: ہندوستانی کلاسیکی اور صوفی روایات میں ہم آہنگی کو مضبوط کرکے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی اتحاد کو مسلسل تقویت دینے میں لگے۔ امیر خسرو فاؤنڈیشن کی جانب سے دارالحکومت کے لودھی روڈ پر واقع ستیہ سائیں سینٹر کے آڈیٹوریم میں 'ایک صوفیانہ شام' کے نام سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور صوفی گلوکار دھروسنگاری اور ان کے گروپ 'روح' کے ساتھیوں نے اپنے گانے سے ایسا سماں باندھا کہ آڈیٹوریم میں موجود تمام سامعین، ناظرین جھوم اٹھے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ موجود رہے۔ وہیں دہلی کے چیف سکریٹری کے کے شرما، پولس کمشنر آلوک کمار ورما اور گیل کے ڈائریکٹر آشوتوش کرناٹک بھی شریک ہوئے۔ پروگرام کا آغاز لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے شمع روشن کرکے کیا۔ اس موقعے پر لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے کہا کہ ملک کے اتحاد، سالمیت اور بھائی چارے کو مضبوط کرنے والے لوگوں اور تنظیموں کا یقیناً احترام کیا جانا چاہیے۔ امیر خسرو فاؤنڈیشن اس سمت میں بہترین کام کررہا ہے۔ اس موقعے پر نجیب جنگ نے سماجی کارکن سنجیو صراف اور عشرت آرا کو 'قومی اتحاد ایوارڈ' سے نوازا۔ امیر خسرو فاؤنڈیشن اور پروگرام کے کنوینر سینئر آئی پی ایس افسر اجے چودھری کے مطابق امیر خسرو فاؤنڈیشن ایسے لوگوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے جو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو آگے بڑھانے میں اپنا اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ فاؤنڈیشن کی نائب صدر امیکا چودھری نے بتایا کہ ہندوستانی فن وثقافت دنیا میں بے مثال ہے اور اس کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ مختلف ذات، مذہب، بولی اور زبانوں کی یہ ایک ایسی خوشبو ہے جس کی مہک پوری دنیا کو مسرور کردیتی ہے۔ پروگرام کے آخر میں فاؤنڈیشن کے سکریٹری راکیش کمار نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مئی 2016

اعزاز و اکرام:

سنگم فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام تقسیم انعامات

لکھنؤ: سنگم فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام جے شنکر

پرساد ہال قیصر باغ میں اودھ رتن ایوارڈ 2016 تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ فاؤنڈیشن نے اردو اور ہندی ادیبوں، صحافی اور سماجی خدمت گاروں کو اودھ رتن ایوارڈ سے نوازا۔ اردو تنقید کے لیے پروفیسر شارب ردولوی کو احتشام حسین اودھ رتن ایوارڈ، اردو ادب میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے سید امتیاز اشرفی کے نام سے موسوم ایوارڈ پروفیسر اعجاز علی ارشد کو، ہندی ادب کی خدمات کے لیے ملک محمد جائسی کے نام نامی سے منسلک ایوارڈ پروفیسر بھگوان شرما کو، اردو روزنامہ 'اودھ نامہ' کے مدیر وقار رضوی کو صحافت کے میدان میں جرأت مندانہ اقدام کے لیے سید منظور احمد اشرفی ایوارڈ اور سماجی خدمات کے لیے ڈاکٹر چندر موہن جین کو مولانا نعیم اشرف ایوارڈ اور ندیم اشرف جائسی کو ملک زادہ منظور احمد اودھ رتن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے ایوارڈ یافتگان کا تعارف اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ادبی، سماجی اور صحافی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ تقریب کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین مظفر حسین نے کی۔ صدارتی تقریر میں مظفر حسین نے سنگم کی کوششوں کو سراہا اور قومی کونسل کی اردو زبان کے فروغ میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس تقریب میں اردو اور اردو والوں کا درد سنا وہ پورے ملک کا درد ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسم الخط کے جھگڑے کو سمجھنے کے لیے لینگویج کمیٹی کی بحث کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مہمانِ خصوصی وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد نے اپنی مختصر تقریر میں انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کی۔ انور جلال پوری نے ملک زادہ کو شاعری کا درویش، ادب کا قلندر اور نظامت کا سکندر بتایا۔ وائس چانسلر اعجاز علی ارشد نے کہا سماج کو آج رواداری، مثبت فکر، قوت برداشت کی بہت ضرورت ہے۔ نعیم صدیقی اور انعام یافتگان، ڈاکٹر چندر موہن جین، ندیم اشرف جائسی نے بھی اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے مہمانوں اور ایوارڈ یافتگان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے گئے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ثوبان سعید نے انجام دیے۔ اظہار تشکر کا فریضہ پروفیسر اشرفی نے انجام دیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر فخر عالم اعظمی، ڈاکٹر مرتضی علی اطہر، ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، ڈاکٹر جاوید اختر، رضوان خان، ڈاکٹر ماہرخ مرزا، ڈاکٹر احتشام وشہر کے دیگر ادبا ومعززین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 9 مئی 2016

اردو اکادمی دہلی کا تقسیم انعامات برائے کتب 2014-15 کا منظر

اردو اکادمی کا جلسہ تقسیم انعامات برائے کتب 2014-15

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات برائے کتب 2014 اور 2015 کا دلی سکریٹریٹ کے آڈیٹوریم میں انعقاد عمل میں آیا جس کے مہمان خصوصی وزیر برائے فن، ثقافت، السنہ و سیاحت جناب کپل مشرا اور صدارت سکریٹری السنہ جناب رمیش تیواری نے کی۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئر مین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ 2014 کی کتابوں کو بھی انعام دیا جا رہا ہے جن کتابوں کو سابق گورننگ کونسل نے منتخب کیا۔ 2015 کی کتابوں کے لیے کوشش یہ کی گئی ہے کہ 98 فیصد کتابوں کو انعامات دیے جائیں انھوں نے کہا کہ اردو کسی گروہ کی نہیں بلکہ سبھی کی زبان ہے۔ ہم اگلے سال ان کتابوں کو بھی انعامات دیں گے جو ہمارے یہاں کسی وجہ سے جمع نہیں کرائی جا سکی۔ مہمانِ خصوصی وزیر برائے فن، ثقافت، السنہ و سیاحت دہلی کپل مشرا نے کہا کہ کتاب لکھنا اور اسے شائع کرانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا بلکہ یہ روحانیت کا ایک حصہ ہے جو قرطاس پر دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میں سبھی مصنفین کو مبارک باد دیتا ہوں اور سلام کرتا ہوں کہ انھوں نے جرأت کے ساتھ کتابیں تصنیف کیں۔ رمیش تیواری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہماری حکومت نے یہ قصد کیا تھا کہ بلاتفریق سبھی زبانوں کو فروغ دیا جائے۔ اردو ایک بہت ہی پیاری زبان ہے جس کو ترقی دینے کے لیے ہماری حکومت سرگرم ہے۔ جلسے کی نظامت اطہر سعید اور ریشماں فاروقی نے کی۔

روز نامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 21 مئی 2016

پنجاب اردو اکیڈمی میں منعقد ہوئے تعلیمی مقابلوں کے نتائج کا اعلان

مالیرکوٹله: پنجاب اردو اکادمی میں پہلی مرتبہ ہوئے صوبائی سطح کے تعلیمی مقابلوں میں پنجاب کے سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے اردو کے تقریباً 150 طلبہ وطالبات اور ان کے 80 کے قریب اساتذہ نے شرکت کی۔ پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن نے کہا کہ طلبا کو ان مسابقتی مقابلوں کے ذریعے اس قابل بنانا ہے کہ وہ مستقبل کی قائدانہ صلاحیتیں حاصل کر کے سماج کا قیمتی سرمایہ بن سکیں۔

سکریٹری موصوف نے فرمایا کہ چونکہ اردو زبان کی پرورش و پرداخت اسی ملک اور گنگا جمنی تہذیب میں ہوئی ہے لہٰذا اس کا نظارہ ان پرائمری، مڈل اور سیکنڈری سطح کے مقابلوں کو دیکھنے ہی سے بنتا تھا۔ جس میں ہندو، مسلم اور سکھ طلبہ وطالبات نے حصہ لیا اور اکادمی کی ایک ہی چھت کے نیچے بیٹھ کر اپنی خداداد صلاحیتوں اور اردو زبان سے اپنی دلی وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ اکیڈمی کی طرف سے منعقد کیے گئے ان مقابلوں کے نتائج اس طرح سے ہیں۔

پرائمری سطح پر خوشخطی کے مقابلوں کے نتائج میں پہلا مقام محمد خلیل، سرکاری گرلز پرائمری اسکول، مالیرکوٹلہ، دوسرا مقام عبدالرشید، اسلامیہ سنئیر سیکنڈری اسکول برانچ نمبر 1، مالیرکوٹلہ اور تیسرا مقام ثالث، الفلاح پبلک سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ نے حاصل کیا۔ مڈل سطح پر خوشخطی کے نتائج میں پہلا مقام ضیاء، اسلامیہ کمبوج سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ، دوسرا مقام محمد اطہر، جامعہ اسلامیہ اشرف العلوم، بنبھولی کلاں، مالیرکوٹلہ اور تیسرا مقام فلک، سرکاری گرلز سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ نے حاصل کیا۔ اسی طرح سیکنڈری سطح پر پہلا مقام محمد رضوان، الہدیٰ پبلک اسکول، عباس پورہ، مالیرکوٹلہ، دوسرا مقام ایمن سہیل، النور پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ اور تیسرا مقام محمد سجاد، اسلامیہ سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ نے حاصل کیا۔

مڈل سطح پر املا (یاد سے لکھنا) کے مقابلوں کے نتائج میں پہلا مقام عبدالحارث، الہدیٰ پبلک اسکول، عباس پورہ، مالیرکوٹلہ، دوسرا مقام عید محمد، مدرسہ زینت العلوم، مالیرکوٹلہ اور تیسرا مقام ثمرہ، اوسس پبلک ہائی اسکول، مالیرکوٹلہ نے حاصل کیا۔ سیکنڈری سطح پر پر املا (یاد سے لکھنا) کے نتائج میں پہلا مقام سمیر، الفلاح پبلک سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ، دوسرا مقام رضیہ پروین، اسلامیہ کمبوج سنئیر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ اور تیسرا مقام مہر النساء، النور پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ نے حاصل کیا۔

پریس ریلیز: آفس، پنجاب اردو اکادمی، مالیرکوٹلہ، 3 جون 2016

مرزا داغ دہلوی نیشنل ایوارڈ

نئی دھلی: اردو زبان ایک تہذیب ہے جو سماج کو مہذب بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے مگر چند دیوانے ایسے آگئے ہیں جو چاہتے ہیں کہ کسی بھی طرح یہ زبان فنا ہو جائے مگر ایسا کیوں کر ممکن ہے جبکہ یہ وہ زبان ہے جو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے اور جس نے اسی ملک کی مٹی میں جنم لیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ میں سماجی و ثقافتی تنظیم محفل صنم کے زیر اہتمام مرزا داغ دہلوی نیشنل ایوارڈ اور محفل مشاعرہ بعنوان بہار دہلی میں سابق ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب نے اپنے خطبہ ڈاکٹر اے سی اگروال، عالمی اردو ٹرسٹ کے اے رحمٰن مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت مجاہد آزادی مرزا نسیم بیگ چنگیزی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر شہلا نواب نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اردو زبان کے معروف شاعر استاد داغ دہلوی کے نام سے منسوب اس ایوارڈ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اے رحمٰن نے کہا کہ بلاشبہ اردو کو مدارس اسلامیہ نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے۔ مجاہد آزادی مرزا نسیم بیگ چنگیزی نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ جو بھلائے گئے ان کی یادوں کو تازہ کرنے کا کام اس تنظیم نے کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شہلا نواب نے اپنی تنظیم کا مختصر تعارف بھی کرایا اور اس کے اغراض و مقاصد بھی بیان کیے۔ مرزا داغ دہلوی ایوارڈ یافتگان میں بیسٹ اردو شاعر برائے طنز و مزاح کے لیے ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی، اردو اسکولوں میں نمایاں سرگرمیاں انجام دینے والا ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سکنڈری اسکول جعفر آباد پرنسپل ڈاکٹر محمد معروف خان ممتاز پرنٹر اور پبلشر میں فرید بک ڈپو، بہترین اردو ادارہ کے طور پر غالب اکادمی، ڈاکٹر عقیل احمد، موسیقی کے ذریعے اردو کو فروغ دینے میں پرمندر چڈھا، ممتاز اردو استاد پروفیسر خواجہ اکرام الدین، سماجی سرگرمیوں کے لیے دہلی یوتھ اینڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے محمد نعیم، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ پروفیسر مظفر حنفی کو ملا جس کو ان کی جگہ فیروز حنفی نے لیا، پروفیسر اعجاز علی ارشد اور اردو صحافتی خدمات میں روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی کو مرزا داغ دہلوی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس پروقار تقریب میں ملک کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2016

عطاء الحق قاسمی

نئی دھلی: پاکستان کے ممتاز شاعر عطاء الحق قاسمی کا کہنا ہے کہ اردو کی ترقی اور نئی نسل کے ساتھ اس کی وابستگی

کو فروغ دینا محبان اردو کے ہاتھ میں ہے اور انھیں اس زبان کو زندہ رکھنے کے لیے قدم اٹھانے چاہیے۔ نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقدہ جشن ادب کے پانچویں اجلاس میں پاکستان سے آئے عطاء الحق قاسمی بھی شامل تھے۔ اس سال کے شہنشاہ وطنز ومزاح یوارڈ سے نوازے گئے ممتاز مزاح نگار عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ اردو زبان کو اس کی ابتدائی بلندیوں تک واپس پہچانا ممکن ہے کیونکہ اس کی بنیاد ہندوستان اور پاکستان دونوں میں گہرائی تک پیوست ہے۔ انھوں نے کہا اردو بے حد مضبوط زبان ہے۔ اس کی بنیاد بہت مضبوط ہے اور اس کی خوب صورتی کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محبان اردو نئی نسل کے ساتھ اس زبان کی وابستگی مضبوط بنائیں اور اسے برقرار رکھیں۔ اس موقعے پر مشہور ہندوستانی فلم ساز مظفر علی نے کہا کہ ہمیں اردو کے مستقبل کی امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اگر آپ تہذیب کو صحیح طریقے سے اپنا لیں تو اسے کسی بھی زبان میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ مشہور شاعر اصغر ندیم سید نے سنیما میں اردو زبان کی خراب ہوتی ہوئی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''چونکہ معاشرہ سنیما کی زبان کا آئینہ ہوتا ہے ایسے میں سنیما وہی دکھاتا ہے جو معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے۔'' عطاء الحق قاسمی اور اصغر ندیم سید کے علاوہ رخشندہ جلیل، گوپال داس نیرج، بیکل اتساہی، انور شعور، عذیر احمد، شارق کیفی، منیش شکلا، نینا کمار، معین شاداب وغیرہ موجود تھے۔

روز نامہ 'جدید خبر' دہلی، 12 مئی 2016

مناظر عاشق ہرگانوی

بزم لوح وقلم مرادآباد کی ایک نشست مقامی نگر نگم ہال میں منعقد ہوئی، جس کی سرپرستی مولانا محمد احمد اکرمی نے اور صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد آصف نے انجام دیے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر جے پال سنگھ ویست ایم ایل سی اور مہمان اعزازی پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

تھے۔ پروگرام میں پروفیسر مناظر عاشق کو نعتیہ شاعری کے لیے فخر ملت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر موصوف ملک کے مشہور اردو مصنف ہیں اور ان پر 4 پی ایچ ڈیاں ہو چکی ہیں۔ ان پر آج تک 20 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے مرادآباد تشریف آوری پر انھیں فخر ملت مولانا نعیم الدین ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں منصور عثمانی نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے شہر مرادآباد میں آج عاشق ہرگانوی کو اعزاز دے کر ان کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ اس موقعے پر قمر قدیر ارم، ڈاکٹر زیبا ناز، اور ڈاکٹر مجاہد فراز نے اپنے خیالات پیش کیے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 مئی 2016

ڈاکٹر سیّد احمد خاں

نئی دھلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر چودھری ناظم علی نے دہلی کے معروف یونانی طبیب ڈاکٹر

سیّد احمد خاں کو 'پیشن فار پروفیشن' ایوارڈ 2015 سے سرفراز ہونے پر دلی مبارکباد پیش کی۔ واضح ہو کہ تنظیم پیشن فار پروفیشن ہر سال بہتر خدمات اور اپنے پروفیشنل میدان میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے اخباری نمائندوں، صحت و سماجی خدمات انجام دینے والوں کو ایوارڈز سے سرفراز کرتی ہے۔ اس سال دہلی میں پہلے یونانی طبیب کے طور پر ڈاکٹر سیّد احمد خاں کی خدمات کے اعتراف میں مذکورہ ایوارڈ چودھری متین احمد (سابق ایم ایل اے) کے ہاتھوں دیا گیا ہے۔ چودھری ناظم علی نے کہا کہ طب یونانی کے میدان میں ڈاکٹر سیّد احمد خاں کی خدمات سے ہر کوئی اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ انھیں پیشن فار پروفیشن ایوارڈ ملنا ہم سب کے لیے اور طبی دنیا کے لیے یقیناً قابل رشک ہے۔ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے کہا کہ ڈاکٹر سیّد احمد خاں کو اب تک ملنے والے ایوارڈز کی فہرست میں یہ دسواں ایوارڈ بطور اضافہ شامل ہے جو ہم سب کے لیے قابل رشک ہے۔

پریس ریلیز: حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، 6 مئی 2016

غیاث الرحمٰن کو استقبالیہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انور جمال قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سنٹر کے استاد اور معروف افسانہ نگار غیاث الرحمٰن (ڈاکٹر جی آر سید) کی آمد پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر غیاث الرحمٰن نے کہا میڈیا کا کام ہنگامہ برپا کرنا نہیں ہوتا بلکہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ میڈیا میں کون سی بات پیش کرنا ہے اس سے زیادہ یہ جاننا ہے کہ کیا نہیں پیش کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم عصر صحافت میں خبروں کے پیش کش کے انداز اور خبروں کے ساتھ برتاؤ میں گراوٹ کی وجہ اس اصول کو نظر انداز کرنا ہے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ غیاث الرحمٰن آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے علی گڑھ میں زمانہ طالب علمی کے دوران ہی بہت معیاری افسانے تحریر کیے۔ ان کے افسانوں میں اتر پردیش کے متوسط طبقے کے سماج اور معاشرت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد کاظم نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مئی 2016

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو استقبالیہ

علی گڑھ: دور حاضر کی اہم ضرورت کے پیش نظر مدارس اسلامیہ کو چاہیے کہ وہ فارغ التحصیل طلبہ کو 'صحافتی کورس' کرائیں، اس سے اردو زبان و ادب کو فروغ تو ملے گا ہی ساتھ فارغین مدارس کو بہترین روزگار اور مستقبل مل جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ تشریف لائے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کیا۔ انھوں نے برنی فاؤنڈیشن کے صدر دفتر پر ایک استقبالیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں مدارس اسلامیہ/ سماجی تنظیم اردو کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہتی ہے تو صرف ایک نکاتی ایجنڈے پر کام کرے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان صحافت کے میدان میں آگے آئیں۔ آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے، شعبہ مواصلات نے زبردست ترقی کی ہے اور اس شعبے میں ہمارے نوجوانوں کی نمائندگی نہ کے برابر ہے۔ جبکہ

ہر نیوز چینل اور پرنٹ میڈیا ایسے نوجوانوں کو ترجیح دیتا ہے جو دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ بہترین اردو بولنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر ہمارے نوجوانوں نے اس شعبے میں قدم رکھا تو ایک انقلاب برپا ہوگا اور ملت اسلامیہ کی بھرپور نمائندگی اور مسلمانوں کے مسائل کو بروئے کار لاکر ان کے اضافے میں بھی کارگر ثابت ہوگا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا استقبال کرتے ہوئے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے علی گڑھ کو آرڈینیٹر کلیم تیاگی نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اردو زبان و ادب کی وہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایک بہترین اور مقبول افسانہ نگار بھی ہیں۔ برنی فاؤنڈیشن کے صدر شہزاد عالم برنی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 مئی 2016

رسم اجرا:

مسلمانوں کے مذہبی وسماجی مسائل

علی گڑھ: اصل ادب وہ ہے جس کو عوام وخواص پسند کریں اور ادیب کی تحریریں اپنے اثرات کے ساتھ ساتھ سوالات کا ایک بڑا ذخیرہ قاری کے ذہن میں نقش کرجائے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ادیب و اردو ادب کے معروف نقاد پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے اے ایم یو اسٹاف کلب میں منعقدہ اردو اسلامی اسکالر اور شعبہ شماریات کے پروفیسر عارف الاسلام کی کتاب مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی مسائل کے رسم اجرا کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر قاضی نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن پروفیسر اسلام کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے جس تازگی اور شعور کی پختگی کا احساس ہوتا ہے وہ بہت کم تحریروں میں میں نے اب تک محسوس کیا ہے۔ معروف سماجی کارکن اور شعبہ انجینئرنگ کے سابق سربراہ پروفیسر رضاء اللہ خان اور شعبہ قانون کے پروفیسر شکیل صمدانی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ یہ سراسر ظلم ہے کہ مسلمانوں کو بغیر تحقیق کے اس اسلام کو ماننے کے لیے مجبور کیا جائے جس کے بارے میں اس نے تحقیق نہ کی ہو ہر کسی کو مذہبی آزادی ہے اور القرآن کا فیصلہ ہے کہ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ سمجھ کر پڑھنا لازم ہے اور سمجھ سمجھ کر پڑھنا یہ وہی پڑھنا اور عمل کرنا ہے ہر بات کی تحقیق کرلو کہ کیا درست ہے اور کیا نہیں۔ پروفیسر عارف الاسلام نے بھی اپنی کتاب پر تفصیلی گفتگو کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جون 2016

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر مولا بخش کے 'گراں خواب چینی سنبھلنے لگے' کے عنوان سے شائع چین کے سفرنامہ کا وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے اجرا کیا۔ پروفیسر مولا بخش نے اپنے اس سفرنامہ کو وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ کو معنون کیا ہے جس میں مصنف نے

لکھا ہے کہ "جناب ضمیر الدین شاہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا، یونیورسٹی کی جدید کاری میں اہم رول ادا کیا، اس ادارے کے تشخص کو مزید روشن کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کی لڑائی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔" پروفیسر مولا بخش کا چین کا سفر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ادبی ڈپلومیسی کا حصہ تھا۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں پر مشتمل اس وفد میں اردو کی نمائندگی مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مولا بخش نے کی تھی۔ یہ سفرنامہ چین کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے چین میں اردو زبان و ادب سے متعلق بعض اہم واقعات کو بھی درج کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ چین میں اردو کی باقاعدہ تنظیم ہے اور ریڈیو اسٹیشن سے اردو میں پروگرام بھی نشر ہوتا ہے اور بیجنگ یونیورسٹی میں باقاعدہ اردو تعلیم کا نظم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ چین میں حلال گوشت ہوٹلوں میں مہیا ہوتا ہے اور وہاں کی نوچیہ مسجد مسلمانوں کے لیے ان کی ثقافت کے تحفظ کے لیے ایک چمکتے ستارے کی مانند ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 جون 2016

ہریانہ کی تاریخی مساجد

پانی پت: ہریانہ وقف بورڈ کے زیر اہتمام صدر دفتر انبالہ میں منعقد ایک تقریب میں 'ہریانہ کی تاریخی مساجد' نامی کتاب کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت بورڈ کے ایڈمنسٹریٹر محمد عاقل (آئی پی ایس) اور نظامت عبدالسمیع انصاری نے کی۔ پروگرام کا آغاز مولانا عبدالسلام کی تلاوت سے ہوا۔ تقریب میں ریاست کے 400 سے زائد ائمہ مساجد، ارباب مدارس اور بورڈ کے اعلیٰ افسران نیز دانشوروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر کتاب کے مصنف مفتی عطاء الرحمن قاسمی نے کہا کہ کسی عہد کی تاریخ کو محفوظ و مستحکم رکھنے میں کتابیں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ صدارتی خطاب میں محمد عاقل نے کہا کہ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے، جو عدالت اور دوسری جگہوں پر کام آئے گی۔ ایڈمنسٹریٹیو آفیسر امتیاز خضر نے عہد مغلیہ کی عمارات اور اس دور کی مساجد کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور کہا کہ قدیم مساجد کی تاریخ کو لکھنے کے لیے ان کے کتبے نہایت ہی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ لاافسر اقبال خان نے کتاب کی دستاویزی حیثیت کے تعلق سے بیان کیا۔ غور طلب ہے کہ 400 سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ہریانہ کے مشہور شہروں پانی پت، انبالہ، روہتک، حصار، کیتھل، یمنا نگر، تھانیسر اور ہانسی و سرسہ میں تعمیر شدہ قدیم مساجد اور ان سے ملحقہ اوقاف کی جائیداوں نیز مزارات اور درگاہوں کی تاریخ کا بھی احاطہ کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں 20 سے زائد مساجد کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مئی 2016

نذر ابوالکلام قاسمی

علی گڑھ: معروف نقاد اور ممتاز دانشور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

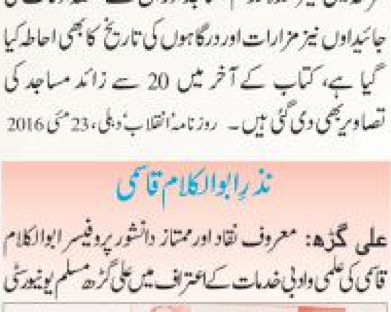

کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر معید الرحمن کی ترتیب کردہ کتاب 'نذر ابوالکلام قاسمی' کی رسم اجرا تقریب کا انعقاد ابن سینا اکادمی میں عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے کہا کہ پروفیسر قاسمی اپنے عہد کے ممتاز نقاد ہیں۔ ان کا تعلق اردو کی اس نسل سے ہے جو عربی اور فارسی زبانوں میں بھی مہارت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تحریروں میں تراکیب و الفاظ کی انفرادیت عربی و فارسی زبانوں پر عبور کا پتہ دیتی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر مسعود الحسن نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر قاسمی سے تعارف ان کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہوا جو رفتہ رفتہ تعریف میں بدل گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ آج کے دور میں جو لکھا جارہا ہے اگر اسے پڑھا بھی

جاوید حسین پالوجی شارب کے افسانچوں کا مجموعہ 'بے ساختہ' کا اجرا

صحافی ندیم صدیقی کے تخلیق کردہ مضامین کا مجموعہ 'پرسہ' کا اجرا

جارہا ہے تو یہ کسی انعام سے کم نہیں ہے۔ تحریر مکمل ہوکر آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے تو وہ قاری کی ملکیت ہوجاتی ہے۔ شعبۂ کیمیا کے سابق صدر پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے کہا کہ ابوالکلام قاسمی کی شخصیت عالمی سطح کی حامل ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 مئی 2016

بے ساختہ

پونہ: ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن شولاپور کے زیر اہتمام اور اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کے تعاون سے 11 مئی کو اعظم کیمپس میں اردو جہان کے معروف افسانہ نگار، شاعر، ماہر طب، ڈاکٹر جاوید حسین پالوجی شارب کے افسانچوں کا مجموعہ 'بے ساختہ' کی رسم رونمائی معروف شخصیت حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کے چیرمین جناب منور پیر بھائی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس تقریب میں بطور مہمان ممتاز پیر بھائی، معروف شاعر وادیب سہ ماہی اسباق کے مدیر جناب نذیر فتح پوری، راشد جمال فاروقی دہرادون اترا کھنڈ، سائنسی مضمون نگار ومحقق شیخ جنید سر سولا پور، اسلم چشتی، رفیق جعفر، معروف شاعر عبداللہ ساجد ممبئی ودیگر مہمانان، سامعین موجود تھے۔ جناب محمد صفی انوری بیڑ کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ فاؤنڈیشن کے صدر سلطان اختر نے نظامت کی۔ اس موقع پر نذیر فتح پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جاوید جتنے اچھے شاعر اتنے ہی اچھے افسانچہ نگار ہیں۔

اس موقعے پر دیگر مہمانان نے، ڈاکٹر جاوید پالوجی کے افسانچوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے افسانچوں کو کامیاب بتایا اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ جناب منور پیر بھائی نے اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر جاوید پالوجی کو مبارک باد دی اور تمام مقررین کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ افسانچے کی خوبی اُس کا اختصار ہوتا ہے۔ جو ڈاکٹر جاوید پالوجی کے افسانچوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر جاوید نے کامیاب افسانچے لکھے ہیں۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، پونہ، 16 مئی 2016

پرسہ

بھیونڈی: اردو کے معروف ادیب، شاعر وصحافی ندیم صدیقی کے تخلیق کردہ مضامین کا مجموعہ 'پرسہ' کی اشاعت پر ایک تہنیتی جلسے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ایڈوکیٹ یٰسین مومن نے کی۔ اردو قبیلہ بھیونڈی کے زیر اہتمام اردو بسیرا ہال میں منعقدہ اس تہنیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کامریڈ اسرار احمد انصاری نے لفظ پرسہ کی قدیم دیہی روایتوں کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس چھوٹے سے لفظ پرسہ میں کتنی وسعت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں سے محبت کا کتنا پیارا اظہار ہے۔ محمد رفیع انصاری نے ندیم صدیقی کی کتاب پرسہ کے تعلق سے بڑی ہی عالمانہ اور محققانہ باتیں کیں۔ انھوں نے اس کتاب کے جملہ مشمولات پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا نام گرچہ پرسہ ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ ہمارے سماجی ادبی اور ثقافتی قدروں کا ورثہ ہے۔ صدر جلسہ ایڈوکیٹ یٰسین مومن نے ندیم صدیقی سے اپنے دیرینہ مراسم کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا۔ اسی دوران محترم عالم ندوی کے دست مبارک 'پرسہ' کی رونمائی عمل میں آئی۔ مقصود انصاری نے اس تہنیتی جلسے کی بحسن وخوبی نظامت فرمائی۔ جبکہ مخلص مدعو نے تمام مہمانوں اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' 19 مئی 2016

برفیلی زمین کا سورج

دیوبند: گذشتہ شب انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کے زیر اہتمام ملک کے نامور شاعر تاجدار تاج کی نئی تخلیق 'برفیلی زمین کا سورج' کی تقریب رونمائی قاسم پورہ روڈ واقع ہیرا گارڈن میں ممتاز شعرا ادبا اور علما کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ آل انڈیا ملی کونسل کے ضلع صدر ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی مہتمم جامعہ رحمت گھگرولی سہارنپور کی زیر صدارت منعقدہ پروقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ممتاز ادیب اور مشہور خطیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر استاذ دارالعلوم وقف دیوبند نے کہا کہ تاجدار تاج کا یہ مجموعہ کلام ان کی شاعری کا نہیں بلکہ اردو شاعری کا نمائندہ مجموعہ کلام ہے، ان کی فکری توانائیوں کا مظہر ہے اور زبان وبیان کا عظیم شاہکار ہے، انھوں نے مزید کہا کہ ہمارے عہد کی سچائیاں موجودہ انسانوں کی کہانیاں اور وقت کی ہزار داستانیں ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہیں، مولانا نے امید جتائی کہ تاجدار تاج کا پہلا شعری مجموعہ کلام 'زبر' دوسرا آوارہ پتھر کو جس طرح ادبی اور علمی وشعری حلقوں میں زبردست مقبولیت ملی ہے اسی طرح 'برفیلی زمین کا سورج' بھی اہل ذوق کو پسند آئے گا۔ اس موقعے پر صاحب اجرا مہمان خصوصی عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے کہا کہ ممتاز شاعر تاجدار تاج کی بلند اور فکر انگیز شاعری روشن فکر وخیال اور صداقت کا آئینہ دار ہے، جنھوں نے ذاتی خودغرضی اور مفاد پرستی سے اوپر اٹھ کر حقیقت اور سچائی سے کام لیا ہے جو ان کی تازہ تخلیق 'برفیلی زمین کا سورج' میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 15 مئی 2016

کچھ یادیں

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کلچرل ایجوکیشنل سینٹر کے زیر اہتمام معروف شاعر پروفیسر شہریار کی یاد میں جانی فاسٹر کے ذریعے جاری مجلّہ 'کچھ یادیں' کی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے معروف صحافی اور مسلم یونیورسٹی کے صلاح کار رابطہ عامہ ڈاکٹر راحت ابرار نے کہا کہ شہریار ایک اچھے شاعر کے ساتھ مشفق استاد بھی تھے اور شاعری کے میدان میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں اردو ادب کے سب سے بڑے اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے قبل پروگرام کے کنوینر جانی فاسٹر نے مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے شہریار سے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ شہریار نے شاعری کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ پروگرام کی صدارت کرتے

ہوئے اجمل خاں طبیہ کالج کے سبکدوش پروفیسر افضال احمد نے کہا کہ شہریار اردو دنیا کے عالمی شہرت یافتہ شاعر تھے اور انھوں نے عالمی سطح پر اپنی باوقار شناخت قائم کی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 مئی 2016

اور کچھ بچا بھی نہیں

نئی دهلی: نئی دہلی کے گاندھی شانتی پرتشٹھان میں ملک فیشن کلب اور جن ہنکار منچ کے زیر اہتمام ہندی زبان کا مشاعرہ منعقد ہوا اور شاعر ایس ایم خان کے شعری مجموعہ اور کچھ بچا بھی نہیں کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر منعقد مشاعرہ کی ابتدا شمع روشن کرکے معروف غزل گو پنکج جیسوانی، شاعر عادل رشید، نریش ملک، امیتابھ بچن کے ڈوپلی کیٹ اتیرودھ لال، روندر بھنڈاری، آئی ایس افسر منجیت سنگھ، اداکار رہ ترو پما اور جاٹ سینا کے صدر نوین چودھری نے کی۔ ہندی اور اردو زبان کے شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازہ جن میں ونیہ شکل ونمر، کلام بھارتی، رام کشور اپادھیائے، عادل رشید، سمودسنگھ چرورا، اوم پرکاش شکل، کشور سریواستو، لال بہاری لال، منوج کام دیو، پردیپ شرما، روی سروہا کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 23 مئی 2016

تم ہی کو ہم نے چاہا تھا تم ہی ملتے تو اچھا تھا

حیدرآباد: اردو مسکن خواجہ شوق ہال خلوت حیدرآباد میں شاعرہ نورالنساء نسرین کی کتاب 'تم ہی کو ہم نے چاہا تھا تم ہی ملتے تو اچھا تھا' پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر اردو اکادمی ریاست تلنگانہ نے رسم اجرا انجام دی۔ ادبی اجلاس کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ جامعہ عثمانیہ نے کی۔ پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے نسرین کی شاعری کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ نورالنساء نسرین کو غزل کی بدلتی قدروں کا ادراک ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/سکریٹری اردو اکادمی نے نورالنساء کی شاعری کو خوبصورت گلدستہ سے تعبیر کیا اور خواتین کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے مستقبل میں روشن امکانات کی طرف اشارہ کیا۔ صدر اجلاس پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے نورالنساء نسرین کے مجموعہ کلام کے منتخب اشعار پر تبصرہ کیا اور بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

روزنامہ'سیاسی تقدیر' دہلی، 19 مئی 2016

نکات عرفان

حیدرآباد: ادارہ اقلیم ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام شاعر، صحافی و قانون داں خواجہ مصطفیٰ علی صوفی کے شعری مجموعہ 'نکات عرفان' کی رسم اجرا تقریب زیر سرپرستی رحمٰن جامی منعقد ہوئی، ممتاز ماہر تعلیم ادیب و نقاد پروفیسر رحمت یوسف زئی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ وہ 'نکات عرفان' کے شاعر کو ایک عرصے سے جانتے ہیں جنھوں نے متصوفانہ نکات کو اشعار کے قالب میں ڈھالا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 مئی 2016

اُدھار کی زندگی

رامپور: انجمن ترقی اردو رامپور یونٹ کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب میں معروف افسانہ نگار خورشید جہاں کے افسانوی مجموعہ 'ادھار کی زندگی' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ ایسٹ ویسٹ پبلک اسکول میں منعقدہ ادبی تقریب میں ٹانڈہ سے تشریف لائے مہمان خصوصی سابق میونسپل چیئرمین محمود الظفر ایڈوکیٹ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کے گیت، غزلیں، مکالمہ اور افسانے اپنی شیرینی سے سارے عالم میں پیار اور محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو نے ہی دیا ہے جس کا نعم البدل آج تک نہیں مل پایا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر حسن احمد نظامی اور ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کہا کہ آج نوجوان نسل میں تعلیم کا شوق تو ہے لیکن اردو کو اہمیت نہیں دیتے جو فکرمندی کا موضوع ہے۔ تقریب کے کنوینر اور انجمن کے جنرل سکریٹری آل احمد سرور نے کہا کہ محترمہ خورشید جہاں کا 20 افسانوں پر مشتمل مجموعہ ادھار کی زندگی اپنی مثال آپ ہے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 مئی 2016

کامیابی کا راز

بلڈانہ: بروز اتوار 22 مئی 2016 کو شہر ناندورہ ضلع بلڈانہ میں ریاضی کے استاد جناب ایاز الدین اشہر صاحب

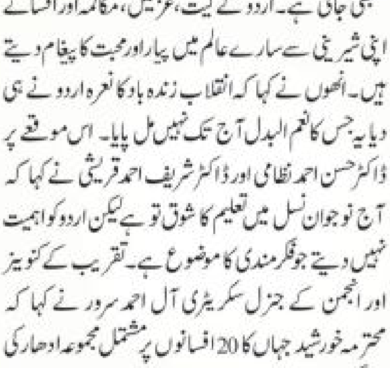

کے دولت کدے پر زیر اہتمام بزم تحریکِ شعر و ادب، ناندورہ، حمید ادیبی ناندوروی کی پانچویں تصنیف 'کامیابی کا راز' کی رسم اجرا شہر کے معزز ہستیوں کی موجودگی میں مشہور و معروف اور کہنہ مشق شاعر قدرت ناظم کے مبارک ہاتھوں تزک و احتشام سے عمل میں آئی۔ 'کامیابی کا راز' کے مصنف حمید ادیبی نادوری کے تعلق سے تاثرات کرنے والوں نے جن میں جناب ایاز الدین اشہر، جناب سید قمرالزماں، جناب محمد افتخار شامل تھے۔

اپنی تقاریر میں سب نے مصنف کی ادبی کوششوں کو سراہا۔ بعد میں مصنف حمید ادیبی ناندوری نے اپنی تخلیق 'کامیابی کا راز' کے تعلق سے کہا کہ انھوں نے پہلے ایک مضمون لکھا۔ پھر اسے طویل کیا مگر ان کے دل کی تشفی نہ ہوئی۔ پھر انھوں نے اسے طویل ترین کرکے 'کامیابی کا راز' کو مکمل کیا تب ان کے دل کو تسلی ہوئی۔ قدرت ناظم نے صدارتی تقریر کی۔ نظامت جناب یوسف علی ماسٹر صاحب نے کی۔

پریس ریلیز: اعجاز پروانہ، صدر بزم تحریک شعر و ادب ناندورہ، مہاراشٹر، 1 جون 2016

اوراق شناسی

دیوبند: الجامعۃ الانوریہ شاہ منزل محلّہ خانقاہ میں مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی 12 ویں کتاب 'اوراق شناسی' کی تقریب رونمائی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ممتاز ترین قلم کاروں میں ہیں۔ مولانا ندیم الواجدی مدیر ماہنامہ 'ترجمان دیوبند' نے کہا کہ بے پناہ مصروفیات کے باوجود مولانا کی تحریریں پڑھنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے اس لیے کہ زبان و بیان کا جو حسن ان کے یہاں ہے وہ موجودہ لکھنے والوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مئی 2016

عبدالصمد کے افسانے

نئی دهلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے چیئرپرسن روم اردو کے نوجوان اسکالر اور نقاد ڈاکٹر حیدر علی کی کتاب 'عبدالصمد کے افسانے' کی رسم رونمائی عمل میں آیا۔ اردو فکشن میں عبدالصمد کا نام بے حد نمایاں ہے۔ انھوں نے جہاں کئی معیاری ناول لکھے، وہیں عمدہ افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ناول اور افسانے ان کے گہرے شعور و ادراک کی غمازی کرتے ہیں۔ بالخصوص ان کے افسانے اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہیں کہ ان میں ان کے عہد کا پورا معاشرہ سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ اس مختصر مقالے میں عبدالصمد کے افسانوں کا ساجیاتی محاکمہ کرتے ہوئے ان کے افسانوں کے توسط سے موجودہ معاشرہ کی ایک واضح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر شمیری نے کہا عبدالصمد کے

نمائندہ افسانوں کا تجزیہ کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ یہ کتاب دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل تنقیدی نوعیت کی کتاب ہے۔ حیدر علی نے اپنی اس کتاب میں عبدالصمد کے معاصرین کے فن کو بھی موضوع بنایا ہے۔

'روزنامہ راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 مئی 2016

جہانِ آرزو

نئی دهلی: کچی عمر میں شاعری کا پختہ شعور سحر محمود میں ہے اور یہ بات غیر معمولی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ وہ خود ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں اور ادب کے پارکھ بھی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر فضل الرحمٰن سحر محمود کے مجموعہ کلام 'جہانِ آرزو' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ بزم شہباز نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقد تقریب رسم اجرا کی صدارت استاد شاعر ڈاکٹر تابش مہدی نے کی۔ اس موقعے پر فضل الرحمٰن سحر کے شعری مجموعے کی رسم اجرا بدست پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شہپر رسول، بزرگ استاد شاعر نسیم عباسی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر حسن رضا اور راشد حامدی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مئی 2011

عمر گذشتہ کی کتاب

مالیگاؤں کے بزرگ صحافی اور ہفت روزہ ماہنامہ 'بیباک' کے سابق ایڈیٹر ہارون بی اے کی خودنوشت 'عمر گزشتہ کی کتاب' کا اجرا مورخہ 29 مئی 2016 بروز اتوار کیفی اعظمی ہال (اسکس لائبریری ہال، مالیگاؤں) میں منعقد ایک عظیم الشان تقریب میں شہر کے نامور صنعت کار اور سماجی شخصیت الحاج محمد اسحاق سیٹھ زری والے کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت غلام احمد اعظم ٹرسٹ پونے کے چیئرمین منور پیر بھائی نے کی۔ کتاب کی رسم اجرا کے فوراً بعد بک کاؤنٹر کا افتتاح ڈاکٹر افتخار نے کیا۔ صدر تقریب منور پیر بھائی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہارون بی اے نے اپنی سوانح 'عمر گزشتہ کی کتاب' میں حقیقت بیانی کی ہے اور پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ اپنی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی بیان کیا ہے۔ عثمان غنی اسکس نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ کامریڈ اسرار اعظمی، مومن آصف، ایس اے واسع، سراج احمد دلار، مسعود رمضان پینٹر، آصف سبحانی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ رسم شکریہ آصف سبحانی نے انجام دی۔

ہارون بی اے کی خودنوشت 'عمر گذشتہ کی کتاب' کا اجرا

پریس ریلیز: عمران انصاری، مالیگاؤں، 4 جون 2016

دیوانِ سرور

علی گڑھ: بزمِ نویدِ سخن رجسٹرڈ علی گڑھ کے زیر اہتمام اور ابن سینا اکادمی کے اشتراک سے ابن سینا اکادمی ہال سول لائن علی گڑھ میں معروف شاعر ڈاکٹر سرور مارہروی کے شعری مجموعے 'دیوانِ سرور' کے رسم اجرا کی تقریب سید ظل الرحمٰن، ڈاکٹر الیاس نوید گنوری، انجینئر خالد فریدی اور استاد شاعر جمنا پرشاد راہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ نظامت کے فرائض بزم نویدِ سخن علی گڑھ کے جنرل سکریٹری سید بصیر الحسن وفا نقوی نے بہ حسن و خوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 4 جون 2016

بھٹکلیس ڈاٹ کام کا اردو آڈیو ایپ

بھٹکل: آج بعد نماز عصر شہر بھٹکل کے معزز علمائے کرام اور دانشوران قوم کے ہاتھوں، بھٹکلیس ڈاٹ کام www.bhatkallys.com کے موبائل فون اور ٹیبلیٹ پر استعمال کے لیے تکنیکی خوبیوں سے بھرپور نئے خوبصورت ایپ کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ تقریب بھٹکلیس ڈاٹ کام کے صدر دفتر میں منعقد ہوئی تھی۔ مینیجر بھٹکل آفس جیلانی شابندری نے معزز مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے تقریب کی غرض و غایت بیان کی، اس موقعے پر محمد محسن شابندری بانی و صدر بھٹکلیس ڈاٹ کام نے ویڈیو کانفرنس کے ذریعے ابوظبی سے ایپ کی خصوصیات کا تعارف کرایا جس کے بعد مولانا خواجہ معین الدین اکرمی مدنی قاضی مرکزی خلیفہ جماعت المسلمین بھٹکل، مولانا عبدالرب خطیبی ندوی نائب قاضی جماعت المسلمین بھٹکل، مولانا محمد الیاس ندوی بانی و جنرل سکریٹری مولانا سید ابوالحسن ندوی اسلامک اکادمی، عبدالرحیم جوکاکو صدر انجمن حامی مسلمین بھٹکل، قاسمی محمد انصار جنرل سکریٹری انجمن حامی مسلمین بھٹکل اور دیگر اعیان شہر کے ہاتھوں اس نئے ایپ کا اجرا عمل میں آیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 جون 2016

وفیات:

حکیم مرزا لطف اللہ بیگ

حیدر آباد: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے بانی رکن اور آل انڈیا یونانی طبی کانگریس تلنگانہ کے سرپرست مشہور و معروف حکیم مرزا لطف اللہ بیگ کا 2 جون 2016 چار بجے حیدرآباد میں تقریباً 90 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ نماز جنازہ جامع مسجد، چھتہ بازار، حیدرآباد میں ادا کی گئی۔ واضح ہو کہ موصوف ایک باعمل یونانی طبیب تھے۔ وہ ہر مہینے حیدرآباد کے اطراف میں واقع جنگلات میں یونانی میڈیکل کیمپ کا اہتمام کرتے تھے جس میں بڑے پیمانے پر اطبا یونانی شریک ہوتے تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 3 جون 2016

عبدالرحمٰن شوق مانوی

نئی دهلی: کہنہ مشق استاذ شاعر عبدالرحمٰن شوق مانوی کا طویل علالت کے بعد 13 مئی 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 87 سال کے تھے۔ بعد نماز عشا سہارنپور میں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ شوق مانوی معروف استاذ شاعر حضرت مانی جائسی کے لائق شاگردوں میں شامل تھے اور سہارنپور میں ان کا شمار اساتذہ کی فہرست میں ہوتا تھا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ موصوف انتہائی خوش مزاج، ملنسار، بااخلاق اور کم گو انسان تھے۔ شوق مانوی کے انتقال پر دہلی کے استاد شاعر اور ان کے استاد بھائی حضرت وقار مانوی نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے لیے ایک ذاتی صدمہ قرار دیا اور کہا کہ ان کے انتقال سے اردو کا ایک سچا خدمت گار اور سپاہی رخصت ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ شوق مانوی جیسے انسان آج کم ہی ہوتے ہیں جو دل میں سچے جذبات اور احساسات کے ساتھ رشتوں کی آبیاری کرتے

ہیں۔شوق مانوی کے انتقال پر عاطر سنبھلی، انقلاب سرسوی، سلیم صدیقی، شمس رمزی، ایس یوظفر، جاوید مشیری وغیرہ نے بھی اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو ادب کا ایک بڑا خسارہ قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2016

فاطمہ وصیہ جائسی

لکھنؤ: سابق گورنر سبط رضی کی ہمشیرہ اور مشہور شاعرہ فاطمہ وصیہ جائسی نے 9 جون 2016 کو آخری سانس لی۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کو سانس لینے میں تکلیف تھی جس کی وجہ سے ان کے گھر والے سول اسپتال لے گئے تھے۔ ان کے انتقال کی اطلاع ملتے ہی اودھ کے ادبی حلقے میں بے چینی بڑھ گئی۔ تدفین دیر رات میں امام باڑہ غفران مآب میں ہوئی۔ ضلع رائے بریلی کے جائس قصبے سے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والی فاطمہ وصیہ نقوی 1944 میں پیدا ہوئیں۔ والد سید وراثت حسین نقوی کے انتقال کے بعد وہ لکھنؤ آئیں اور یہاں چوک علاقے میں اشوک سنیما کے پاس واقع مکان میں رہنے لگیں۔ لکھنؤ کی تہذیب میں پرورش پائی۔ وصیہ نے بچپن میں مجلسوں میں نوحہ پڑھنا شروع کردیا تھا۔ ان کی شادی پی ڈبلو ڈی میں آرکیٹیک شفیق حسین رضوی سے ہوئی۔ پسماندگان میں شوہر اور پانچ بچے ہیں۔ اب تک ان کے تقریباً گیارہ شعری مجموعے شائع ہوئے، شاعری کے علاوہ نثر میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ ان کی زبان میں اودھ کی چاشنی ملتی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ ہم ایک نفیس شاعرہ سے محروم ہوگئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جون 2016

محمد اطہر

نئی دهلی: روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سینئر رپورٹر محمد اطہر کا دل کا دورہ پڑنے سے 12 جون 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 52 سال کے تھے اور کافی عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ ان کی نماز جنازہ صبح 10 بجے مسجد فتح پوری میں ادا کی گئی اور تدفین قبرستان باقی باللہ نبی کریم میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور اہلیہ شامل ہیں۔ محمد اطہر صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ راشٹریہ سہارا سے جڑنے سے قبل وہ طویل عرصے تک آل انڈیا ریڈیو کے مانیٹرنگ سیل سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ہائی اسکول فتح پوری سینئر سیکنڈری اسکول سے کیا تھا جبکہ گریجویشن ذاکر حسین دہلی کالج سے کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی سے ایم فل کیا۔ محمد اطہر کے انتقال پر دہلی کی اردو صحافت برادری نے سخت رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی اپیل کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جون 2016

ڈاکٹر مصطفی کریم

اردو کے ممتاز فکشن نگار ڈاکٹر مصطفی کریم کا 12 جون 2016 کو اسکاربرو (یوکے) میں انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے بیمار تھے۔ ان کا شمار اردو کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا ناول 'طوفان کی آہٹ' ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ مرشدآباد بنگال کے سراج الدولہ پر مبنی اس تاریخی ناول کو ناقدین نے بہت سراہا تھا۔ مصطفی کریم پیشے سے ڈاکٹر تھے مگر اردو زبان وادب سے ان کا بہت ہی مضبوط رشتہ تھا۔

بزم قلم، 13 جون 2016

ڈاکٹر اسلم فرخی

کراچی: معروف محقق اور ممتاز خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کا 15 جون 2016 کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ 1923 میں لکھنؤ میں ان کا جنم ہوا تھا مگر ان کا آبائی وطن فتح گڑھ ضلع فرخ آباد یوپی تھا۔ اسی نسبت سے وہ اسلم فرخی کہلاتے ہیں۔ حصول تعلیم کے بعد وہ درس وتدریس کے شعبے سے منسلک ہوگئے اور جامعہ کراچی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے ناظم شعبہ تصنیف وتالیف ومترجم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ریڈیو پاکستان سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے حوالے سے انھوں نے چھ کتابیں تحریر کی ہیں جن میں ان کا ادبی خاکہ 'نظام رنگ' بھی شامل ہے۔ خاکہ نگاری جیسی مشکل صنف کی ثروت میں انھوں نے گراں قدر اضافہ کیا۔

خراج عقیدت:

شمیم ہادی

امروهه: پاکستان میں شمیم ہادی کے انتقال پر امروہہ کی ادبی سماجی، ثقافتی تنظیموں کی جانب سے اظہار تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سلسلے میں شہر کے دارالعلوم اسلامیہ مدرسہ چلہ میں مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے مہتمم ادارہ حکیم شعیب اختر صدیقی قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ادارہ کے پرنسپل مولانا امین الدین نے

مرحوم کے لیے دعاء کرائی اور ایک تعزیتی قرارداد نواب انتقام علی خاں کو پیش کیا۔ دوسری جانب اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے شہر کے محلہ پیرزادہ میں ایک جلسہ تعزیت کا اہتمام زیرصدارت سلیم خاں ایڈوکیٹ کیا گیا۔ اس موقعے پر اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کے بانی صدر کوثر علی عباسی نے کہا کہ شمیم ہادی ایک امروہہ پرست انسان تھے۔ ان کے اندر وطن سے محبت کا ایک جذبہ تھا۔ جنرل سکریٹری اقبال احمد خاں نے کہا کہ شمیم ہادی کا ادب سے گہرا تعلق تھا۔ وہ نہ صرف ایک تہذیب یافتہ سماج کا حصہ تھے بلکہ نئی نسل ان کو دیکھ کر تہذیب حاصل کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر چندن نقوی، حاجی شبیہ احمد، ڈاکٹر شریف احمد وغیرہ نے خیالات کا اظہار کیا۔ اس دوران انجمن کے جملہ اراکین موجود تھے۔ شہر کے ہاشمی کالج میں سید شمیم ہادی کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام زیرصدارت ثانوی تعلیم بورڈ کے رکن ماسٹر اسلم عثمانی کی صدارت میں کیا گیا۔ جلسہ تعزیت میں ماسٹر اسلم عثمانی نے کہا کہ شمیم ہادی جیسی نامور شخصیت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے جو زبان وادب کے ساتھ ساتھ وطن سے بھی محبت رکھتی اور سماج میں اتحاد و یکجہتی کے عنوان سے نمایاں مقام حاصل کرتی ہو۔ ہاشمی ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے اپنے بیان میں کہا کہ شمیم ہادی رہتے پاکستان میں ضرور تھے لیکن ان کا دل صرف امروہہ کے لیے دھڑکتا اور تڑپتا تھا۔ وہ عاشق وطن کے ساتھ ساتھ قوم وملت وزبان و ادب کے حقیقی خدمت گار تھے۔ فخر امروہہ سید شمیم ہادی کے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے مرکز امام المدارس انٹر کالج میں بھی ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام ادارہ مذکورہ کے پرنسپل ڈاکٹر جمشید کمال امروہی کی صدارت میں ہوا۔ اس موقعے پر مقررین نے موصوف کی علمی ادبی سماجی ثقافتی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ پورے برصغیر میں شمیم ہادی کا نام نہایت ادب اور احترام کے ساتھ جانا جاتا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 1 جون 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

غلام رسول نازکی (مونوگراف)
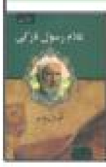
مصنف: قدوس جاوید
صفحات: 87
قیمت: -/65 روپے

رام لعل: حیات وفن (مونوگراف)
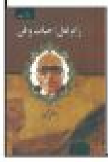
مصنف: مظہر محمود
صفحات: 201
قیمت: 105 روپے

شاد عارفی (مونوگراف)
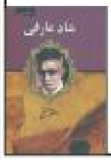
مصنف: مظفر حنفی
صفحات: 142
قیمت: 85 روپے

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)
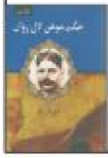
مصنف: صغیر افراہیم
صفحات: 146
قیمت: -/86 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)
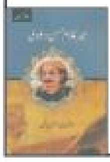
مصنف: قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128
قیمت: -/77 روپے

محمد حسین آزاد (مونوگراف)
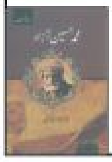
مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 152
قیمت: -/85 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد دوازدہم)
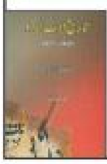
مصنف: محمد انصاراللہ
صفحات: 572
قیمت: -/243 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد سیزدہم)

انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 618
قیمت: -/259 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد چہاردہم)
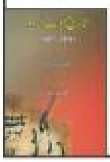
انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 505
قیمت: -/215 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)
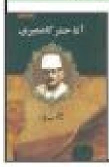
مصنف: یعقوب یاور
صفحات: 132
قیمت: -/81 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)
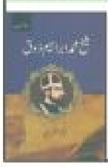
مصنف: کوثر مظہری
صفحات: 109
قیمت: -/72 روپے

ملا رموزی (مونوگراف)
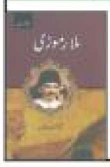
مصنف: محمد نعمان خاں
صفحات: 128
قیمت: -/80 روپے

تاریخ ادب اُردو (1858 تا 1911) (جلد پانزدہم)

انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 667
قیمت: -/277 روپے

پنجاب میں انقلابی وطن پرستی کی تحریک

مصنفہ: ڈاکٹر ملیش موہن
مترجم: ڈاکٹر ہمت سنگھ سنہا
صفحات: 472
قیمت: -/206 روپے

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)
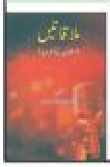
مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 578
قیمت: -/241 روپے

گیت گاتے رہو

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 65
قیمت: -/14 روپے

آؤ گیت گائیں

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 73
قیمت: -/17 روپے

بچوں کا باغ

مصنف: ظفر کمالی
صفحات: 64
قیمت: -/24 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

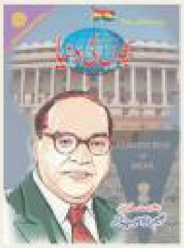

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

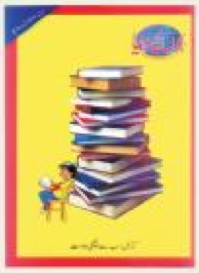

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040